غربت مٹے سے وطن
سارے جہاں میں اونچا ہو ہندوستاں کا نام
نہرو کا ہے پیام کام سے نہ ہو
اے قوم! زیست کے لئے آرام ہے حرام

Silver
Jubilee
Souvenir

Silver
Jubilee
Souvenir

افغان سنو
مشرقی دنیا کی بہترین کریم

Patanwala

PERFUMES

سب سے پہلے تصحیح فرما لیں

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۴	۱	۱۳	جذبات	خدمات
۴	۲	۷	استقلال کی	استقلال کو
۴	۰	۱۴	اور اور	اور
۵	۱	۱۲	مسئلہ پر	مسلک پر
۶	۱	۹	"شاعرانہ"	"شاعرانہ"
۶	۲	۳	"خط کی امید"	خط کی رسید
۶	۲	۶	حسن لحن	حسنِ ظن
۶	۲	۶	گگرہ بندی	گگرہ بندی
۶	۲	۷	"ادبی سوئے ظن"	"ادبی سوئے ظن"
۶	۲	۱۰	تدوین نہیں	تدوین ہیں
۱۱	۰	۸	اس سرکار کو چاہیے کہ "روزانہ ہند"	روزانہ ہند ایسے اخبار کے ارباب اختیار کو چاہیے کہ
			ایسے اخبار کا خاص طور پر خیال رکھے	اب بھی ہوشیار رہیں
۱۲	۰	۳	سلور جوبلی کی تقریب کے موقع پر	سلور جوبلی کی تقریب پر
۱۳	۰	۶	″	″
۲۷	۰	۳	اپنی زندگی گذشتہ	اپنی زندگی کے گزشتہ
۲۸	۰	۱۱	بہترین خوشنودی	بہترین خوشنودی کا پیغام
۳۱	۰	۴	قارئین کو صرف معززین	قارئین کو صرف افراد
۴۱	۰	۶	کبھی راہِ راست سے روگردانی نہ کی	خدا کے فضل و کرم سے کبھی راہ راست سے روگردانی نہ کی
۴۱	۰	۱۱	اصولوں کو ہاتھ سے نہ دیا	اصولوں پر سختی سے قائم رہا

نمبر صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۴۲	۰	۶	کے	رکھ
۴۵	۱	۱	"روزانہ ہند" پچیس سالہ	"روزانہ ہند" کی پچیس سالہ
"	۱	۶	کیونکہ	چونکہ
"	۱	۱۵	صاحب	صاحبان
۵۳	۲	۲۰	تقسیم بنگالہ تصفیہ	تقسیم بنگال کا تصفیہ
"	"	۲۲	بمقام ۔	بمقام ڈھاکہ
۵۵	۱	۲۵	بہت زمانہ سے زمانہ شناس	بہت زمانہ شناس
۶۱	۱	۱۸	سیاسی بے دردی	سیاسی بیداری
۶۲	۱	۷	چاول تار و پود	چاول کا تار و پود
"	"	۱۱	مغائر ت	مغائرت
۶۳	۱	۱۵	غرضیکہ	غرضکہ
۶۵	۱	۳	۳۳ء کی اداریہ میں	۳۳ء کے اداریہ میں
"	"	۲۷	تعریف میں لکھا تھا	یہ تعریف کی تھی
۶۶	"	۲۲	ہم سہتے ہیں	ہم سمجھتے ہیں
۷۸	—	—	—	غیر مطبوعہ غزل
"	پہلا شعر	۰	کنارہ	کنارا
"	دوسرا "		تارہ	تارا
۷۹	مقطع		حیواں	حیوان
۸۸	۰	۰	نشاط الابیان	نشاط الایمان
۱۰۱	شعر ۲		بہار	بہار
۱۰۶	آخری شعر		جاکو جاگو	جاگو جاگو
۱۴۸	۰	۰	اثر	اثر لکھنوی
۲۲۸	۰	۰	باقی صفحہ ۷۹ کا	باقی صفحہ ۷۷ کا
۲۳۳	۱	۲۴	تو نہ آئے	تو نہ آئی

سلور جوبلی نمبر سنہ ۱۹۵۴ء

روزانہ ہند کلکتہ

قائم شدہ سنہ ۱۹۲۹ء	ایڈیٹر:- غلام سرور فگار	قیمت:- دو روپیہ

فہرست مضامین

اسمائے گرامی پیغام دہندگان

(۱) شری رادھا کرشنن، نائب صدر جمہوریہ ہند (۲) شریمتی مسز وجے لکشمی پنڈت، صدر اقوام متحدہ (۳) ڈاکٹر ایچ، سی، مکھرجی گورنر مغربی بنگال۔ (۴) ڈاکٹر بی، سی، رائے، وزیر اعلیٰ مغربی بنگال (۵) شری گرجا شنکر باجپائی، گورنر بمبئی۔ (۶) مہاراجہ پٹیالہ (۷) شری آر، آر، دیواکر، گورنر بہار۔ (۸) جناب بخشی غلام محمد، وزیر اعظم کشمیر۔ (۹) شری جے رام داس دولت رام، گورنر آسام (۱۰) شری مرارجی ڈیسائی، وزیر اعلیٰ بمبئی۔ (۱۱) شری بھیم سین سچر، وزیر اعلیٰ پنجاب (۱۲) راج کماری امرت کور، وزیر صحت حکومت ہند (۱۳) شری لال بہادر شاستری، وزیر ریلوے و مواصلات۔ (۱۴) شری بلونت رائے مہتہ جنرل سکرٹری اے، آئی، سی، سی (۱۵) شری اتولیہ گھوش، صدر مغربی بنگال پردیش کانگریس (۱۶) شری گوبند ولبھ پنتھ، وزیر اعلیٰ اتر پردیش (۱۷) شری سیلا کمار مکھرجی (۱۸) مسٹر فضل علی (۱۹) مرزا سر محمد اسماعیل (۲۰) سردار سورن سنگھ، وزیر تعمیرات و سپلائی (۲۱) ڈاکٹر آر۔ احمد، وزیر زراعت، حکومت مغربی بنگال (۲۲) شری پرفلا چندر سین (۲۳) سر دھیرن مترا (۲۴) شری سرجیت سنگھ مجیٹھیہ (۲۵) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲۶) شری راما سوامی مدالیار (۲۷) میجر جنرل مہندر سنگھ چوپڑہ (۲۸) ڈاکٹر سید محمود (۲۹) ڈاکٹر کالیداس ناگ (۳۰) شری سجے پرکاش نرائن۔ (۳۱) مسٹر محمد عبد الغفار (۳۲) خواجہ غلام السیدین (۳۳) مسٹر ہمایوں کبیر (۳۴) شری کیشب چندر سین گپتا۔

ایڈیٹر

پیش لفظ

روزانہ ہند کا یہ سلور جوبلی نمبر پیش کرتے ہوئے ہمیں اس کا فخر ہے کہ گذشتہ ۲۵ سال کے اندر اس نے ملک اور قوم کی خاطر جتنی بھی قربانیاں دی تھیں، وہ رائگاں نہیں گئیں اور اس کا ثمر اسے مل گیا۔ یعنی مادرِ ہند جو دو سو سال سے بدیسی غلامی کی زنجیروں میں اسیر تھی آخر کار وہ آزاد ہو گئی۔ اور اب ہندستان کا شمار بھی دنیا کے آزاد ممالک میں ہونے لگا کوئی فرد ہو یا اخبار وہ بہت خوش قسمت ہے، جسے اپنی زندگی ہی میں محنتوں اور مشقتوں کا ثمر مل جائے۔ آج روزانہ ہند کا شمار بھی انہی چند ایک خوش قسمت اُردو اخباروں میں ہوتا ہے، جنھیں کامیاب سلور جوبلی منانے کا یہ قابلِ رشک موقعہ میسّر آیا ہو۔

روزانہ ہند کی سلور جوبلی کا خیر مقدم، اس کی قومی و ملکی خدمات کا اعتراف اور اس کے مستقبل کے بارے میں نیک خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار ان پیغامات سے ہوتا ہے، جو زعمائے ہند نے بکمال خلوص و ہمدردی بھیجے ہیں، اور جنھیں اسی اشاعت خاص میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ زعمائے ہند ہیں جن کی اپنی زندگیاں ملک اور قوم کو آزاد کرانے کی جد وجہد میں گذری ہیں اور روزانہ ہند کے گذشتہ ہنگامہ خیز دور میں انھوں نے بھی جانی اور مالی قربانیوں کا ایک عدیم المثال ریکارڈ قایم کیا ہے۔ اس لئے روزانہ ہند کے اہم کردار کا قدر داں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور انہی کو یہ زیب دیتا ہے کہ اس کے روشن مستقبل کے خواہشمند اور متمنی ہوں۔

ایزد متعال کا شکر یہ کس زبان سے ادا کیا جائے، جس نے روزانہ ہند کو یہ توفیق ارزانی کی۔ اور یہ جرأت و ہمت بخشی کہ گذشتہ ۲۵ سال کے دوران میں یہ مسلسل مگر بڑی سختی سے ایک ہی مسلک پر قائم رہا۔ اور اس کے پائے ثبات و استقلال کی دنیا کی کوئی طاقت بھی متزلزل نہ کر سکی۔ اس پر مقدمات چلائے گئے، ضمانتیں طلب کی گئیں، قتل کرنے اور لوٹنے کی غرض سے اس کے خلاف نہ صرف منصوبے بنائے گئے، بلکہ اس پر حملے بھی کئے گئے، غرض ظلم و تشدد کا کوئی حربہ ایسا نہیں تھا، جو استعمال میں نہیں لایا گیا، اور اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ روزانہ ہند کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کیا جائے، اور حق و صداقت کی اس آواز کو ہمیشہ کے لئے دبا دیا جائے، مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور اور اسے اس سے ہندستان کو آزاد کرانے کا ایک عظیم الشان کام لینا تھا۔ اس لئے یہ زندہ اور باقی رہا، اور آئندہ کے لئے بھی چونکہ ملک اور قوم کے سچے بہی خواہ اور آزاد ہندستان کے معمار اس کی درازئ عمر کے متمنی اور اس سے نیک توقعات رکھتے ہیں اس لئے یہ زندہ اور باقی رہے گا، اور ملک اور قوم کی خدمت اسی جوش اور سرگرمی سے کرتا رہے گا۔

روزانہ ہند کے اجراء کے تین مقاصد تھے، ایک ملک کو بدیسی غلامی سے آزاد کرانا، دوسرے فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرنا اور تیسرے مسلمانانِ ہند کو ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔ پہلے مقصد میں اسے پوری کامیابی ہوئی، اور دوسرے دو مقاصد میں جزوی۔ گزشتہ ۲۵ سال تک یہ فرقہ پرستی کے خلاف مسلسل برسرِ پیکار رہا۔ اور اس کا قلم اس کے ساتھ کبھی بھی آمادۂ مصالحت نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہندستان دو قومی نظریہ کی بنا پر تقسیم ہوگیا۔ مگر اس کے باوجود یہ نعرۂ اتحاد لگاتا رہا اور ملک کو ایک ہونے کا پیغام پہونچاتا رہا مسلمانوں کو ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی جو سر توڑ کوشش روزانہ ہند نے کی پاکستان بننے کے بعد آج ان مسلمانوں کو اس کا احساس ہو رہا ہے جو ہندستان میں رہ گئے ہیں، اور اس کی تحریر کے زیادہ قائل نظر آتے ہیں، روزانہ ہند آج بھی اسی مسئلہ پر گامزن ہے۔ اور سلور جوبلی کا یہ مجموعہ جو ناظرین کرام کے ہاتھوں میں ہے، اس سے بھی ان کو اندازہ ہوجائے گا۔

ہندستان میں اردو اخبار نویسی کی عمر کوئی سوا سو سال کے قریب ہے، اور اس کی ابتدا کا شرف کلکتہ ہی کو حاصل ہوا۔ کیونکہ سب سے پہلے اخبار "جام جہان نما" نے اسی سرزمین پر ۱۸۲۲ء میں جنم لیا تھا، اور اس کے دو سال بعد ایک دوسرا اخبار "شمس الاخبار" بھی ۱۸۲۴ء میں یہیں سے جاری ہوا تھا۔ اس وقت سے لیکر اب تک اس "اخبار خیز" سر زمین سے ایک سو کے قریب ماہوار، ہفتہ وار اور روزانہ اخبار کتم عدم سے پردۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکے ہیں۔ یقیناً ہندستان کی تاریخ اخبار نویسی میں بنگال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور جب کوئی مورخ اس موضوع پر قلم اٹھائے گا، تو سب سے پہلے اسے بنگال کو اس کے لئے خراج تحسین ادا کرنا ہوگا۔ روزانہ ہند اسی سلسلہ کی ایک زبردست کڑی ہے جس کے متعلق حضرت وفا راشدی نے اپنی تازہ ترین تصنیف "بنگال میں اردو" میں یوں لکھا ہے:۔

"خلافت اور کانگریس کی تحریکات کے زمانہ میں اس اخبار نے جو کام کیا وہ ناقابل فراموش ہے آج بھی قومی تحریکوں کی حمایت اس کی پالیسی کا امتیازی نشان ہے روزانہ اشاعت کے علاوہ اس کا سنڈے ایڈیشن بھی نکلتا ہے، اس کے علاوہ سال میں دو تین خاص نمبر بھی شائع ہوتے ہیں، جو سیاسیات حاضرہ پر ٹھوس بحث کے علاوہ بلند پایہ مقالوں، نظموں اور افسانوں کے باعث شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روزانہ ہند آج بھی کلکتہ کا کثیر الاشاعت اخبار ہے۔"

جس طرح انسان کا ذہن اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح اخبار بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ذہن اور اخبار دونوں اس تاثر کی اندھادھند تقلید کریں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو کھو بیٹھیں اور دنیا کی تسخیر اور قیادت کا مقصد ان کے ہاتھ سے جاتا رہے روزانہ ہند نے ہمیشہ اس مقصد کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اور بجائے اس مقولہ پر "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" عمل کرنے کے اس پر عمل کیا۔ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی کے گذشتہ ۲۵ سال ہنگامہ خیز رہے اور اسے متعدد مخالف طاقتوں سے اکثر برسر جنگ رہنا پڑا۔

"دریا بہ حباب اندر" کے عنوان سے روزانہ ہند کی ۲۵ سالہ زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، چونکہ روزانہ ہند کی تاریخ ہندستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ ہے اسلئے یہ کوشش بھی کیگئی ہے کہ اس عرصہ کے سیاسی پس منظر کا نقشہ بھی پیش کردیا جائے تاکہ اسکی روشنی میں ناظرین کرام کو روزانہ ہند کے صحیح مقام کا اندازہ ہوسکے۔ اس میں ایک اور ذیلی عنوان "اور اس دور میں مسلمان" قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ روزانہ ہند کے اجراء کا یہ اولین مقصد تھا۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس دور کے مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی اجمالی طور پر ذکر کردیا جائے، تاکہ روزانہ ہند کے کردار کا یہ اہم پہلو بھی اجاگر ہوجائے۔

یہ سلور جوبلی نمبر جسے بڑی محنتوں اور کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اس کی بعض کوتاہیوں کا ہمیں خود بھی احساس ہے، اور ان کے اظہار میں ہمیں کوئی امر مانع نہیں۔ ایک تو جن زعمائے ہند نے اپنے

پیغامات بھیجے ہیں، ان میں سے اکثروں کے فوٹو باوجود کوشش بسیار ہمیں دستیاب نہ ہو سکے۔ اور یہی حال مضمون نگار حضرات کا بھی رہا فوٹو کے لئے بارہا خطوط ان کو لکھے گئے، مگر ہمیں انتظار شدید رہا اور فوٹو موصول نہ ہوئے۔ بعضوں کے خطوط آئے، مگر شانِ بے نیازی کے حامل اور وہ یہ کہ انہیں فوٹو شائع کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں خان بہادر رضا علی وحشت جو ڈھاکہ میں مقیم ہیں، انہوں نے ازراہِ کرم گستری اپنے اشعار تو روانہ کر دیئے، مگر فوٹو سے اظہارِ معذوری کیا، کلکتہ میں محبی سید محمود مطرزی سے رجوع کیا گیا اس امید پر کہ شاید ان سے فوٹو مل جائے۔ انہوں نے "شاعرانہ" وعدہ کیا جو آج تک وفا نہ ہوا۔ نہ فوٹو ملا نہ "ذرا پاکستان تک"۔ یہ اس دلچسپ مضمون کا موضوع ہے، جس پر سید صاحب موصوف طبع آزمائی کرنے والے تھے۔ بعد میں ایک دو بار یہ معلوم ہوا تھا کہ نصف کے قریب مضمون لکھا بھی جا چکا ہے، مگر شاید شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا جس کی وجہ سے یہ سلور جوبلی نمبر اس سے محروم رہا۔ ممکن ہے انہوں نے اس لئے نصف نامکمل رہنے دیا ہو کہ روزانہ ہند کی گولڈن جوبلی پر اسکی تکمیل کی جائے گی۔ خدا انہیں اس ارادہ پر ثابت قدم رکھے اور روزانہ ہند کو اپنی گولڈن جوبلی کا موقعہ عطا کرے

اور اسی طرح ہمیں ڈاکٹر کالیداس ناگ کا فوٹو بھی وقت پر نہ مل سکا۔ ان مضمون نگاروں سے ہم معذرت خواہ ہیں جن کے مضامین بعد از وقت موصول ہوئے اور انہیں درج اشاعت نہ کیا جا سکا۔ بشرطِ اجازت روزانہ ہند کے سنڈے ایڈیشن میں انہیں شائع کیا جائے گا۔ جن مضمون نگار اصحاب نے ہماری گذارشات کو شرفِ قبول بخشا، اور اولین فرصت میں مضامین بھیجے ان کے ہم بیحد شکرگذار ہیں اور ان کے حق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

یہ بات ہمارے لئے موجبِ حیرت ہے کہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں نے روزانہ ہند کے سلور جوبلی نمبر کی قلمی اعانت سے گریز کیا، اسکی وجہ نامعلوم۔ باوجودیکہ وہاں کے مشاہیر اہلِ قلم کی خدمت میں خطوط بھیجے گئے اور اس کے بعد متعدد بار یاددہانی بھی کی گئی۔ مگر سوائے محترمہ ہاجرہ مسرور کے اور ان کا معذرتی خط بھی حال ہی میں موصول ہوا ہے کسی نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی جہاں تک خطوط اور یاددہانیوں کا تعلق ہے ایک نہیں بلکہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا گیا جس سے ان تک اپنی عرضداشت پہونچائی جا سکے مگر خط کی امید تک نہ اور ہمارا تو یہ خیال تھا۔ کہ شاعر اور ادیب مکان و زمان کی حدود اور قیود سے بالاتر ہوتے ہیں، مگر پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی روش نے اسے متزلزل کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ محض حسنِ ظن نکلے اور اس گلہ بندی کو شکایت بے جا ثابت کریں، تاکہ ہمارا دامن اس "ادبی سوئے ظن" کے ارتکاب سے پاک رہے۔

جسطرح کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تھی سلور جوبلی نمبر کی ترتیب و تدوین نہیں، منجملہ دیگر تجربات کے جو بڑی کد و کاوش سے ہمیں حاصل ہوئے اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ ایک نئی چیز خود بخود "دریافت" ہو گئی اس سے ہماری مراد ہندوستان کے کہنہ مشق اور صحیح ادبی ذوق رکھنے والے ادیب آں۔ احمد اکبرآبادی ہیں، جن کی ایک کتاب "لالۂ رخ"، ہم نے آج سے بیس پچیس سال قبل پڑھی تھی جو سر طامس مور کی انگریزی تصنیف کا ایک کامیاب ترجمہ ہے باوجودیکہ وہ بھی گذشتہ چار پانچ سال سے کلکتہ میں اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور ہمارے دفتر کے قریب ہی مقیم ہیں مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ ان کا دلچسپ اور پُرمغز "روسی افسانہ" سلور جوبلی نمبر میں تشکر یہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس کا افسوس ہے کہ افغانستان، پاکستان، ایران، عراق، ترکی، شام وغیر ممالک سے صحافتی، ثقافتی، معاشرتی اور پارلیمانی ڈیلیگیشن آتے رہے، اور روزانہ ہند ان کا خیر مقدم بھی کرتا رہا مگر سوائے افغانی ڈیلیگیشن کے فوٹو کے اور کوئی دستیاب نہ ہو سکا اس لئے شائع اشاعت نہیں کر سکے، ہم اس سلور جوبلی نمبر کی ترتیب، پروف ریڈنگ اور فراہمی مضامین اور طباعت کے سلسلہ میں مسٹر محمد علی شہاب ایم، اے اور مسٹر فاتح فرخ اور سید محمد ظہور حسنین کے بیحد تعاون کے ممنون ہیں۔ ناظرین کرام سے یہ استدعا ہے کہ اگر اس میں کوئی فروگذاشت نظر آئے تو نظرانداز فرمائیں، اور اگر کوئی خوبی دکھائی دے تو اسکی تعریف کریں کیونکہ اہلِ کرم کا یہی شیوہ ہے۔

نواب دہلوی

قطعہ تاریخ اجرا "روزانہ ہند"

انگریز حکومت کی نظر میں — تھا "ہند" کھٹکتا ہوا کانٹا
بے باک بہت کہنے میں حق بات — سچائی کا بہتا ہوا دھارا
باطل کے لیے تیغ دستاں سے — ہر لفظ سوا جس کے سخن کا
تاریک سیاست کے فلک پر — بے مثل چمکتا ہوا تارا
کلکتے کی سنگلاخ زمیں کو — گلزار صحافت کا بنایا
صد برق پئے فرقہ پرستی — اک سچا بہی خواہ وطن کا
جو کل تھا وہی آج ہے مسلک — رشتہ کبھی باطل سے نہ جوڑا

نواب مجھے یاد ہے اب تک
کس شان سے آغاز ہوا تھا

سنہ ۱۹۲۹ عیسوی

تاریخ سال جوبلی "روزانہ ہند"

پروفیسر ہیرا لال چوپڑا

شکر للہ — شکر للہ فرض اولیٰ ہے
شکر نعمت — شکر ان کا ہیئو لئے ہے
شکر لازم — شاخ سیمیں پہ برگ و بار آئے
شکر پھولا — باغ "روزانہ ہند" پھولا ہے

سنہ ۱۹۵۴ عیسوی

نائب صدر جمہوریہ ہند
نئی دہلی

"مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ "روزنامہ ہند" کا سلور جوبلی نمبر شائع کر رہے ہیں، اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کر لئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسی طرح ملک کی خدمت کرتے رہیں گے۔"

دستخط
ایس۔ رادھاکرشن

مسز وجے لکشمی پنڈت

صدر، ادارہ اقوام متحدہ

"میں "روزانہ ہند" کو اس کی ۲۵ ویں سالگرہ پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اب اس کو جو مہم درپیش ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے، اور ثبات و استقلال چاہتی ہے، اور وہ لوگ جو اس اخبار کی گذشتہ تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ اخبار اپنی اس ذمہ داری کو بھی بڑی کامیابی سے سنبھال لے گا۔"

دستخط
وجے لکشمی پنڈت

شری ہیرن مکھرجی
گورنر حکومت مغربی بنگال

"روزانہ ہند جو ۱۹۲۶ء میں جاری کیا گیا تھا۔ امسال اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے، اور اس کے سارے مخلص اور ان گنت بہی خواہ اس موقعہ پر ملک اور قوم کی مسلسل خدمات پر اسے دل سے مبارکباد اور اپنی نیک خواہشات پیش کریں گے۔ یہ پچیس سال نہ صرف ہندستان کی تاریخ میں اہم ترین تھے، بلکہ جریدہ مذکور کی زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

ملک کی تحریک آزادی کی حمایت کرنے میں روزانہ ہند کو جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا عوام ان سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود باری تعالیٰ کی مہربانیوں سے یہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے بھی بچ نکلا۔ مجھے امید ہے کہ ملک کی خدمت جو اس کا لائحہ عمل ہے، اس کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اخبار مذکور رائے عامہ کو صحیح راہوں پر لے جائے گا۔

دستخط
ہیرن مکھرجی

وزیر اعلیٰ مغربی بنگال
کلکتہ

" میں " روزانہ ہند کو اس کی سلور جوبلی کے موقعہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ، گذشتہ ۲۵ سال بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ اس دوران میں دنیا کے عوام کے اندر کشمکش اور غلط فہمیوں کی بہتات رہی ۔ ایک مسلمانوں کے ترجمان قوم پرور جریدے کی ذمہ داریاں اس زمانے میں بڑی نازک اور دشوار تھیں ۔ یہ امر قابل فخر ہے ۔ کہ " روزانہ ہند " ان سارے امتحانات میں پورا اترا ، اور ہندستان کی دو عظیم جماعتوں میں تعلقات خوشگوار بنانے کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دیتا رہا ۔ فرقہ پرستی کی لعنت دبائی تو جا سکتی ہے ، لیکن اس کو نیست و نابود نہیں کیا جا سکا ۔ اس سرکار کو چاہئے کہ " روزانہ ہند " ایسے اخبار کا خاص طور پر خیال رکھے ۔ میں " روزانہ ہند " کے لئے ایک روشن اور کارآمد مستقبل کا خواہاں ہوں ۔

دستخط
بی ۔ سی ۔ رائے

گورنر بمبئی

راج بھون - مالابارہل بمبئی

"سلور جوبلی کی تقریب کے موقعہ پر میں "روزانہ ہند" کو اپنی بہترین خواہشیں بھیجتا ہوں - اخبار مذکور نے بڑی ثابت قدمی، اور ہمت کے ساتھ تحریکِ آزادی کے زمانہ میں ہندستان کی آزادی کی خدمت سر انجام دی ہے - اس کے تمام بہی خواہوں کو اس بات کی امید ہے، کہ نئے ہندستان کے سامنے جو بے شمار مسائل موجود ہیں انہیں سلجھانے کے لئے اخبار مذکور اسی ہمت اور جرأت کے ساتھ ہندستانی عوام کے مختلف طبقوں میں اتحاد و اتفاق کی کوشش کرتا رہے گا۔"

دستخط
جی، ایس، باجپائی

ہز ہائینس مہاراجہ یدوندر سنگھ بہادر
راج پرمکھ پیپسو ۔ پٹیالہ

" ایک حقیقی معنوں میں اچھا اخبار رائے عامہ کی تربیت میں بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے ، قومی اور بین اقوامی ہم آہنگی پیدا کرنے ، ملک کے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے اور ان کے خیالات کو صحیح راستے پر لگانے میں ایسا اخبار بڑی مدد کر سکتا ہے ، ایک اخبار جو اس اصول پر چلے گا ۔ اسے کبھی اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے گا ۔" روزنامہ ہند" کی سلور جوبلی کی تقریب کے موقعہ پر میری نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہیں ۔"

دستخط
یدوندر سنگھ

گورنر بہار
پٹنہ

"جس اخبار نے اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کر لئے ہوں، وہ اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوگا اور روزانہ ہند اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہوگا۔ اس لئے کہ اپنے قومی نظریہ کے باعث اس نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ میں اس یادگار موقعہ پر " روزانہ ہند " کو تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس کا متمنی ہوں کہ وہ ملک کی خدمت کے لئے سالہا سال زندہ و سلامت رہے۔

دستخط
آر۔ آر۔ دیواکر

بخشی غلام محمد
وزیر اعظم کشمیر، سری نگر

"یہ سُن کر مجھے مسرت ہوئی کہ روزانہ ہند اپنی سلور جوبلی منانے والا ہے۔ اس اخبار کا جنم ایک طوفانی وقت میں ہُوا تھا، اور اسے کے باوجود کہ ملک کو ہنگامہ خیز دَور سے گذرنا پڑا تھا۔ یہ اخبار مسلسل قومی اور جمہوری اصُولوں کا داعی رہا۔ اور وہ اصول جن کے لئے یہ گذشتہ سالوں میں برسرِ پیکار رہا۔ اب ہر ہندستانی کا جزوِ عقیدہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آیا۔ مگر ہمارا ملک انہی اصولوں پر قائم رہ کر اپنے عقیدہ کا عملی ثبوت بہم پہونچاتا رہا۔

قبل اس کے کہ ہم ان تعصبات پر قابو پا سکیں جو ہندستان کی سیاسی زندگی کے تیرہ و تاریک ایّام کا نتیجہ ہیں اور ہندستانی یقین کے ساتھ خوشحالی اور مساوات کے دَور کی توقع رکھیں، ہمیں ایک مدت درکار ہوگی، اور یہاں کے کروڑوں باشندوں کو غربت اور افلاس سے اُٹھا کر تہذیب و نفاست کے معیار تک پہونچانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے اس میں کچھ شک نہیں، روزانہ ہند جیسے کار آزمودہ محب وطن اخبار اس مقصد کی خاطر اپنے آپ کو بالکل وقف کر دیں گے، اور اس پر انہیں فخر ہوگا۔

میں اس جریدے کو اس کی مسلسل خدمتِ قوم اور حُبِّ وطن پروری مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

دستخط
جی۔ ایم۔ بخشی

گورنر آسام
شیلانگ

"میں "روزانہ ہند" کو اس کی آئندہ سلور جوبلی کے موقعہ پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ۲۵ سال تک قومی خدمات کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جس پر "روزانہ ہند" بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ میں اس کا متمنی ہوں یہ اخبار اپنی "گولڈن جوبلی" کی طرف گامزن رہتے ہوئے اسی طرح ملک کی خدمت کرتا رہے۔ ہمیں چاہیئے کہ جس طرح بھی ہو ہندستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہیں، اور ہر اس فعل سے احتراز کریں جس سے اس اتحاد میں کمزوری آنے کا احتمال ہو۔"

دستخط
جے رام داس دولت رام

شری مرارجی ڈیسائی
وزیر اعلیٰ حکومت بمبئی

"یہ کچھ کم اطمینان بخش نہیں کہ باوجود مشکلات اور مصائب کے "روزنامہ ہند" اپنے اس عقیدہ کی خاطر انتہائی پامردی سے مقابلہ کرتا رہا کہ سیاسی اور معاشرتی ـــــ معاشی مسائل میں ہندستان کے عوام کی راہ میں مذہب کو دخل نہیں ہونا چاہیئے، اور اس کا خاطر خواہ صلہ بھی مل گیا۔ وہ عقیدہ اب ہمارے دستور کی مقدس یادگار ہو گیا ہے، جو اور اصولوں کے علاوہ سیکولرازم پر مبنی ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ "روزنامہ ہند" اس سال اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ فرقہ واریت کا مقابلہ کرتا رہے گا۔ اس تقریب سعید میں اس کے قارئین کو اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔"

دستخط
مرارجی ڈیسائی

شری بھیم سین سچر
وزیر اعلیٰ پنجاب

" روزانہ ہند کے منتظمین اور ناشرین کو میں اس کی ۲۵ سالہ کارآمد زندگی کی تکمیل پر دل وجان سے مبارکباد دیتا ہوں، یہ یقیناً خوش قسمتی کی دلیل ہے، کہ غیر ملکی عہد حکومت کی صبر آزما سختیوں اور دشواریوں کے باوجود جو ہندستان کے لسانی اخبارات کو برداشت کرنا پڑیں، یہ اخبار زندہ رہا۔ پریس کے سخت گیر قوانین کی شمشیر برہنہ ان اخبارات کے سروں پر لٹکتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے سینکڑوں اخبارات کے پریس ضبط ہوئے، اور ان کے ناشروں اور ایڈیٹروں کو صرف اس جرم پر جیل خانوں میں بھیج دیا گیا کہ وہ ملک کی تحریک آزادی کے حامی تھے، اور مظلوم و مجبور انسانیت کے احساسات کے ترجمان تھے

موجودہ نظام حکومت یعنی آزاد ہندستان میں لسانی اخبارات کو بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے، انہیں ایسی نئی امیدوں اور نئی امنگوں کا پیغامبر بننا ہے۔ جو ایک آزاد ملک کے شایان شان ہوں "

دستخط
بھیم سین سچر

راجکماری امرت کور
وزیر صحت حکومت ہند، نئی دہلی

"روزانہ ہند کی پچیسویں سالگرہ کے نیک موقعہ پر میں انتہائی خوش ہوں۔ واقعی یہ خوشی کا مقام ہے کہ "روزانہ ہند" اپنی زندگی میں قومی خدمات اور آزادی کی لڑائی میں وہ تمام خدمات سرانجام دیتا رہا ہے، جو کہ وہ دے سکتا تھا۔ خاص کر تقسیم ہند سے پہلے کی وہ خدمات جو کہ اس نے فرقہ وارانہ لعنت کو دور کرنے کے لئے کیں، ناقابل فراموش و قابل داد ہیں

میں باامید ہوں، کہ روزانہ ہند پہلے کی طرح اب بھی ملک و قوم کی خدمات میں پیش رہے گا، اور اپنی پرانی روایات کو قائم رکھے گا۔

میری یہ دلی خواہش ہے کہ روزانہ ہند پھلے پھولے، اور ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔"

دستخط
امرت کور

شری لال بہادر شاستری

وزیر ریلوے و مواصلات، حکومت ہند

"یہ معلوم کر کے مجھے مسرت ہوئی ہے کہ" روزانہ ہند" اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے، اس اخبار نے فرقہ وارانہ میل جول بڑھانے، اور بدیشی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ابھی اسے بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے، اور میں اس کی آئندہ خدمات کو اس کے ماضی سے بھی زیادہ شاندار دیکھنے کا متمنی ہوں۔"

دستخط
لال بہادر شاستری

شری بلونت رائے مہتہ
جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی۔ نئی دہلی

"بلاشبہ روزانہ ہند کا یہ ایک قابل تعریف کارنامہ ہے، کہ وہ تمام سیاسی، معاشرتی، اور فرقہ وارانہ یورشوں کے مقابلہ میں زندہ رہا۔ اور اس نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی کے پچیس سال پورے کئے۔ مصائب و آلام سے لاپرواہ ہوکر اس نے قوم پرستی کے پیغام کو عوام تک پہونچایا، اور حق و صداقت کی راہ پر چل کر انسانیت کی خدمت کی۔ اس اخبار نے اپنا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے، اور جرأتِ یقین اور عزم بالجزم سے اپنے دوستوں اور قدردانوں کے ایک وسیع حلقہ میں مقبول ہوگیا ہے میری بہترین دعائیں اس کے ساتھ ہیں"

دستخط
بلونت رائے مہتہ

شری اتولیہ گھوش
صدر مغربی بنگال پردیش کانگرس کمیٹی

"مجھے بڑی مسرت ہے کہ "روزانہ ہند" عنقریب اپنی سلور جوبلی نمبر شائع کر رہا ہے۔
یہی ثبوت ہے اس امر کا کہ ایک قوم پرور اخبار جس نے ماضی میں بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ جب کہ ہندستان کے کندھے پر بدیشی غلامی کا جُوا تھا۔ اور ہندستانی قوم پروری اس کے سامراجی آقاؤں کے نزدیک مردود اور ملعون تھی۔ وہ جملہ مصائب و آلام کو جھیل کر اب مادرِ ہند کی بیش از بیش خدمت کے لئے زیادہ طاقت ور ہو گیا ہے، ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ ملک اور قوم کی حمایت میں فرقہ واریت کی مخالفت کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا ہوتی تھی۔ اور تکلیفیں اور سزائیں بھگتنا پڑتی تھیں۔ مگر قابلِ مبارکباد ہے روزانہ ہند جو ان امتحانات کی بھڑکتی رگ میں سے قومی استحکام کا جھنڈا بلند کئے صحیح و سلامت نکل آیا۔
خدا کرے کہ یہ اخبار قوی سے قوی تر ہوتا جائے۔ رائے عامہ کو سیدھی راہ پر لگاتا رہے۔ اور اسی طرح ایک عظیم تر، زیادہ خوشحال اور شاندار ہندستان کی تعمیر میں برابر کا شریک رہے۔"

دستخط
اتولیہ گھوش

شری گوند ولبھ پنت
وزیر اعلیٰ اتر پردیش، لکھنؤ

یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ "روزنامہ ہند" روز اول سے ان تھک مشقتوں کے پچیس سال مکمل کرنے کے بعد اب بڑی خوشی کے ساتھ اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے، اور اس موقع پر ایک سلور جوبلی نمبر شائع کر رہا ہے۔ "روزنامہ ہند" نے صحافت کی شاندار روایات برقرار رکھیں، اور اپنے صحیح مسلک پر قائم رہا۔ باوجودیکہ اسے اس میں بڑی دشواریوں، اور امتحانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے وہ طاقتیں گمراہ کر سکیں نہ اس کے سدراہ ہو سکیں، جو گذشتہ ۲۵ سال کے بیشتر حصہ میں سرزمین بنگال میں سرگرم کار رہیں، اب ایسے سازگار فضا میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ آئندہ بھی ملک کی مفید اور عظیم خدمات انجام دیتا رہے گا۔ میں اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

دستخط
جی۔ دی۔ پنت

شری سیلا کمار مکرجی
اسپیکر مغربی بنگال لیجسلیٹو اسمبلی

اردو کا یہ اخبار اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے۔ "روز انہ ہند" گذشتہ پچیس سال جس مسلک پر قائم رہا اس کی وجہ سے اسے سیاسی حالات کے انقلابی تغیرات کے دوران بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ لیکن اس کی یہ قربانیاں اکارت نہیں گئیں۔ اور آج ہم بدترین قسم کی فرقہ واریت کے برعکس امید کی کرن، اور نور کا ظہور دیکھ رہے ہیں۔

سلور جوبلی کے اس موقعہ پر میں اخبار کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور اس کے مستقبل کی کامیابی کا خواہشمند ہوں۔ مجھے امید ہے کہ متعدد مسائل جو اس وقت ہمارے نوزائیدہ خودمختار جمہوریہ کو درپیش ہیں۔ جس کی بنا، مذہبی، لسانی اور ثقافتی آزادی پر رکھی گئی ہے۔ یہ اخبار اسی طرح جرأت کے ساتھ ان کو حل کرے گا، جس طرح کہ اس نے زمانہ گذشتہ کے مخالف حالات میں کیا تھا۔"

دستخط
سیلا کمار مکرجی

مسٹر فضل علی
چیئرمین جدید ریاستی تنظیمی کمیشن، نئی دہلی

"یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی، کہ "روزنامہ آزاد ہند" جو بنگال کا سب سے قدیمی قوم پرور اردو اخبار ہے۔ امسال اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے، میں دعا کرتا ہوں، کہ یہ خدمت عوام میں ایک طویل مدت تک اور مسلسل سرگرم عمل رہے۔"

دستخط
فضل علی چیئرمین

مرزا سر محمد اسماعیل
۲ علی عسکر روڈ، بنگلور

" اس مبارک تقریب پر جبکہ " روزانہ ہند کلکتہ " اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے ، میں اس کی بہبودی اور کامیابی کا اس لئے متمنی ہوں کہ اس نے بنگال کے اردو دانوں کی مسلسل خدمات انجام دیں ۔ بنگال سے مطلب د میں احمد؟ ہ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال دونوں لیتا ہوں ———— "

ایسے ہی اخبار جو زندگی کے مسائل کے متعلق ایک روادارانہ رویہ رکھتے ہیں اور ہر قسم کے تعصب ———— فرقہ وارانہ ، لسانی ، یا صوبائی جن سے ہمارا ملک بھرا پڑا ہے ———— سے بری ہیں ۔ میرے خیال میں حقیقتاً ملک کی سچی خدمت کر سکتے ہیں ۔ جب کہ یہ پیچیدہ اور دشوار گتھیوں میں الجھا ہوا ہو خصوصاً میں اسے بڑی قدر دانی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ بنگال میں ایک اعلیٰ قسم کا اردو اخبار موجود ہے ۔ "

دستخط
مرزا محمد اسماعیل

سردار سورن سنگھ

وزیر تعمیرات و سپلائی حکومت ہند

"یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی، کہ سالہا سال کی جدوجہد کے بعد "روزانہ ہند" اب اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے۔ اپنی زندگی گذشتہ اضطراری زمانے میں یقیناً یہ اخبار اسی نیک جذبہ سے متاثر ہوتا رہا ہے جس کا یہ علمبردار تھا یعنی بدیشی غلامی سے ملک کو آزاد کرانا بےجا نہیں ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ غیر ملکی حکومت کے زمانہ میں یہ آسان نہیں تھا کہ "روزانہ ہند" جیسا کوئی قوم پرور لسانی اخبار ان طاقتوں کے ہاتھ سے بچ نکلتا جو آزادی کی ہر آواز کا گلا گھونٹنے کو آمادہ رہتی تھیں۔ اس اخبار کا ان تمام صعوبتوں کے زندہ رہنا ہی اس کی بنیادی پالیسی کے استحکام کی دلیل ہے۔ اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اخبار اسی طرح اس محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی آزادی کو محفوظ رکھنے کی سعی کرے گا۔ جس طرح کہ اس نے اس کے حصول میں کی تھی۔ جب تک اس کی وہی بنیادی پالیسی رہے گی، جیسی کہ ۲۵ سال سے چلی آ رہی ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے۔ میں اس اخبار کی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں۔"

دستخط
سورن سنگھ

ڈاکٹر آر، احمد

وزیر زراعت حکومت مغربی بنگال

"یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی، کہ سال رواں میں "روزانہ ہند" کے سلور جوبلی کی تقریب منائی جارہی ہے، اب بھی میرے ذہن میں یہ بات بالکل تازہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں میرے کمرہ کے اندر نیشنلسٹ مسلمانوں کی میٹنگ طلب کی گئی تھی، اور مجھے اس کی صدارت کا موقع ملا تھا۔ اس میٹنگ میں ہم نے اس بات کی ضرورت محسوس کی، کہ فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈا کے سدباب کے لئے ایک قوم پرور اردو اخبار جاری کیا جائے۔ چنانچہ اسی روز "روزانہ ہند" کی نیو رکھی گئی۔ اس واقع کو پچیس سال گذر چکے ہیں۔ جب سے اب تک روزانہ ہند اردو قارئین کے گھر گھر میں سچی قومیت کا پیغام پہونچا رہا ہے۔ علاوہ بریں بڑی پامردی کے ساتھ اس نے کانگریس کے اصول کی حمایت کی۔ بلاشبہ سنہ ۱۹۳۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تک کا دور روزانہ ہند کے لئے بڑا ہی آزمائشی تھا۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ، اس اصول پر قائم رہنے کے لئے اخبار مذکور کو ان گنت مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن محب وطن احباب کی متحدہ کوششوں نے بدترین دور میں بھی اس کو زندہ رکھا۔ اور اب خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کے پچیس سال کی تقریب منانے کی تیاری کر رہا ہے میں روزانہ ہند کو اپنی بہترین خوشنودی بھیجتا ہوں۔"

دستخط

آر۔ احمد

شری پرفلا چندر سین
وزیر سپلائی و آبادکاری حکومت مغربی بنگال

"یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ "روزانہ ہند" جو ملک کی تحریک آزادی میں تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود نکلا ۔
ب سالِ رواں میں اس کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے ۔ یہ بنگال کا سب سے پرانا نیشنلسٹ اردو اخبار ہے ۔
میں روزانہ ہند کی مسلسل عوامی خدمت کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں "

دستخط
پرفلا چندر سین

سر دھیرن مترا ۔ سی ۔ بی ۔ ای
شیرف کلکتہ

" روزانہ ہند " کی سلور جوبلی ایک ایسی تقریب ہے ۔ جس میں نہ صرف اس کے ارباب حل وعقد کو ہی خوش ہونا چاہیئے بلکہ تمام پریس اور عوام کو بھی خوش ہونا چاہیئے ۔ جن کی اس نے اتنی اچھی طرح خدمت کی ہے ۔ اس کے منتظمین ملک اور قوم کی دیانتدارانہ خدمت پر بجا طور پر فخر و ناز کر سکتے ہیں ۔ پریس بھی اس بات پر خوش ہوگا کہ ایماندار اور بے خوف صحافت باوجود ایک طاقت ور حکومت کی مخالفت کے زندہ رہی ۔ اور عوام اس لئے خوش ہوں گے ، کہ ایک اخبار جس نے مخالف اور موافق ہر قسم کی اطلاعات سے عوام کی ترجمانی کی ہے اب زندہ اور باقی رہے گا ۔ گاندھی جی کا قول تھا کہ اخبار کا ایک مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ عوام کے احساسات کو سمجھے ، اور ان کی ترجمانی کرے ، دوسری خصوصیت یہ ہو کہ وہ عوام میں کچھ مطلوبہ جذبات پیدا کرے اور تیسری یہ کہ عوام کی بعض خرابیوں کو بے خوفی سے بے نقاب کرے ۔

" روزانہ ہند " ان تمام امتحانات میں ۲۵ سال تک کامیاب رہا ۔ اور میری دعا ہے کہ یہ آئندہ بھی سالہا سال تک اسی طرح خدمت عامہ میں مشغول رہے ۔

دستخط
ڈی ، این مترا

سرجیت سنگھ مجیٹھیہ

نائب وزیر دفاع حکومت ہند، نئی دہلی

" مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ " روزانہ ہند " اردو کی پچیس سالہ جوبلی کے موقعہ پر ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں حب الوطنی، یگانگت و ہندستانی قومیت کے اونچے جذبات کی ترجمانی جس بیباکی اور بے خوفی سے آپ کے اخبار نے کی ہے وہ دوسرے قومی اداروں و رسائل و اخبارات کے لئے قابل تقلید ہے

شروع میں حکومت وقت کی سختی و بے رخی، ہم مذہبوں کی بے اعتنائی فرقہ وارانہ ذہنیت میں رنگے ہوئے جنونیوں کی منافرت ایسی دشوار گذار تکالیف کا سامنا کرتے ہوئے آپ کے جریدہ نے ملک و قوم کی جو خدمت کی ہے، اس کے لئے صوبہ بنگال کے ہر فرد کو خصوصاً ہندستانیوں کو عموماً آپ کا ممنون ہونا چاہئے

بنگال میں اپنی دو صد سالہ حکومت کے دوران میں انگریزوں نے صدیوں کے اکٹھے مل جل کر رہنے والے بھائیوں میں بیسویں صدی کے آغاز میں منافرت کا بیج بویا، مذہب کی بنا پر جداگانہ انتخابات اس سلسلے کی ایک مضبوط ترین کڑی تھے۔ عوام اس نعرہ سے متاثر ہوتے خود غرضوں نے انگریز حاکموں کے اشاروں پر اس زہریلے ہتھیار کو اپنے جاہ و حشم کا ذریعہ بنا کر ہندستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط کیں۔ بیس سال کے عرصہ میں شر و افترا کا یہ پودا کڑوے پھل دینے لگا اور انگریز حاکموں کی مدد سے فرقہ وار لیڈروں کی شہ پر ناخواندہ ہندستانی عوام نے ایکدوسرے کو ہندو مسلم سمجھتے ہوئے ایکدوسرے کے خون سے ہاتھ رنگنے شروع کئے، مذہب، انسانیت، عقل، وطن پرستی، ہمسایہ داری پر ایک بدنما دھبہ تھا۔ ہندستان کی تاریخ میں عوام نے مذہبی جنون سے متاثر ہو کر معصوم عورتوں اور بچوں کو کبھی بھی موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔ اتھاہ ہندستان کی زمین پر بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور علاقہ کے صوبہ داروں کی فوجیں ایک دوسرے سے لڑا کرتی تھیں، مگر ہر مذہب و ہر فرقہ کے عوام بلا رنگ و بلا روک ٹوک اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے، فاتح کو عوام محنت کش اپنا حاکم مان لیتے تھے اور سماجی زندگی جوں کی توں چلتی جاتی تھی۔ یہ بادشاہ، راجے، نواب و صوبیدار اس سرزمین سے اٹھتے تھے اور عروج و منازل کی گھاٹیاں طے کرتے ہوئے یہیں پیوند خاک ہوتے تھے، انگریز بدیشی حاکم تھے، یہاں حکومت کرنے آئے تھے یہاں آباد ہونے کیلئے نہیں اسلئے ان کو اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے مذہبی منافرت، ذات پات کی بنا پر تفرقات، پیشہ وروں میں ایکدوسرے سے بیگانگی کا زہر پھیلا کر سماجی فضا کو ہر وقت مکدر رکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی

ایسی فضا میں ناخواندہ عوام و خود غرض رہبروں کو ہندستانی یکجہتی و قومیت کا پیغام دینا مشکل ترین کام تھا، یہ آپکے اخبار کا ہی حصہ تھا کہ باوجود ایسی دھندلی فضا و جنونیت کے ہوتے ہوئے دلیری و جرأت سے اپنا پیغام لگاتار پچھلے ۲۵ سال سے عوام و رہبروں تک پہنچاتا رہا ہندستان کے آئین کے مطابق پچھلے انتخابات میں عوام نے یہ ثابت کر دیا کہ جس مقصد و عزم کو لیکر آپ نے آج سے ۲۵ سال پہلے میدان عمل میں قدم رکھا تھا، قوم و ملک کا بہترین مفاد اسی میں تھا و نیز آئندہ بھی اسی راستے پر گامزن ہونے سے قوم و ملک کی بہبودی و ترقی ہوتی چلی جائیگی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ "روزانہ ہند" اپنے ہموطنوں کو قومیت و وطنیت کا سبق دیتا رہے۔"

دستخط
سرجیت سنگھ مجیٹھیہ

ڈاکٹر ذاکر حسین
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

"مجھے اس خبر سے مسرت ہوئی کہ "روزانہ ہند" اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے، یہ اپنی ان گذشتہ پچیس سالہ خدمات پر فخریہ نظر ڈال سکتا ہے، جو اس نے عظیم طوفانی اور پُر مصائب دَور میں انجام دی تھیں۔ اس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتے ہوئے نظام میں اس کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم کام ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کے لئے پریس ایک زبردست ترین حربہ ہے' اور پُر معلومات رائے عامہ کی بنیاد پر ہی ایوانِ جمہوریت تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "روزانہ ہند" اس اہم کام میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس سلور جوبلی کے موقعہ پر میری طرف سے پُر خلوص مبارکباد قبول فرمائیے۔

دستخط
ذاکر حسین

شری ھرن چندر مکھرجی
گورنر مغربی بنگال

ڈاکٹر بدھن چندر رائے
وزیر اعلیٰ مغربی بنگال

سری راماسوامی مدالیار
صدر یونسکو (اقتصادی) ادارۂ اقوام متحدہ

" مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی، کہ "روزانہ ہند" نے اپنی اشاعت کے پچیس سال پورے کر لئے ہیں اور عنقریب اس کی سلور جوبلی منائی جائے گی۔

اگرچہ میں اردو نہیں جانتا، اس لئے میں اس اخبار کا براہ راست پڑھنے والا نہیں، پھر بھی اس کی تحریرات اور مضامین کے متعلق میں ایک زمانے سے اتنا کچھ سن رہا ہوں، کہ اس کے بے خوف اور نڈر طرز عمل کا مداح ہو گیا ہوں۔ ہز ایکسیلنسی گورنر مغربی بنگال اور دوسری ممتاز ہستیوں نے اس کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس خوشی کے موقعہ پر میں بھی اپنی مبارکباد کا اس میں اضافہ کر دوں۔ یہ کہنے کی مجھے اجازت دیجئے، کہ آزاد ہونے کے بعد بھی ہندستان میں آزاد خیال صحافت کی ضرورت ختم نہیں ہوئی بلکہ اب تو اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ "روزانہ ہند" اپنی گذشتہ روایات کو برقرار رکھے گا اور اب اس سے بھی عظیم تر خدمات انجام دے گا جتنی کہ اس نے ماضی میں دی ہیں۔"

دستخط

اے، راماسوامی مدالیار

میجر جنرل مہندر سنگھ چوپڑہ
کمانڈر چھٹا ڈویژن، کلکتہ

"یہ معلوم کر کے مجھے مسرت ہوئی، کہ ۲۵ سال کی وطن دوست خدمات کے بعد اب "روزانہ ہند" اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے
اس نیک مقصد میں میں اس کے لئے ہر نوع کی کامیابی کا خواہشمند ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ فرقہ پرستی اور صوبائی تعصب کے
خلاف صف آرا رہے گا۔

ایک بار اور میں اس تمنّا کا اظہار کرتا ہوں، کہ خدمت خلق کی مسلسل جدوجہد میں یہ کامیاب و کامران رہے۔

دستخط
مہندر سنگھ چوپڑہ

ڈاکٹر سیّد محمود

۵۲، ساؤتھ ایونیو، نیو دہلی

مکرمی السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی، کہ "روزانہ ہند" اپنی سلور جوبلی منا رہا ہے۔ "روزنامہ ہند" سے اور اس کی پالیسی سے میں اوّل دن سے واقف ہوں۔ "روزنامہ ہند" نے بڑی بڑی ملکی و قومی خدمات انجام دی ہیں، اس زمانہ میں جب قوم پرور مسلمانوں کے لئے کام کرنا آسان نہ تھا۔ اور ہر طرف سے ان کی مخالفت ہوتی تھی، اور اس وقت روزنامہ ہند نے نہایت ہمت سے اور بلا خوف نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا ساتھ دیا۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا ایک آرگن تھا۔ اس کی پالیسی اور اس کے طرزِ کار میں اوائل زمانہ میں میرا مشورہ برابر شامل رہا، اور اس مشکل زمانہ میں باوجود فرقہ پرستوں کی شدید مخالفت کے کانگریس کی بغیر کسی امداد کے زور و شور سے تائید کرتا رہا۔

مخلوط انتخاب کا اس زمانہ میں نام لینا مسلمان گناہ سمجھتے تھے، انگریزوں نے کچھ اس طرح جادو کردیا تھا کہ بغیر جداگانہ انتخاب کے مسلمان قوم ہندوستان میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ معلوم ہے۔ گذشتہ الیکشن مخلوط ہوا اور مسلمانوں کو معلوم ہوگیا، کہ مخلوط انتخاب ان کے لئے کس درجہ مفید ہے، آئندہ اس کے تاثرات اور اقلیت کے لئے اس کا مفید ہونا مستقبل کے حالات سے ثابت ہوگا، الیکشن کے وقت ہر جگہ کثرت سے مسلمانوں نے یہ کہا کہ اگر ہم کو مخلوط انتخاب کا یہ اثر معلوم ہوتا تو پھر ہم تقسیم ہند کیوں ہونے دیتے۔ "روزنامہ ہند" مخلوط انتخاب کا ہمیشہ سے حامی رہا، اس طرف ایک عرصہ سے یہ پرچہ میرے پاس نہیں آتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی پالیسی و طرزِ عمل وہی ہوگا جو پہلے تھا، اس موقعہ پر میں کارکنان روزانہ ہند کو دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کہ اس نے اپنا ۲۵ سالہ دَور اس خیر و خوبی سے ختم کیا اور آئندہ اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔"

خاکسار
سیّد محمود

ڈاکٹر کالیداس ناگ

ممبر انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز و صدر انڈو مڈل ایسٹ ، ایسوسی ایشن ، کلکتہ

" روزانہ ہند" ہر روزنامے کی طرح خبریں شائع کرنے اور دوسرے جرائد کی طرح لگے بندھے فرائض انجام دینے کے علاوہ بھی بڑی سرگرمیوں کا حامل ہے۔ اخبار کے قابل مدیر نے اپنے گرد صحافیوں اور مصنفین کا ایک ایسا حلقہ جمع کر لیا ہے ، جو ہمارے ملک کی غلامی کے وقت بھی باوجود سخت مشکلات و مصائب جھیلنے کے ہمیشہ آزادی اور قوم پروری کے نام پر جہاد کرتے رہے برطانیہ کے اقتدار کے انحطاط کے پہلے دور میں پہلی گول میز کانفرنس کے ساتھ ساتھ " روزانہ ہند" بھی عالم وجود میں آیا مہاتما گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ساری قوم کیا ہندو کیا مسلمان مکمل آزادی (پورنا سوراج) کا مطالبہ کرے ، کراچی کانگریس میں سنہ ۱۹۲۹ء میں جب یہ فیصلہ ہوا تو " روزانہ ہند" نے بھی جنم لیا۔ قوم پرور مسلمانوں کے لیڈر ، ڈاکٹر آر ، احمد اس واقعہ کے وقت موجود تھے ۔ اور انہیں کے الفاظ ہیں کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کے دس سال اس اخبار کے لئے بڑے صبر آزما تھے ، جو برابر کانگریس کی ہی حمایت کرتا رہا۔

یہ سیاسی طور پر جیسا بھی دور اندیش تھا ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہمیشہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے مابین باہمی تعلقات کے خوشگوار کرنے کی سعی کی ہے ، اور فرقہ پرستی کو ٹھکرا کر رواداری اور مشترکہ بہبودی کے اصول کو اپنایا جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں ضروری ہے۔

مَیں آخر میں " روزانہ ہند" کی ادبی خدمات اور اردو ادب کی ترویج اور اصلاح پر اسے مبارکباد پیش کروں گا ، وہ ادب جو ہندوستان کو یہاں کے چار کروڑ مسلمانوں کی طرف سے ایک بے بہا تحفہ ہے ، وہ ہندوستانی مسلمان جن کے متعلق ہمیں یقین ہے ، کہ وہ سارے اسلامی ایشیا کے لئے ہندوستان کی طرف سے کلچر اور خیرسگالی کے پیامبر ہوں گے۔ ایشیا کے اتحاد اور بین الاقوامی رواداری کے مقصد کے لئے " روزانہ ہند" بھی کافی حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے ، کیونکہ اس کے اردو ادارئیے اور مضامین ہمارے معزز وزیر تعلیم مولانا آزاد کے توسط سے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ذریعہ مشرق وسطیٰ کے فارسی اور عربی رسائل میں شائع کئے جا سکتے ہیں۔

زبان اردو ہندوستانی ادب کو صدیوں سے مالا مال کرتی آئی ہے ، اور میں بین الاقوامی ، پی ، ای ، این کلب کے ممبر کی حیثیت سے " روزانہ ہند" کو اس کی سلور جوبلی کے موقعہ پر اپنی دلی مبارکباد اور تہنیت پیش کرتا ہوں ، جو ہندوستان کا مشہور ترین اردو اخبار ہے۔ "

دستخط
(ڈاکٹر ، کالی داس ناگ

شری جے پرکاش نرائن

کیمپ پوانی ، مدھیہ پردیش

"یہ امر ہر محب وطن ہندستانی کے باعث مسرت ہوگا۔ کہ "روزانہ ہند" نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی کے پچیس سال مکمل کرلئے جب ہمارے ذہن میں برطانوی دور کے فرقہ وارانہ جنون اور پاگل پن کی یاد آتی ہے، تو یہ معجزہ سے کم دکھائی نہیں دیتا کہ روزانہ ہند جیسا بے باک اور نڈر قوم پرور اردو روزنامہ اپنی سلور جوبلی منانے کے لئے کیسے زندہ اور سلامت رہا۔ اس مہتم بالشان تقریب پر میں روزانہ ہند کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں، اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ یہ اخبار اپنی گذشتہ جرأت اور جوش کے ساتھ قوم کی برابر خدمت کرتا رہے گا۔"

دستخط

جے پرکاش نرائن

محمد عبدالغفار
جنرل سکریٹری ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

"اردو زبان کے کسی اخبار کا پچیس سال تک اپنے مسلک پر قائم رہ کر جدوجہد کرتے رہنا ایک ایسا واقعہ ہے، جس پر اخبار کا شعبہ ادارت بلاشبہ مبارکباد کا مستحق ہے، اس دوران میں جس نشیب و فراز سے روزنامہ ہند گذرا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا میرے لئے دشوار نہیں۔ اس لئے کہ میں خود ساری عمر اخبار نویس رہا ہوں۔

ملک کے موجودہ حالات میں جب اردو زبان ایک سوتیلی زبان بنا دی گئی ہے، تو "روزنامہ ہند" کا زندہ رہنا اور اپنے وجود کو قومی زندگی میں موثر بنانا بلاشبہ ایک کارنامہ ہے۔ میں اس کی ۲۵ سالہ جوبلی کی تقریب میں مخلصانہ مبارکباد اور اپنی دعا کے ساتھ شریک ہوتا ہوں کہ اس روزنامہ کو زمانہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ طاقت اور ہمت حاصل ہو۔"

دستخط
محمد عبدالغفار

خواجہ غلام السیدین
مشیر تعلیمی وزارت تعلیم حکومت ہند

"مجھے مسرت ہے کہ "روز آزاد ہند" نے اپنی آزاد صحافتی زندگی کے پچیس سال مکمل کرلئے ہیں، اس نے قومی تحریک کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خصوصاً ہندستان کے اردو داں لوگوں میں اور اس دوران میں اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس نئے دور میں جو سامنے آرہا ہے، ایسے اخبارات کی سخت ضرورت ہے، جو رائے عامہ کی تعلیم و تربیت میں باعزت کردار ادا کرسکیں اس عصر جدید کو جو عناصر متاثر کرتے ہیں، اور جن کے باعث رائے عامہ گمراہ بھی ہوجاتی ہے، اور ان میں بہت سے اخبارات بھی شامل ہیں ـــــ یہ مبالغہ آمیز نہیں کہ ایسے اخبارات کی ضرورت ہے، جو اچھے، ذمہ دار اور معاشرتی طور پر حساس ہوں مجھے امید ہے کہ یہ اخبار ملک کی زندگی میں ایک مفید سے مفید تر کردار ادا کرے گا۔"

دستخط
کے۔ جی۔ سیدین

مسٹر ہمایوں کبیرؔ
سکریٹری وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند

"میں دلی مسرت کے ساتھ "روزانہ ہند" کو اس کی جوبلی کے موقع پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس نے ہمیشہ ملک کی بڑے باخلوص اور باہمت طریقے پر خدمت کی ہے، اور امید ہے کہ آئندہ بھی اسی لائحہ عمل پر قائم رہے گا۔ آزادی سے پہلے اخبارات کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ حصولِ آزادی کی دھن میں سب کچھ برداشت کر لیتے تھے، لیکن حصولِ آزادی کے بعد اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اخبارات کے فرائض اہم تر اور مختلف ہو گئے ہیں۔

جمہوریت کی بقا کے لئے ایماندار، آزاد، اور بےخوف صحافت کا وجود مشروط اور لازمی ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔۔ کہ "روزانہ ہند" کے قدم اس مسلک سے کبھی نہ ڈگمگائیں گے۔"

دستخط
ہمایوں کبیرؔ

شری کیشب چندر گپتا
صدر بار ایشوسی ایشن

" روزانہ ہند" کو اخبار کے نام سے مخاطب کرنا ہی غلط ہے۔ یہ اپنی اشاعت کی توسیع کے لئے قارئین کو صرف معززین اور واقعات کے متعلق سنسنی خیز خبریں دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا۔ "روزانہ ہند" کی سلور جوبلی کی اس کے بہی خواہوں اور قارئین کو اتنی خوشی نہ ہوتی، اگر وہ صرف ایک تجارتی جریدہ ہوتا جو باوجود مخالفت کے زندہ اور ۲۵ سال تک نفع بخش طریقہ پر جاری رہا۔ میں "روزانہ ہند" کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس لئے زیادہ مسرور ہوں کہ اس نے اپنے مشن کے لئے ہمیشہ جی جان سے جدوجہد کی اور کبھی راہِ راست سے روگردانی نہیں کی۔ اور اس کا مسلک صرف ایک تھا۔ غیر ملکی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جذبۂ آزادی کی ترویج۔

یہ امر ظاہر ہے کہ کس طرح ہمیں حصولِ آزادی کے لئے سخت در پردہ مخالفت یعنی فرقہ پرستی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس پُر آشوب دور میں اگر کوئی اردو روزنامہ بہتے ہوئے دھارے کے ساتھ چل نکلتا تو اس کی مالی طور پر کامیابی یقینی تھی اور اخبار کے منتظمین کے لئے بھی حصولِ اقتدار آسان تھا۔ اگر وہ برسرِ اقتدار لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ اس زمانے میں ایک مسلم اردو اخبار کے لئے ایک بہت بڑا ایثار تھا، اگر وہ ذاتی مفاد کے حسین دھوکوں کو ٹھکرا کر اور راسخ العقیدہ ہو کر اتحاد اور حبِ وطن کے اصولوں کو ہاتھ سے نہ دے۔ میں اس دور میں صرف "ہند" کا پڑھنے والا یا اس کا خاموش مداح ہی نہیں رہا۔ بلکہ مجھے اس کی سربلندی کی جدوجہد میں کبھی کبھی اپنے علاوہ امداد بھی کرنا پڑی۔ اس اخبار کے لاکھوں مخالفین اس کی تباہی کے درپے ہوگئے، کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ اس کی مالی حالت ابتر ہے، لیکن فتح کا سہرہ اسی کے سر رہا۔ اور آج "روزانہ ہند" اپنی سلور جوبلی منانے کی تیاریاں کر رہا ہے

جیسا کہ ظاہر ہے "ہند" نے اپنا یہ نام اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے رکھا ہے، اور حقیقتاً اس نے اپنی اشاعت کے دوران میں اپنے کو ہندستان کا سچا وفادار ثابت کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی ان اخبارات کی فہرست بنائی گئی جنہوں نے ہندستان اور پاکستان کی آزادی میں حصہ لیا تو "روزانہ ہند" کا نام پیش پیش رہے گا۔

میں انتہائی فخر سے آج "روزانہ ہند" کو اس تقریب پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس کی بقاء کا دل سے دعاگو ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اس کی زندگی حبِ وطن، انصاف اور حق کے راستے پر گامزن رہے گی۔ آمین۔"

دستخط
کیشب چندر گپتا

٦٧٠١

خان بہادر رضا علی وحشت

تبرکاتِ وحشت

کرم فرمائے عالم تسلیم و نیاز

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ اگست کہ پہونچ کر باعث مسرت ہوا۔ روزنامہ ہند کی سلور جبلی منانے میں مشاہیر اہل قلم ضرور حصہ لیں گے۔ اگرچہ یہ خاک نشیں زندگی کی تمام دلچسپیوں سے فارغ ہو چکا ہے۔ لیکن اس موقعہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی بساط بس اتنی ہی ہے کہ اپنی ایک غزل پیش کرے۔ تصویر موجود نہیں ہے، اور ضعف ناتوانی اس حد تک ہے کہ نقل و حرکت مشکل ہے

اپنی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے سے قاصر ہوں، نہ اس کی ضرورت ہی محسوس کرتا ہوں کیوں کہ ؎

کہ در شہر شمار سوائے الفت را کی داند؟ من آں کس را کہ می دانم کہ وحشت را نمی داند!

نیاز کیش

وحشت

غزل

پھر دلِ نازک پہ بارِ غم گراں ہونے لگا
پھر خیالِ خدمتِ پیرِ مغاں ہونے لگا

پھر کسی کی بزم میں مجھ کو ملا اذنِ سخن،
پھر طرب انگیز عنوانِ بیاں ہونے لگا

پھر نوازش آپ کی حد سے زیادہ ہو گئی،
پھر دلِ آفت رسیدہ بدگماں ہونے لگا

پھر محبت اُن نگاہوں سے عیاں ہونے لگی
پھر وفورِ لذتِ شوقِ نہاں ہونے لگا

پھر ہوا میرے لئے شوق آفریں اس کا شباب
پھر میرا دل عہدِ پیری میں جواں ہونے لگا

پھر ہوا مائل غزل پر وحشتِ شیریں سخن
پھر رواجِ شیوۂ حسنِ بیاں ہونے لگا

جاڑے کے موسم میں
آپ کے اور آپ کے خاندان کیلئے
اُونی کپڑے
Winter Ahead
WOOLLENS
for
ladies, gentlemen
and children
J.S. Mohamedali
CLOTH MERCHANT
TOWER HOUS
CHOWRINGHEE SQUARE · CALCUTTA
جے۔ ایس محمّد علی
کلاتھ مرچنٹس۔
ٹاور ہاؤس
چورنگی اسکوائر، کلکتہ۔

دریا بہ حباب اندر

روزانہ ہند" کی پچیس سالہ ہنگامہ خیز زندگی کے حالات

وزانہ ہند" کا اجراء

"روزانہ ہند" پچیس سالہ ہنگامہ خیز زندگی کے حالات کو اس طرح چند
ت میں قلمبند کرنا "دریا بہ حباب اندر" کے مترادف ہوگا، چونکہ اس
جوبلی نمبر میں اس کی ضرورت ہے، کہ ناظرین کرام کو ان حقائق سے
کیا جائے، جو اس اخبار کا سرمایۂ حیات ہیں۔ تفصیلاً نہ سہی اجمالاً
کیونکہ تفصیل کے ساتھ لکھنے میں تو ایک دفتر بے پایاں ہو جائے گا
س سلور جوبلی نمبر کے دامن میں اتنی گنجائش کہاں۔ مگر اپنی چادر
سعت کو دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانا قرین دانشمندی ہے، اس لئے
قناعت کی جاتی ہے۔

پر سنہ ۱۹۲۹ء کے پُر آشوب سال کی ایک شام تھی، جب کہ ڈاکٹر آر
جو آج کل حکومت مغربی بنگال کے وزیر زراعت ہیں ان کے چیمبر
ایسپلینیڈ میں چند مخلص اور قوم پرور مسلمان جمع ہوئے، جن میں
لانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جناب طیب بھائی ظریف، حاجی
شید، حاجی محمد اکبر پشاوری، مولوی عبدالمالک، اور غیاث الدین
ب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اصحاب ایک ایسے جذبہ
سے متاثر تھے۔ جو مسلمانانِ ہند کی سیاسی حیات و مرگ سے
تا تھا۔ اس وقت فرقہ پرستی اور اتحاد دشمنی نے فضا کو مسموم کر رکھا
اس کی ضرورت تھی کہ اسے پاک صاف کر کے اس قابل بنایا
لمانان ہند یکجہتی، اور اتحاد و تعاون کے ساتھ اپنے برادرانِ
دوش بدوش چل کر ملک کی تحریک آزادی میں حصہ لے سکتے نیز

جو مسلمان گمراہ ہو کر بعض خود غرض اور جاہ پرست لیڈروں کے دام فریب میں مبتلا تھے، ان کے دل و دماغ میں بھی وقت کے جدید تقاضوں اور ملک اور قوم کی اہم ضروریات کا احساس پیدا کرنا تھا۔ اور ان پر یہ حقیقت واضح کرنا تھی، کہ فرقہ پرستی کے جس طوفان میں وہ اپنی غفلت اور صحیح ذہنی تربیت کے فقدان کے باعث تنکے کی طرح بہے جا رہے ہیں۔ وہ انہیں تباہی اور بربادی کی جانب لے جا رہا ہے، چونکہ اِن دردمندانِ قوم نے مرض کی صحیح تشخیص کر لی تھی، اور ان کے نزدیک اس کا واحد علاج یہ تھا کہ صحیح خطوط پر مسلمانان ہند کی تربیت کی جائے، اس لئے یہ طے پایا کہ ایک ایسا اخبار جاری کیا جائے، جو مسلمانوں کے داخلی اور خارجی حالات کی اصلاح کرے، ان کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرے اور آپس کے اختلافات کو مٹا کر ہندوستان کی متحدہ قومیت کا انہیں حزو لاینفک بنائے

مسلمانان ہند کی سیاسی گمراہی کا ایک اور سبب بھی تھا، اور وہ یہ کہ برطانوی حکومت نے ان کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا تھا، اور ہندوستان کے اندر پھوٹ ڈالنے کے لئے وہ جب چاہتی تھی انہیں استعمال کرتی تھی انہی پر کیا منحصر ہے، ہندوؤں کی بعض فرقہ پرست جماعتوں کو بھی اس نے اپنا لیا تھا، اور بوقت ضرورت وہ ان دونوں کو آپس میں لڑا دیتی تھی اس سے اس کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کامیاب رہتی تھی۔ ان چند قوم پرور مسلمانوں کو شدید طور پر اس کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس روزنامے کی بنیاد ڈال دی، اور ڈنکے کی چوٹ سے اس کا اعلان کر دیا کہ یہ اخبار کسی تجارتی غرض، یا کسی ذاتی مقصد

یا تفریحی ذوق کی تسکین کے خیال سے جاری نہیں کیا جا رہا ہے ، بلکہ ،
اس کا ایک مسلک اور ایک شعار ہے ، اور اس کی ایک منزل اور ناگزیر
ضرورت ہے ۔ اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اپنے اپنے طور پر
اور اپنی اپنی دھن میں الگ الگ راگ آلاپ رہی تھیں ، جس کے
باعث ملک کی روز افزوں سیاسی بیداری کے باوجود مسلمان آزادی
کی جدوجہد میں دوسرے حریت پسند فرقوں سے بہت پیچھے رہے جا رہے
تھے ۔ اس وقت ایسے ہی ایک اخبار کی ضرورت تھی ، جو آہنی عزم ، بے پناہ
قوت ارادی ، اور ایک زبردست جذبۂ حریت کے ساتھ فرقہ پرستی کے سیلاب
کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ۔ اور برطانوی حکمت عملیوں اور ریشہ دوانیوں ،
کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیتا ۔ اور اس کے ساتھ ہی ساری قوم کو بلا امتیاز
مذہب و ملت اتحاد اور اتفاق کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی جدوجہد کرتا

جن اصحاب کے ہاتھوں اس قوم پرور اخبار کا اجراء ہوا تھا ، انہیں
مواقعات کا کما حقہٗ احساس تھا ، جو اس کی راہ میں حائل ہونے
والے تھے ، وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ جس وادی پُرخار کو انہوں نے
اختیار کیا ہے ۔ اس کو طے کرنے میں انہیں کتنی دقتیں اور صعوبتیں پیش ،
آئیں گی ۔ مگر انہوں نے اس کی قطعاً پروا نہ کی ۔ اور بڑی جرأت اور مردانگی
کے ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا ، اور جب ایک مرتبہ وہ آگے بڑھا تو پیچھے
بسپے ہٹتا ہی گیا ۔ اور کوئی طاقت بھی اس کو نہ روک سکی ، اور اس طرح
ایک نئی سیاسی فکر ، ایک انوکھا سیاسی تصور اور ایک جدید سیاسی نظریہ
مسلمانوں کے ناآشنائے حقیقت اور گمراہ ذہنوں میں جاگزیں ہونے
لگا ۔ یہاں تک کہ اس نے ایک حیرت انگیز ذہنی انقلاب کی صورت اختیار
کر لی ۔ مسلمانان ہند چند گرگِ تن اور پُرکار ہستیوں کے اشاروں پر چل رہے
تھے ، جن کا مقصد ذاتی برتری اور جاہ طلبی کے سوا کچھ نہیں تھا ۔ مسلمانوں کے
سود و زیاں کا انہیں کوئی احساس نہ تھا ۔ اور ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح
تباہی کی طرف ڈھکیل رہے تھے ، ایسے خود پسند مسلمانوں نے عام مسلمانوں ،
اور ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے مابین ایک وسیع خلیج حائل کر رکھی
تھی ۔ اور مسلم عوام اس افتراق انگیز پالیسی کے دوررس نتائج سے بالکل
بے خبر تھے ، ایسے وقت میں روزانہ ہند جیسے مخلص ، محب وطن ، قوم پرور ،
اور اتحاد پسند اخبار کی سخت ضرورت تھی ۔ جو اپنے آتشیں خیال ، اور زور
قلم سے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دیتا ، جمی ہوئی جہالت
کی کائی کو دور کر کے ان کے ذہنوں کو جلا دیتا ، جذبۂ اتحاد و عمل کی تخلیق
کرتا ۔ اور ان کو سچا قوم پرور بناتا ۔

اس بار گراں کو اس اخبار نے اپنی کم مائگی اور بے سر و سامانی کے
باوجود بڑی خوش اسلوبی ، عالی ہمتی سے اپنے سر لیا ۔

سیاسی پس منظر

ہندوستان کی ساٹھ سالہ تاریخ آزادی میں سنہ ۱۹۳۹ء بڑی اہمیت
رکھتا ہے ، اور اگر غور سے دیکھا جائے ، تو آزادی کے تصور کو عملی جامہ
پہنانے کا آغاز اسی سال سے ہوتا ہے ، اس سال ہندوستان نے ایک
نئی سیاسی کروٹ لی ۔ اس نے اپنی سیاسی بیداری کے پہلے دور میں آزادی
اور حب الوطنی کے جن خیالات کی پرورش عوام کے دل و دماغ میں کی تھی
اور ملک اور قوم کی خاطر جس طرح جانی اور مالی قربانیاں دینے کا جذبہ
ان کے اندر پیدا کیا تھا اس سال سے ان کی وسیع پیمانہ پر آزمائش کا وقت
آگیا ۔ اور جو تمنائیں دلوں میں مچل رہی تھیں ، نعرۂ آزادی بن کر لبوں
پر آگئیں ۔ یہاں تک کہ ان کی فلک شگاف آواز سے زمین و آسمان تھرا
اٹھے ۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جنم لینے والا یہ اخبار بھی ہندوستان کی تحریک آزادی کی
عملی جدوجہد کے اس دوسرے دور کا ایک سنگ میل بن کر سامنے آیا
اس کے دل میں بھی وہی تڑپ تھی ۔ لبوں پر وہی نعرہ تھا ۔ اور قلم اسی پیغام
کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچا رہا تھا ۔ جب سارا ہندوستان
برطانوی بدعملی کے باعث فرقہ پرستی اور اتحاد شکنی کے طوفان میں گھرا
ہوا تھا ۔ یہ بڑی بے خوفی کے ساتھ دوست و دشمن کو نغمۂ اتحاد
سناتا رہا ۔

اسی سال ۳۰ر اکتوبر کو وائسرائے ہند لارڈ اردن نے ایک معرکۃ
[illegible]ن کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو دوسری
ں کے ساتھ برابری کا درجہ دینے کو تیار ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں نے
اعلان کا خیر مقدم کیا۔ مگر چونکہ اس کی تہ میں بھی برطانوی ردعمل کارفرما
اس لئے اس نے فوراً ہی لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد
نے کا اعلان کر دیا۔ ہندوستانی رہنماؤں نے اس مجوزہ گول میز کانفرنس
شرکت کے لئے یہ شرطیں پیش کیں۔

(۱) ایک ایسی صلح کن پالیسی اختیار کی جائے، جو فضائے سیاست
امن و سکون بحال کرے۔

(۲) سیاسی قیدیوں کو عام معافی دے دی جائے۔

(۳) ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو حق نمائندگی دیا جائے، مگر ہندوستان
سب سے بڑی سیاسی جماعت کو حق اکثریت حاصل ہو۔

اور اس کے ساتھ ہی ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے دوسری
جماعتوں کے ساتھ مل کر متفقہ طور پر اس کا فیصلہ کر لیا کہ غیر ملکی طوق غلامی
اتار کر پھینک دیا جائے، اس سے عوام کے اندر ایک نئی امنگ
نیا ولولہ اور ایک نیا جوش ابھر آیا۔ اس لئے کہ اب ان کے
منے ایک متعین مقصد اور ایک طے شدہ منزل تھی۔ اور اس کے
ل کی خاطر انہیں جدوجہد کرنا تھی۔ مگر برطانوی استعمار بھی اس سے
انہیں تھا، وہ اپنی چشم دور بیں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، وہ
کب برداشت کر سکتا تھا، کہ ہندوستانی قوم متحد و متفق ہو کر ایک
ہی مقصد اور طے شدہ منزل کی جانب قدم بڑھائے، چنانچہ اس نے
ان کی شرائط کو مسترد کر دیا۔ اور ایک غیر مصالحانہ طرز عمل اختیار کر لیا
وائسرائے اور دوسرے لیڈروں کے درمیان ایک کانفرنس
ہوئی، مگر بے سود، کیونکہ حکومت اپنے موقف پر سختی سے قائم رہی
نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس نے اپنے لاہور کے ہنگامہ خیز اجلاس میں
سوراج، یعنی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کا اعلان کر دیا اور گول
میز کانفرنس کی سختی سے مخالفت کی، نیز کانگریس کے ممبروں کو دستور

ساز اور قانون ساز اسمبلیوں میں شامل ہونے سے روک دیا اور جو ان اسمبلیوں
کے رکن تھے، ان سے کہا گیا کہ فی الفور مستعفی ہو جائیں، اور آل انڈیا کانگریس
کمیٹی کو اس کا اختیار دیا گیا کہ وہ سول نافرمانی شروع کر دے، اور جہاں کہیں
بھی مناسب سمجھے وہاں سے اس کا آغاز کرے۔

سول نافرمانی شروع کرنے سے قبل گاندھی جی نے لارڈ اردن کو پھر
سمجھوتہ کی پیشکش کی۔ اور ایک گیارہ نکاتی مطالبہ پیش کیا۔ جس میں نمک
کے ٹیکس کی منسوخی شرط اول تھی۔ مگر وائسرائے نے گاندھی جی کے اس
مطالبہ کو امن عامہ میں خلل ڈالنے والا قرار دے دیا۔ اس کے بعد اس
کے قبول و عدم قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اب کانگریس کے
پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اپنے طے کئے ہوئے
پروگرام کے مطابق سول نافرمانی شروع کر دے۔ چنانچہ "فتح یا موت"
کے زندہ جاوید پیام کے ساتھ گاندھی جی نے "ڈانڈی مارچ" کے لئے
اپنا قدم اٹھایا۔ اور گاؤں، شہر، دریا سب کو پار کرتے ہوئے اپنے
قابل اعتماد رضاکاروں کے ساتھ ڈانڈی پہونچ گئے۔ اور ۵ار اپریل
۱۹۳۰ء کو ایک مٹھی بھر نمک بنا کر قانون شکنی کی۔ ۴ر مئی ۱۹۳۰ء کو گاندھی
جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اس سے پورے ملک میں ایک آگ سی لگ
گئی، اور تحریک بجائے دبنے کے اور بھی تیز ہو گئی۔ محبان وطن نے
جیل خانے بھر دیئے۔ رہنماؤں اور سرکاری افسروں نے بھی اس میں حصہ
لیا۔ اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش
کیا۔ حکومت نے تیرہ آرڈیننس جاری کئے۔ اور تشدد کے وہ تمام طریقے
اختیار کئے جو کوئی جابر حکومت کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ لاٹھی چارج
کیا۔ اور گولیاں چلائیں۔ پچپن ہزار افراد کو جیل خانوں میں ٹھونس دیا
ایک سو ایک افراد گولی کا نشانہ بنائے گئے چار سو تانس مجروح
ہوئے، مگر سول نافرمانی تحریک کو رکنا تھا نہ رکی۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران
تھی، کہ اتنے تشدد کے بعد بھی تحریک زوروں پر ہے، اور عوام میں زیادہ
سے زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ ایک انگریز نامہ نگار نے مہاتما گاندھی
سے یرودا میں ملاقات کی، اور اپنے تاثرات کو ان لفظوں میں لکھا'

"کیا حکومت ان (مہاتما گاندھی) سے اب بھی صلح کرنے کو تیار نہیں ۔ حالات کو اب بھی سدھارا جا سکتا ہے یہ قیدی (مہاتما گاندھی) ہندستان کی حریت پرور روح کا پتلہ ہے"

حکومت نے جب یہ دیکھا کہ تحریک آزادی ان کے قابو سے باہر ہوتی جاتی ہے ، اور بدترین تشدد کا حربہ بھی کارآمد ثابت نہیں ہو رہا ہے تو محبان وطن کے والہانہ جوش عقیدت سے مرعوب ہو کر اس نے سمجھوتے کی جانب قدم بڑھایا ۔ مگر گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے یہ شرط لگائی ، کہ جب تک ہندستان کو مکمل خود اختیاری نہ دی جائے سول نافرمانی کو بند نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے علاوہ دفاعی فوج کا محکمہ بھی ان کے سپرد کر دیا جائے ۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دئے جائیں اور وہ قوانین جن کے خلاف سول نافرمانی کی گئی ہے منسوخ کر دئے جائیں ، چونکہ برطانوی حکومت ابھی اس کے لئے تیار نہ تھی ۔ اور اس کے نزدیک یہ مطالبات ناقابل قبول تھے ، اس لئے سول نافرمانی کی تحریک بھی نہ رک سکی ۔ اور ان کے باعث اسے ایک نئی زندگی مل گئی

اس دوران میں جون ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن نے ان تمام واقعات سے متاثر ہو کر اپنی رپورٹ شائع کر دی ۔ جس میں اس نے ہندستان کے لئے صوبائی خود اختیاری کی سفارش کی ۔ مگر مرکزی حکومت کی قانون ساز اسمبلی کو کوئی اختیارات نہ دیئے ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک اور قوم نے اس ذلیل پیشکش کو اسی نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی کہ یہ مستحق تھی ۔ اس کے بعد ہی تاریخی نہرو رپورٹ وجود میں آئی ، جس میں ساری جماعتوں کے مشترکہ سمجھوتہ سے مطالبات ترتیب دیئے گئے تھے مگر اسے بھی قابل قبول نہ سمجھا گیا ۔

حکومت برطانیہ کو ان نازک حالات میں یہی چارہ کار نظر آیا کہ وہ موجودہ گول میز کانفرنس منعقد کرے ۔ تاکہ ہندستانیوں کی توجہ ادھر منعطف ہو جائے ۔ اور سول نافرمانی کی تحریک کمزور پڑ جائے ۔ چنانچہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو سینٹ جیمز میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس کی خبر سنتے ہی ہندستان بھر میں ہڑتال ہو گئی ۔ حکومت نے ہڑتالیوں پر لاٹھی چارج کیا ۔ اور گولیاں چلائیں ۔ مگر بے سود ، ملک ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح کھولتا رہا ۔ خاص کر کلکتہ میں ایک زبردست جلوس احتجاجی قوانین کی خلاف ورزی میں نکالا گیا ۔ جس پر حکومت نے لاٹھی چارج کیا ۔ گولیاں چلائیں ، اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کیا ۔ مگر سول نافرمانی نہ رکی اور بنگال سول نافرمانی کونسل کی سرکردگی میں سیکرٹریٹ میں مظاہرہ کیا گیا کلکتہ کارپوریشن کی میٹنگ ملتوی کی گئی ، اور اس میں اس گول میز کانفرنس کے خلاف ایک معرکۃ الآرا ، تجویز پاس ہوئی ۔ یہاں تک کہ برطانیہ کی یہ چال ناکام ہوئی ۔ اور دستور کے متعلق کوئی فیصلہ گول میز کانفرنس میں نہ ہو سکا ۔ مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکاتی مطالبہ نے اس کانفرنس کی فضا کو اور بھی خراب کر دیا ۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ مجبور ہو گئی ، کہ تشدد کی پالیسی کو ترک کر کے مصالحانہ طریقہ اختیار کرے ، چنانچہ اس نے کانگریس کی جانب دست تعاون بڑھایا ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے تمام ممبروں کو اس نے رہا کر دیا ۔ اور کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دینے کے احکام واپس لے لئے ۔ یہ ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کی بات ہے رہا ہوتے ہی سب رہنما پنڈت موتی لال نہرو کے پاس پہونچے ، جو اس وقت بستر مرگ پر تھے ۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی ۔ اور وہ ۶ فروری کو انتقال کر گئے ۔ ان کے انتقال کے بعد گاندھی جی دہلی گئے اور وہاں بڑی ردوقدح کے بعد ان میں اور لارڈ ارون میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے حکومت نے اپنے تمام آرڈی نینس واپس لے لئے اور کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک کو روک دیا اور اس طرح ایک سال کی مسلسل ہنگامہ خیزی کے بعد ملک کے حالات پرسکون ہو گئے مگر یہ سکون عارضی تھا ۔ کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد لاہور کے مقدمہ بغاوت کے تمام ملزموں کو پھانسی دے دی گئی ۔ اور ملک کی فضا پھر مکدر ہو گئی

ان نازک حالات میں کانگریس کا کراچی سیشن منعقد ہوا ، جس میں نوخیز اور نوجوان کارکنوں نے کانگریس کی صلح کل پالیسی کے خلاف زبردست احتجاج کیا ۔ یہاں تک کہ کانگریس کا وجود ہی خطرے میں

پڑگیا۔ اور یہ احتمال ہوگیا کہ اسے ختم ہی نہ کردیا جائے۔ مگر کانگریس کے تجربہ کار رہنماؤں نے بڑے تدبر سے کام لے کر اس مخالفت کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے کو "کسان صدر" کا خطاب دے کر کانگریس کو پہلا مرتبہ ایک عوامی جماعت کی صورت میں پیش کیا۔ اور عوام کے ذہنوں سے ان شبہات کو دور کیا۔ کہ کانگریس محض سرمایہ داروں کی جماعت ہے۔ کراچی سے واپس آکر کانگریس کے رہنماؤں نے اس معاہدے کے مطابق عملدرآمد شروع کیا۔ جو لارڈ اروِن اور گاندھی جی کے درمیان ہوا تھا۔ مگر حکام کی طرف سے اس کی کھلی خلاف ورزی ہونے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی، اور وائسرائے لارڈ اروِن میں پھر ایک ملاقات ہوئی۔ اور اس میں ان تمام امور کو زیر بحث لایا گیا۔ اس مرتبہ وائسرائے کا رویہ بہت نرم تھا۔ اس نے بردولی کی شکایات کی تحقیقات کے لئے مسٹر گارڈن کو مقرر کرکے یہ سمجھ لیا کہ اب گاندھی جی اور کانگریس اس کے قابو میں ہیں۔ چنانچہ اس نے دوسری گول میز کانفرنس کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ اور کانگریس کی شمولیت کے لئے راستہ ہموار بھی کرلیا۔

اس دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے شرکت کی۔ مگر اس کے خاتمہ پر وہ صدر کا شکریہ ادا کرکے اور صرف یہ الفاظ کہہ کر کہ ہمارے اور آپ کے راستے الگ الگ ہیں، واپس چلے آئے۔ ان کی واپسی پر حکومت نے اس عہد کو بالائے طاق رکھ دیا۔ جس کی بنا پر کانگریس نے گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا منظور کیا تھا۔ اس نے اب پھر ظلم و استبداد کے دیو کو چھوڑ دیا۔ اور بنگال اور یوپی میں آرڈی نینس جاری کر دیئے خدائی خدمت گاروں کو حکومت مشکوک نظروں سے تو دیکھتی ہی تھی اب اس نے خان عبدالغفار خاں، اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو بے گناہ قید کردیا۔ گاندھی جی نے ان بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر اس کی انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح حکومت سے سمجھوتہ ہوجائے، لیکن وائسرائے نے ان کی ایک نہ مانی۔ اور جس تشدد آمیز پالیسی کو حکومت نے مارچ ۱۹۳۱ء میں ملتوی کر دیا تھا۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۲ء کو اس نے پھر شروع کردیا۔ پنڈت نہرو، اور ڈاکٹر خان صاحب تو پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ گاندھی جی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو بھی گرفتار کر لیا گیا، اور کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اور ۳۱-۱۹۳۰ء کا خونیں ڈرامہ پہلے سے بھی زیادہ ہولناک شکل میں دہرایا جانے لگا۔

برطانوی حکومت کے ترکش میں ابھی ایک اور زبردست تیر باقی تھا' جو وہ ہندستان کی متحدہ قومیت کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے کے لئے پھینکنا چاہتا تھا۔ اور وہ کمیونل ایوارڈ تھا جس کی رو سے اقلیتوں کو الگ انتخاب کا حق دے دیا گیا، یہ ایسا تیر تھا جو متحدہ قومیت کے قلب پر جا لگا۔ برطانوی حکومت کا یہ خیال تھا کہ اس سے تحریک آزادی مردہ ہو جائے گی۔ اس طرح پھر کبھی زندہ نہ ہوسکے گی۔ لیکن گاندھی جی نے رخ بدلا۔ اور اکیس روز کا مرن برت رکھ کر ہریجن تحریک شروع کر دی۔ اگرچہ سول نافرمانی بند کردی گئی تھی، مگر پھر بھی گاندھی جی کو گرفتار کرکے ایک سال قید کی سزا دے دی گئی۔ ان کی سزایابی کے بعد تحریک آزادی نے اور زور پکڑا۔ اور مارچ ۱۹۳۳ء تک اس کی یہی حالت رہی۔ گاندھی جی نے پھر مرن برت رکھا۔ اور حکومت نے عاجز آکر انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

کانگریس جو سول نافرمانی اور عدم تعاون کے اصول پر عمل رہی تھی۔ اب اس نے صحیح سمجھ کر اپنی روش کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہونے والا تھا۔ اس لئے کانگریس کے سامنے یہ ایک اہم سوال تھا۔ دوسری طرف حکومت کے ظلم و تشدد میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی۔ آخر کار وہ اس فیصلہ پر پہنچے، کہ آئندہ تعاون کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ اور کانگریس کو عام انتخابات کی مہم میں حصہ لینا چاہئے۔ چنانچہ کانگریس نے اس کے مطابق عمل کیا اور گیارہ میں سے آٹھ وزارتوں پر وہ قابض ہوگئی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ جانے کے باعث جب برطانیہ نے زبردستی ہندستان کے عوام کی مرضی کے خلاف لڑائی میں شامل ہونے پر مجبور کیا تو کانگریسی وزارتوں نے بیک وقت استعفےٰ دے دیا، اور کانگریس نے حکومت سے ہر قسم کا تعلق منقطع کرلیا۔

کمیونل ایوارڈ کے باعث ملک میں پہلے ہی کافی سے زیادہ انتشار تھا برطانوی حکومت نے اس دوسری جنگ عظیم کی تائید اور امداد کے حق میں کچھ جماعتوں کی رائے حاصل کر لی۔ ان میں سے ہندو مہاسبھا، مسٹر ایم، این رائے کی ریڈیکل سوشلسٹ پارٹی اور مسلم لیگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کانگریس نے اس کے خلاف فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس سے باہمی اختلافات اور بھی وسیع ہو گئے، اور سنہ ۳۹ء میں برطانوی حکومت کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ کانگریس کے مطالبات اس وقت تک پورے نہیں کئے جا سکتے، جب تک ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں متحد نہ ہوں، اور اس سے پہلے کوئی دستور بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ یہی نہیں، بلکہ اس کی طرف سے اس کے علاوہ ایسی شرائط پیش کی گئیں، جن سے مسلم لیگ کے اس نظریہ کی تائید ہوتی تھی، کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے، ان حالات کو دیکھ کر کانگریس نے ستیہ گرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس طرح کہ برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں میں وہ مارچ تک ۱۹۴۲ء کے، اوائل تک حالات بدستور سازگار رہے، اس کے بعد اچانک بدل گئے، اور اس کی وجہ جاپان کی خلاف توقع پیشقدمی اور فتوحات تھیں۔ برطانیہ ان بدلے ہوئے حالات سے متاثر ہوا اور اس نے اپنی پالیسی کو بدلا جس کا نتیجہ کرپس مشن کی صورت میں ظاہر ہوا جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان آیا تھا، اور ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء تک ہندوستان میں رہا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں جو تجویزیں پیش کیں مگر ان میں سے کانگریس کے لئے کوئی بھی قابل قبول نہ تھی۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ ہندوستان کا جدید دستور جنگ کے خاتمہ کے بعد بنایا جائے۔ کانگریس نے ان تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ اور ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو برطانیہ کی دغل فصل کی پالیسی سے تنگ آکر گاندھی جی نے سائمن کمیشن کے ڈومی نین سٹیٹس کی تجویز کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی "ہندوستان چھوڑ دو۔" کا تاریخی نعرہ بلند کیا۔ جس سے سارے ملک میں ایک آگ لگ گئی حکومت نے بھی بے پردہ تشدد کی پالیسی پر جی کھول کر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ عوام یہ فیصلہ کر چکے تھے اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا، اس لئے حکومت کی پوری مشینری بھی حرکت میں آگئی، اور اس کے مظالم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۵۰ ریلوے اسٹیشن ۵۰۰ پوسٹ آفس جلائے اور لوٹ لئے گئے تھے، پولیس کے ایک سو پچاس تھانوں پر حملہ کیا گیا تھا۔ تیس پولیس والے اور افسران ہلاک ہوتے تھے۔ جہاں تک حکومت کے مظالم کا تعلق ہے سرکاری بیان کے ۹۰۰ بے بس شہری ہلاک ہوئے، اور گرفتاریوں کا تو کوئی حد و حساب نہیں اس کی تعداد ہزاروں تک پہونچی تھی۔ یہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا ہنگامہ خیز سال تھا۔ اور قوم نے بڑی پامردی سے اس کا مقابلہ کیا۔

حکومت برطانیہ یہ حالات دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور اس نے مناسب سمجھا کہ لارڈ ارون کو بدل دیا جائے چنانچہ ان کی جگہ لارڈ ویول وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ انہوں نے آتے ہی ہندوستان کو وہی اپدیش دینا شروع کیا، جو ان کے پیشرو لارڈ ارون دیتے رہے تھے، اور وہ اپدیش یہ تھا کہ ہندوستان کا ایک متحد قوم ہے۔ اس کو آزادی بھی متحدہ طور پر ملنی چاہئے، وہ کیوں اس امر پر زور دے رہے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر محمد علی جناح نے ایک نہایت ہی خطرناک مطالبہ پیش کر دیا تھا، اور وہ یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان چھوڑ دو، دوسرے لفظوں میں انہوں نے ایسا مطالبہ پیش کر دیا، جس سے برطانوی راج کو تقویت پہونچی تھی اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں زیادہ سختی کے ساتھ جکڑنے میں اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوتے تھے۔ شری راج گوپال اچاریہ جو کانگریس سے علیحدہ ہو چکے تھے، انہوں نے پاکستان کی بنا پر کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی تعاون کا ایک فارمولا پیش کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کانگریس کے اس مطالبہ کی تائید کرے، کہ ہندوستان کو خود مختاری دی جائے اور اس عبوری دور میں کانگریس کے ساتھ مل کر عارضی حکومتیں بنائے۔ اور جب جنگ ختم ہو گی مسلم اکثریت کے صوبوں میں استصواب رائے کے ذریعہ معلوم کر لیا جائے، کہ وہ علیحدہ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں یا نہیں، اور اگر علیحدہ حکومت قائم کرنے کے حق ہی میں فیصلہ ہوا تو اس صورت میں دفاع، مواصلات، اور بعض دوسرے ضروری محکموں کے بارے میں سمجھوتہ کر لیا جائے۔

گاندھی جی نے یہ فارمولا مسٹر محمد علی جناح کو بھیجا۔ مگر انہوں نے مسترد کر دیا اور اسی بات پر گاندھی جی اور مسٹر محمد علی جناح دونوں کی گفتگوئے مصالحت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تو لارڈ ویول نے ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو ایک پلان پیش کیا جو مختلف فرقوں کو نمائندگی پر مبنی تھا، کانگریس نے اسے مان لیا۔ مگر مسٹر محمد علی جناح نے اس بنا پر اس کو ماننے سے انکار کر دیا کہ پانچ مسلم ممبروں میں سے کانگریس نے دو کو نامزد کیا تھا۔ اس کے نزدیک کانگریس کو اس کا کوئی حق نہیں تھا، اور مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت تھی۔ اس اثنا میں برطانوی حکومت تبدیل ہوگئی، چرچل کی پارٹی کو شکست ہوئی اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آگئی۔

ادھر ہندوستان میں آزاد ہند فوج کے آفیسروں کے خلاف مقدمات کی سماعت شروع ہوگئی تھی۔ کانگریس نے ان کی پیروی میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی جس کی وجہ سے وہ عوام تو ایک طرف رہے ہندوستانی فوج میں بھی مقبول ہوگئی۔ یہ دیکھکر برطانوی حکومت کے دل میں ہندوستانی فوج کی وفاداری کے متعلق بھی شک پیدا ہوگیا۔ اور اس بنا پر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو اختیارات حکومت ہندوستان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ چنانچہ لارڈ ویول نے ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو اس کا اعلان کیا کہ ہندوستان میں پہلے عام انتخابات کئے جائیں گے، اور اس کے بعد دستور ساز اسمبلی بنائی جائے گی، اور ملک کی بڑی بڑی جماعتوں کی تائید سے ایگزیکٹو کونسل وجود میں لائی جائے گی۔ عام انتخاب ہوا اور کانگریس نے تمام غیر مسلم اکثریت کے صوبوں کی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد کی مسلم نشستوں میں سے بھی زیادہ تر اسی کے حصہ میں آئیں اور صوبجات متحدہ، صوبہ متوسط، بہار اور آسام کی کچھ مسلم نشستیں بھی اس کو ملیں۔ مسلم لیگ نے سوائے صوبہ سرحد مسلم اکثریت کے تمام صوبوں کی نشستوں پر قبضہ کر لیا اور کانگریس نے سوائے سندھ اور بنگال کے باقی تمام صوبوں میں خالص کانگریسی وزارتیں قائم کرلیں، پنجاب میں متحدہ وزارت بنائی گئی۔ جس میں کانگریس، اکالی سکھ اور یونینسٹ پارٹی پارٹی شامل تھی۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت نے اپنی پارلیمنٹ میں ایک اسپیشل مشن مقرر کرنے کا اعلان کر دیا، جو برطانوی کابینہ کے وزراء لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس، اور مسٹر اے، وی، الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔ ادھر لارڈ ویول نے ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ اس سلسلہ میں گفتگو شروع کر دی، تاکہ اسپیشل مشن کے آنے سے قبل وہ زمین ہموار کریں ۱۵ر مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں ایک تقریر کی، جس میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی کوئی اکثریت کی پیشقدمی کو ویٹو کے ذریعہ روک نہیں سکتی۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ مسلم لیگ کو جو پشت پناہی چرچل کی عہد حکومت میں حاصل تھی، وہ ختم ہوگئی۔ یہ مشن ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی پہونچا۔ یکم اپریل سے ۱۷ر اپریل تک نئی دہلی میں اس نے ہر مکتب خیال کے ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں۔ ۲۵ر اپریل کو نئی دہلی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین مصالحت کی گفتگوئیں شروع ہوئیں۔ جو شملہ میں ۱۲ر مئی تک جاری رہیں، دوسری شملہ کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبد الغفار خان اور سردار عبدالرب نشتر نے کی۔ چونکہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کسی قسم کی مصالحت میں ناکام رہیں، اس لئے مشن نے ۱۶ر مئی کو اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا اور وہ شرائط پیش کر دیں، جو ہندوستان کو اختیارات حکومت سونپنے کے لئے اس نے مقرر کی تھیں۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔ کہ ہندوستان کی ایک یونین ہوگی، اور امور خارجہ، دفاع اور مواصلات اسی سے متعلق ہوں گے۔ اور اہم فرقہ وارانہ مسائل کے فیصلہ کا جو آئینی طریق کار بتایا گیا، وہ یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں اس کا دارومدار ووٹوں کی اکثریت پر ہوگا۔ اس کے علاوہ صوبوں کو حکومت خود اختیاری دے دی اور ایک مرکزی دستور ساز اسمبلی بنانے کا بھی فیصلہ کیا اور جب تک یہ پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے ایک عبوری حکومت بنائی جائے۔

۱۴ر جون ۱۹۴۶ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے لارڈ ویول کو اس کی اطلاع دی کہ وہ اس فیصلہ پر اپنے زاویۂ نظر کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرینگے

اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ آئین سازی کے لئے مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرنے کو تیار ہے۔ مسلم لیگ کونسل نے بھی اگرچہ اس کو تسلیم کر لیا۔ مگر اس حد تک کہ ان کے پاکستان کا تصور اس سے برقرار رہے، اور اس کی بنیاد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس لئے اس نے مسلم اکثریت کے چھ صوبوں ہی کو اپنی نظر کے سامنے رکھا۔ دستور ساز اسمبلی کا الیکشن جولائی ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس میں ۲۱۰ جنرل نشستوں میں سے ایک سو ننانوے پر کانگریس قابض ہو گئی۔ چیف کمشنر کے صوبوں کی چار مخصوص نشستوں میں تین کانگریس کے حصہ میں آئیں۔ اور اس نے سکھوں کی ایک نشست اور مسلمانوں کی تین نشستوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ غرض دستور ساز اسمبلی کی کل ۲۹۶ نشستوں میں سے کانگریس کو ۲۱۱ حاصل ہوئیں، اور مسلم لیگ کو ۷۳ نشستیں۔ اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مسلم لیگ گھبرا گئی، اور دستور ساز اسمبلی میں اس کی کام یابی مشکوک ہو گئی۔ چنانچہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مشن کے مقررہ پروگرام سے دست بردار ہوتی ہے۔ اور پاکستان کے حصول کے لئے "راست اقدام" (ڈائرکٹ ایکشن) پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے "راست اقدام" (ڈائریکٹ ایکشن) کی ابتداء ۱۶ اگست کو کلکتہ، مشرقی بنگال اور پنجاب سے کی۔ اور اس فیصلہ کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا، کہ مسلم لیگ نے خون کی ندیوں اور آنسوؤں کی جھڑیوں کے درمیان ——— جو لاکھوں بے گناہ اور معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل و غارت کا نتیجہ تھیں ——— پاکستان حاصل کر لیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ جس کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مصالحت کی پھر کوشش کی، مگر بے سود۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں اس کا جب دوسرا اجلاس ہوا تو مسلم لیگ کے لئے نشستیں محفوظ کر دی گئیں۔ تاکہ اگر وہ چاہیں تو اسمبلی میں بیٹھ سکیں مگر بے کار۔ اس پر وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی نے دار العوام سے ایک بیان میں کہا کہ برطانوی حکومت اس کے لئے آمادہ ہے کہ ہندستان کی حکومت کے اختیارات جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہی ہندستان کے سپرد کر دے، اگر مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کرتی، تو برطانوی حکومت کو اس پر دوبارہ غور کرنا ہوگا۔ کہ وہ برطانوی ہند کے اختیارات معینہ مدت کے بعد کسی کے سپرد کرے، کیا وہ مجموعی حیثیت سے مرکزی حکومت کی کمان کسی کو سونپ دے یا موجودہ صوبائی حکومتوں کے کچھ حصوں کو علیحدہ علیحدہ یا ایسی صورت میں جو بہت معقول نظر آئے، اور ہندستانی عوام کے مفاد کے عین مطابق ہو۔

مسٹر اٹیلی کے اسی بیان سے ظاہر تھا کہ ان کا کیا منشا ہے، اور ان کے پہلے بیان سے کتنا مختلف ہے۔ برطانوی حکومت نے لارڈ ویول کو واپس بلا کر ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بطور وائسرائے بھیج دیا۔ مسٹر اٹیلی کے اس بیان سے مسلم لیگ کی جو حوصلہ افزائی ہوئی تھی، اس نے چار صوبوں میں "راست اقدام" (ڈائرکیٹ ایکشن) شروع کر دیا۔ بنگال میں پھر سے فساد شروع ہو گیا۔ آسام میں بھی کانگریس وزارت کو ختم کرنے کے لئے فسادات کرائے گئے۔ پنجاب یونینسٹ حکومت سے استعفا دلوانے میں وہ کامیاب ہو گئی، مگر کس طرح کام یاب ہوئی۔ یہ داستان بے حد دردناک اور الم انگیز ہے اور راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن) کے ہاتھوں جو تباہ کاریاں اور بربادیاں کلکتہ شہر میں ہوئی تھیں وہی وہاں بھی ہوئیں، رہا صوبہ سرحد، وہاں مسلم لیگ اپنے راست اقدام (ڈائرکیٹ ایکشن) میں کام یاب نہ ہو سکی۔

ناچار لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجبور ہو کر ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ایک بیان کے ذریعہ اس امر کی وضاحت کی، کہ اس کا علاج اب یہی رہ گیا ہے کہ ہندستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی بنگال، پنجاب اور آسام تینوں صوبوں کو بھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے منظور کر لیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے جولائی ۱۹۴۷ء میں "آزاد ہندستان ایکٹ" پاس کر دیا۔ اور اس کی رو سے ہندستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں وجود میں آگئیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دونوں مملکتوں میں "یوم آزادی" منایا گیا۔ اور اس دن برطانوی حکومت ہندستان کے جملہ حقوق سے دست بردار ہو گئی۔

اس کے بعد ہندستان اور پاکستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا مگر

ماضی کی تلخ اور ناگوار یادوں نے دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اطمینان سے زندگی گذارنے کا موقعہ نہ دیا ۔ اور وہ بھوت بن کران کا خون چوستی رہیں ہندستان کے فرقہ پرست الگ اور پاکستان کے فرقہ پرست الگ اپنے اپنے یہاں کی اقلیتوں سے ان کی یا ان کے دوسرے ہم مذہبوں کی حماقتوں کا بدلہ لینا فرض عین سمجھنے لگیں ۔ جب پانی حد سے گذر گیا، تو نہرو لیاقت پیکٹ وجود میں آیا ۔ اور دونوں ملکوں کے پریس نے بھی ہر ایک مملکت میں خوشگوار اور پُرامن فضا بحال کرنے کے لئے ایک مشترکہ ضابطۂ اخلاق بنایا جس کے احترام کا وعدہ دونوں حکومتوں نے کیا ۔ نہرو لیاقت پیکٹ اور پریس کے ضابطۂ اخلاق پر آج تک عمل کیا جا رہا ہے

اور مسلمان اس دور میں

ہندستان کے اس سیاسی پس منظر کی روشنی میں اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا کیا کردار رہا ۔ اور انہوں نے قومی جد وجہد میں کہاں تک حصہ لیا ۔ مسلمانوں کی تعداد ہندستان میں اس وقت نو کروڑ تھی ، اور آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں کے بعد ان کا نمبر دوسرا تھا ۔ اس لئے ان سے اس کی بجا توقع رکھی جا سکتی تھی ۔ مگر بدقسمتی سے جو حالات بعض مفاد پرست عناصر نے ملک میں پیدا کر دیئے تھے ، وہ ان توقعات کی راہ میں حائل ہوئے ، اور متحدہ قومیت کے جس تصور پر ہندستان کے شاندار مستقبل کی بنیاد رکھنا چاہیئے تھی ، وہ خواب پریشاں ہو کر رہ گیا ۔

یہ امر مسلمہ تھا کہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر کوئی پروگرام بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا تھا ۔ برطانوی حکومت کو بھی اس کا احساس تھا اور یہاں کے ہندوؤں کو بھی چنانچہ یہی رضامندی ایک ایسی چیز تھی ، جس کی آڑ میں مفاد پرست عناصر اپنی چالیں چل سکتے تھے ، اس وقت ہندستان میں سب سے بڑا مفاد پرست برطانیہ تھا ۔ اول تو وہ اس سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ اور جب کبھی وہ مجبور ہو جاتا تو مسلمانوں کی رضامندی کا سوال درمیان میں لے آتا اور اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے ، کہ وہ مسلمانوں کا بہت ہمدرد تھا ۔ اور اسی کے جذبہ کے تحت اسے ان کی خاطرداری منظور تھی ، بلکہ مسلمانوں کو وہ اپنا آلۂ کار سمجھتا تھا ، اور جب ضرورت پڑتی ، انہیں اپنے استعمال میں لاتا ۔ کبھی انہیں سیاسی میدان کا حریف بناتا ۔ اور کبھی مذہبی میدان کا ۔ غرض جہاں کہیں بھی اسے ضرورت پڑتی بے دریغ کام لیتا ۔ اگرچہ مسلمانانِ ہند کی ایک جماعت کے اندر ۱۸۵۷ء کے غدر ہی سے جذبۂ حریت پیدا ہو چکا تھا ۔ اور وہ اپنی حب الوطنی اور سرفروشی کا ثبوت کافی سے زیادہ دے چکی تھی ، مگر برطانوی حکومت کے جبر و تشدد نے ان کی سرگرمیوں کو کچل کر رکھ دیا ۔ جس کی وجہ سے ان کے زرّیں کارنامے قصۂ پارینہ ہو چکے تھے ۔ ان سے ہماری مراد اس وقت کے علمائے کرام اور مجاہدانِ اسلام ہیں جنہوں نے غیر ملکی تسلط کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی تھی ، بلکہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس کوشش میں اپنے جان و مال تک کی پرواہ نہ کی ۔ قید و بند کے مصائب کا تو ذکر ہی کیا اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں ، اور ہنستے ہوئے تختۂ دار پر چڑھ گئے ۔ ہندستان کی تاریخ آزادی کا وہ اوّلین باب تھا ۔

جب ۱۸۸۵ء میں کانگریس وجود میں آئی ، تو اس کے ۱۸ برس بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک جماعت بھی وجود میں آ گئی ۔ مگر مسلمانوں کی اس جماعت کے وجود میں آنے کا باعث کانگریس نہیں تھی ، بلکہ ایک طرف ہندو مہا سبھا تھی جس نے ۱۹۰۶ء میں مہاراجہ دربھنگہ کی زیرِ صدارت دہلی میں جنم لیا تھا ۔ اور دوسری طرف تقسیم بنگال تنسیخ تھا ۔ نواب سلیم اللہ خاں مرحوم نے سرکردہ مسلمانوں کے مشورہ سے ایک مراسلہ اس مقصد سے ۱۹۰۶ء میں جاری کیا تھا ۔ کہ مسلمانوں کو ایک سیاسی تنظیم کی جانب توجہ دلائی جائے ، چنانچہ بمقام ۳۰ ستمبر ۱۹۰۶ء کو ہندستان کے سرکردہ مسلمانوں کا اجتماع ہوا اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ۔ یہاں سے مسلمانانِ ہند کی سیاست کا نیا دور شروع ہوتا ہے ، جب کہ مسلمانوں کے لئے الگ حقوق کے مطالبے کئے جانے لگے ۔ اور علیحدگی پسندی کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۸ء تک ۲۲ سال ہندستان کے لئے بیحد

ہنگامہ خیز تھے۔ اس دوران میں بیسیوں تحریکات شروع ہوئیں اور ان میں سے اکثروں کا تعلق مسلمانان ہند سے تھا۔ مسلم لیگ جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، وہ علیحدگی پسندی کی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اور تمام مسلمانوں کا اسے اعتماد حاصل نہ ہوسکا۔ اس دور کے صرف چار سالوں کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک اس کے پلیٹ فارم پر ہمیں وہ تمام مسلم رہنما دکھائی دیتے ہیں جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کے علمبردار تھے اور جن کی کوششوں سے مسلم لیگ کی علیحدگی پسندی کی پالیسی کو خیرباد کہا گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت مسٹر محمد علی جناح نے کی تھی۔ اور اس میں کانگریسی لیڈر بکثرت موجود تھے۔ اس موقعہ پر ہندو مسلم اتحاد کا ایک سمجھوتہ ترتیب پایا۔ جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو اس مفید مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ جس کی ہندوستان کو ضرورت تھی۔ ۱۹۱۸ء کو مولانا محمد علی رح اس کے صدر منتخب ہوئے۔ چونکہ وہ اس وقت چھندواڑہ میں نظربند تھے، اور حکومت نے ان کو جلسہ میں شرکت کی اجازت نہیں دی تھی اس لئے کرسیٔ صدارت پر ان کی فوٹو آویزاں کردی گئی۔ اور ان کی جگہ ان کی والدہ جو ہندوستان بھر میں "بی اماں" کہلاتی تھیں۔ انہوں نے اپنا پیغام عمل پڑھا۔ اگلے سال ۱۹۱۹ء کا اجلاس بھی زیر صدارت مسٹر اے کے فضل الحق (وزیر اعظم بنگال) بمقام دہلی منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے صدر استقبالیہ کمیٹی ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ جن کا خطبہ صدارت حکومت نے ضبط کرلیا۔ اس جلسہ میں علمائے کرام نے بھی شرکت کی اور بڑی معرکۃ الآرا تقریریں ہوئیں۔ اس وقت مسلمانوں کے اہم مسائل خلافت، بیت المقدس، اسلامی سلطنتوں کی تقسیم، اور برطانیہ کی مسلم کش پالیسی تھی۔ ان سب کے بارے میں مسلم لیگ کے اس اجلاس میں قرار دادیں پاس کی گئیں۔ اور ایک قابل ذکر تجویز یہ تھی۔ کہ جنگ کے بعد عوام اپنی حسب خواہش نظام حکومت کا فیصلہ کریں۔ ۱۹۱۹ء ہندو مسلم اتحاد کی ایک ناقابل فراموش یادگار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستانیوں پر آفت پر آفت پر ٹوٹ رہی تھی۔ برطانوی حکومت کے ترکش میں ظلم و استبداد کے جتنے بھی تیر تھے، سب اس نے ایک ایک کرکے ختم کردیئے تھے۔ تشدد کے باعث ملک میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کے خلاف ہندو اور مسلم دونوں ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے تھے اور اتحاد کا پرچم دونوں کے سروں پر لہرا رہا تھا۔ ادھر مسلم ممالک پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، ادھر امرتسر جلیانوالا باغ میں برطانوی تہذیب و اخلاق کا جنازہ نکل رہا تھا، اور بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو گولیوں کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ ہندوستانیوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود رولٹ بل پاس کردیا گیا، اور مسلمانوں پر غداری کا الزام لگا دیا گیا۔ اسی دوران میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت حکیم اجمل خاں مرحوم بمقام امرتسر ہوا۔ مسلمان بے حد برہم تھے۔ نہایت ولولہ انگیز اور رقت انگیز تقریریں ہوئیں۔ اور برطانوی جبروتشدد اور اس کے مظالم کی سخت مذمت کی گئی۔ امرتسر کے حادثۂ کرب و بلا پر اظہار افسوس کیا گیا اور برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا۔ کہ وہ لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کو واپس بلائے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کا تیرہواں اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم بمقام آگرہ منعقد ہوا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد بہت زوروں پر تھا۔ اور مسلم لیگ اب وہ مسلم لیگ نہیں رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کے سٹیج پر حریت پسندوں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ اس کے اجلاسوں میں بھی وہی ریزولیوشن پاس ہورہے تھے، جو کانگریس کے اجلاسوں میں ہوتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے اس اجلاس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں حکومت سے ترک موالات کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ ۱۹۲۱ء کا سال مسلم لیگ کے زوال کا تھا۔ اس سال اس کا اجلاس زیر صدارت مولانا حسرت موہانی مرحوم بمقام احمد آباد منعقد ہوا جس میں کانگریس کے ممتاز رہنماؤں، گاندھی جی، وجے راگھو اچاریہ، مرزا پٹیل، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے شرکت کی تھی۔ مولانا محمد

موہانی نے بہت زوردار خطبہ پڑھا۔ اور اس میں یہ تجویز کی کہ لیگ کا نصب العین "کامل آزادی" ہونا چاہئے۔ مگر چونکہ برطانوی حکومت کی چال چل گئی تھی، اور مفاد پرست، اور خود غرض عنصر اس پر غالب آچکا تھا اس لئے مولانا کے خطبہ کے سوا کسی کارروائی میں جان نہ تھی۔ اس اجلاس میں سول نافرمانی اور دیگر اہم مسائل کے متعلق کوئی ریزولیوشن پاس نہ ہوا۔

۱۹۲۲ء میں برطانوی حکومت کی مخالفت بہت زوروں پر تھی، اور آزادی کا جوش و خروش اور ولولہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں اس حد تک پھیلا ہوا تھا۔ کہ وہ کسی ایسی تحریک یا جماعت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جو ان کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہ کرتی ہو مسلم لیگ کی قیادت بدل چکی تھی، اور سول نافرمانی کی تحریک کی حمایت میں قرار داد پاس نہ کرکے اس نے تمام حریت پسند مسلمانوں کی ہمدردیاں کھو دی تھیں ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں خلافت کمیٹی وجود میں آچکی تھی اور وہ عوامی جذبات کی ترجمان تھی۔ وہ تمام قوم پرور مسلمان جنھوں نے مسلم لیگ کو گذشتہ چار یا پانچ سال تک حیات نو بخشی تھی مسلم لیگ کے رجعت پسندانہ رویہ سے بیزار ہوکر خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم پر آگئے اور مسلمانوں کو اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی دعوت دی، ملک میں اس وقت ترک موالات، سول نافرمانی اور ہجرت کا دور دورہ تھا اور خلافت کمیٹی اس کی قیادت کر رہی تھی۔ اس لئے مسلم لیگ کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا کوئی جلسہ نہ ہوسکا۔ اور ۱۹۲۳ء میں مسٹر غلام محمد بھرگڑی کی صدارت میں جو جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ کورم کی کمی کے باعث منتظمین کو اسے ملتوی کرنا پڑا۔

۱۹۲۱ء میں جب خلافت اور ہجرت کا ہر طرف سیلاب تھا۔ اور پوری قوم بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا لحاظ سیاسی عقائد ایک ہی طرف رواں دواں تھی۔ تو برطانوی حکومت کے قصر استعمار میں ایک لرزہ آگیا۔ اور قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہے، مگر وہ بہت زمانہ سے مزاج شناس واقع ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے یہ سوچا کہ کسی طرح ہندو مسلم اتحاد پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے، کہ اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔ چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ ایک طرف فرقہ پرست ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کر دیں اور دوسری طرف مسلمان بھی اس کے مقابلہ میں باہر نکل آئے، اور وہ ہندو اور مسلمان جو کل تک برطانیہ کی مخالفت میں ایک تھے، آج ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے۔ یہ طوفان بے تمیزی ۱۹۲۶ء تک بپا رہا، اسی دوران میں ۱۹۲۶ء میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے یہ جانتے ہوئے، کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کتنے کشیدہ ہیں، اہل ہند کو یہ دعوت دی کہ وہ ہندوستان کے لئے کوئی مشترکہ آئین پیش کریں۔ کانگریس کے لیڈر اس چیلنج کا جواب دیئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے، اس وقت مسلم لیگ کے رہنماؤں نے بھی دانشمندی سے کام لیا، اور اس معاملہ میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوگئے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو مردہ مسلم لیگ میں کبھی جان نہیں آسکتی تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے آل پارٹیز یونٹی کانفرنس بلائی گئی۔ جس میں پنڈت موتی لال نہرو کی رپورٹ پیش ہوئی، مگر مسلم لیگ نے اس کے ساتھ اتفاق نہ کیا۔ اور اس مقصد سے دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی جس کی صدارت کے فرائض ہز ہائی نس سر آغا خاں نے انجام دیئے۔

مسٹر محمد علی جناح کسی مصلحت وقت کے پیش نظر مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۲۷ء کے اجلاس میں یہ بات متفقہ طور پر منظور کرا چکے تھے، کہ دونوں فرقوں کے مشترکہ انتخاب کی تجویز کو قبول کر لیا جائے، بشرطیکہ کانگریس مسلمانوں کو مرکز اور صوبے میں نشستوں کی ایک مقررہ تعداد دے۔ اب پھر اتحاد کی امید قوی ہوگئی تھی۔ مگر مشترکہ انتخاب کے مسئلہ پر مسلم لیگ کے حلقوں میں پھوٹ پڑ گئی، اس نفاق نے اہم صورت اختیار کر لی اور جب سائمن کمیشن آیا تو مسٹر جناح نے اس کی مخالفت کی، مگر سر شفیع کی قیادت میں کچھ خطاب یافتہ اور سرکار پرست مسلمان اس کی حمایت میں تھے، اس طرح ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ کے دو اجلاس علیحدہ علیحدہ منعقد ہوئے۔ ایک حمایت میں اور دوسرا مخالفت میں، کلکتہ کے اجلاس میں جو زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح ہوا تھا، اس میں مولانا

محمد علی نے بھی شرکت کی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا، کہ وہی اس کی روح رواں تھے۔ اور ان ہی کی کوششوں سے مخلوط انتخاب کی حمایت اور سائمن کمیشن کی مخالفت میں تجویزیں پاس ہوئی تھیں۔ اب کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی اتحاد و تعاون کے آثار قوی ہوگئے تھے۔ مگر مسلم لیگ کی اپنی اندرونی پھوٹ اس میں سد راہ ہوئی جس کی وجہ سے مسٹر جناح بددل ہوکر انگلستان چلے گئے۔ اور مسلم لیگ کی عنان سر محمد شفیع کے ہاتھوں میں رہی۔ مگر نیم مردہ حالت میں تھی۔ پانچ ماہ کے بعد مسٹر جناح پھر لندن سے واپس آگئے، اب ان کا زاویۂ نظر بالکل بدلا ہوا تھا۔ سر شفیع کی مسلم لیگ کے ساتھ انہوں نے سمجھوتہ کیا۔ اور ۱۹۲۹ء میں دہلی کی لیگ کانفرنس میں انہوں نے نئے مطالبات چودہ نکات کی صورت میں پیش کردیئے، جن میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے لئے الگ انتخاب ہوں گے۔ مسٹر جناح کی اس ذہنی تبدیلی سے قوم پرور مسلمانوں کا ایک طبقہ بہت بددل ہوا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سرکردگی میں اس نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد ڈال دی۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات یہ تھے،

(۱) ہندستان کا آئندہ دستور اساسی وفاقی شکل (فیڈریشن) میں ہونا چاہیئے۔ جس میں بقیہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں، اور مشترکہ معاملات کا کنٹرول مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہو۔

(۲) صوبوں کو مساوی کامل خود اختیاری حاصل ہو۔

(۳) ملک کی تمام مجالس قانون ساز کی تشکیل اس معین اصول پر ہو کہ اقلیتوں کو ہر صوبہ میں مؤثر، اور مناسب نیابت حاصل ہو لیکن کسی اکثریت کو گھٹا کر اقلیت یا مساوات کی پوزیشن تک نہ پہونچا دیا جائے۔

(۴) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

(۵) مختلف قوموں کی نیابت موجودہ جداگانہ انتخاب کے طریقہ پر ہو البتہ ہر قوم کو حق حاصل ہو، کہ اپنی خوشی سے اس سے دستبردار ہوسکے

(۶) مقامی صوبوں میں کوئی ایسی تقسیم نہ کی جائے جس کا اثر بنگال، پنجاب، اور صوبہ سرحد کی مسلم اکثریتوں پر پڑے۔

(۷) ہر قوم کے لئے مکمل مذہبی آزادی، یعنی سب قوموں کو ان کے عقیدہ، عبادت، رسوم، تبلیغ، اجتماع اور تنظیم کی آزادی کی گارنٹی دی جائے

(۸) کوئی بل یا ریزولیوشن، یا ان کا کوئی حصہ مجلس قانون ساز میں پیش یا پاس نہ کیا جائے، اگر متعلقہ قوم کے تین چوتھائی ممبر اس کو اپنے قومی مفاد کے لئے مضر سمجھیں۔

(۹) سندھ ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔

(۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مثل دیگر صوبوں کے اصلاحات جاری کی جائیں، اور کونسلیں مقرر کی جائیں۔

(۱۱) حکومت اور آئینی خود مختار اداروں کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو دیگر ہندستانیوں کے پہلو بہ پہلو صلاحیت کی ضروریات کے مطابق مناسب حصہ دیا جائے۔

(۱۲) اسلامی کلچر، تہذیب و تمدن، زبان و رسم الخط، مذہب، پرسنل لاز اور اسلامی اداروں کی حفاظت اور مسلم تعلیم و کلچر کی ترقی و حمایت کے لئے حکومت اور دوسرے خود مختار اداروں کی امدادی رقم سے مناسب حصہ ملنا چاہیئے۔

(۱۳) کسی کابینہ میں خواہ صوبائی ہو یا مرکزی، کم سے کم ایک تہائی مسلمان وزیر ہوں۔

(۱۴) ایک دستور اساسی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے، تاوقتیکہ اس کے اجزائے ترکیبی (صوبے اور ریاستیں) اسے تسلیم نہ کریں۔

۱۹۲۹ء میں مسلمانان ہند کے چھوٹے بڑے سب ملاکر دس ادارے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) مسلم لیگ (۲) مسلم کانفرنس جو کہ فرقہ پرستوں، سرکاری، خوشامدیوں اور خطاب یافتہ مسلمانوں کا ادارہ تھا۔ اور جس کے لیڈر سر فیروز خاں نون، سر آغا خاں، سر فضل حسین مرحوم، سر سہروردی مرحوم، سر محمد یعقوب مرحوم، سر عبدالقیوم مرحوم اور سر محمد یوسف ایسے حضرات تھے۔ یہ مسلم لیگ

بھی بالواسطہ تعلق رکھتا تھا۔ (۳) خلافت کمیٹی جو علی برادران (مولانا محمد علی
مولانا شوکت علی) کی سرکردگی میں قومی تحریکوں کا ساتھ دے رہی تھی،
گاندھی جی کے ساتھ عدم تعاون اور عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریکوں
میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لے رہی تھی، اور مسلمانوں کو کانگریس کے
زیادہ سے زیادہ قریب لانے میں کوشاں تھی۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے
وہ بھی ایک ایسا ادارہ تھا، جس نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے
اتحاد و اتفاق کا پرچار کیا۔ (۴) نیشنلسٹ مسلم پارٹی —— یہ پارٹی
مسلمانوں پر مشتمل تھی، جنھوں نے ہندستان کی آزادی کے حصول،
غلامی سے نجات پانے کی خاطر سب کچھ قربان کردینے کا فیصلہ
کیا تھا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں وہ مسلمانانِ ہند کو
اپنے دوسرے برادرانِ وطن کے ساتھ ایک ہی پلیٹ فارم پر لاکر
کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ (۵) جمعیۃ علمائے ہند، یہ اگرچہ علماء کی جماعت
تھی، مگر جذبۂ حریت سے سرشار، اور ملک کی جدوجہد آزادی
میں وہ ہندستان کی کسی جماعت سے بھی پیچھے نہ رہی۔ کانگریس کے
ساتھ بھی اور علیحدہ بھی وہ بڑے کارہائے نمایاں انجام دے رہی تھی۔

ان اداروں کے علاوہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا
مجلس احرار، آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ، افغان جرگہ وغیرہ ادارے
بھی تھے، جو آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ کو چھوڑ کر سب کے سب اصولی طور
نیشنلسٹ مسلم پارٹی اور خلافت کمیٹی کے ہم خیال، اور ہم نوا تھے، ان تمام
اداروں کے حالات اور اغراض و مقاصد کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت
واضح ہو جاتی ہے، کہ مسلمانان ہند کے باہمی افتراق اور اختلاف کا
باعث صرف یہی دو اصول تھے، ایک قوم پروری، اور دوسرا فرقہ پرستی
پہلے اصول کی حمایت میں مسلمانان ہند کی زیادہ تر جماعتیں تھیں صرف
مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس دو ادارے دوسرے اصول کے حامی تھے
اور وہ بھی اپنے مقاصد میں ناکام و نامراد۔ کبھی کبھی ہندو مہاسبھا،
فرقہ پرستی کے مظاہروں سے اس کو تقویت پہونچا دیتی تھی، ورنہ عملاً
ان دونوں اداروں میں کوئی جان نہ تھی۔ مسٹر جناح مسلم لیگ سے بیزار
ہو کر انگلستان میں وکالت کا پیشہ شروع کر چکے تھے، اور ایک ایسا
ادارہ جس کا نہ کوئی نصب العین ہو اور نہ کوئی منزل اور نہ کوئی قائد
اس کا جو حال ہوتا ہے، وہی مسلم لیگ کا تھا۔ مسٹر جناح کے چودہ
نکات بھی اس کے ساتھ ہی گلدستۂ طاق نسیاں ہو کر رہ گئے تھے
مسلم لیگ کی جگہ مسلم کانفرنس نے لے لی۔ اور اس کے پیش نظر بھی اگرچہ
مسٹر جناح کے وہی چودہ نکات تھے، مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا تھی
اور اسے اتنی بھی اہمیت نہ تھی، جتنی کہ مسلم لیگ کو تھی۔ اتنا ضرور ہے
کہ سرکار پرستی اور فرقہ واریت میں مسلم کانفرنس مسلم لیگ پر بھی گویا
سبقت لے گئی تھی۔ اور ہندو مہاسبھا کی طرح یہ بھی برطانوی حکمت
عملی کا زبردست آلۂ کار تھی۔ کانگریس اور قوم پرور مسلمانوں کی کوششوں
پر پانی پھیر رہی تھی۔ اور ملک کے اتحاد و اتفاق کے شیرازہ کو درہم
برہم کر رہی تھی۔

جب برطانیہ کی مزدور حکومت نے نومبر سنہ ۳۰ء میں پہلی گول میز
کانفرنس انگلستان میں بلائی، تو وہ بھی ناکام رہی۔ کیونکہ مسٹر
جناح اپنے چودہ نکات کے مطالبہ پر مصر رہے، جو کہ ہندستان
کے دوسرے نمائندے اسے ہندستان کی متحدہ قومیت کے تصور
پر ایک کاری ضرب سمجھتے تھے، اس لئے وہ نہ مانے، پہلی گول میز
کانفرنس کی ناکامی کے بعد دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا اجلاس
بمقام الہ آباد بلایا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی، انھوں نے
پہلی مرتبہ اس اجلاس میں پاکستان کا تصور دنیا کے سامنے رکھا
اور کہا کہ صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور کشمیر کو ملا کر مسلمانوں
کا ایک الگ فیڈریشن بنایا جائے۔ اس اجلاس میں مسٹر جناح کے
چودہ نکات کی بھی تائید کی گئی۔ یہ دیکھ کر کہ مسلم لیگ خود بھی گمراہ ہو
رہی ہے، اور مسلمانوں کو بھی گمراہ کر رہی ہے، اور اس کی اس
گمراہی کے باعث ہندستان کی تحریک آزادی کو نقصان عظیم پہنچنے
اور برطانوی حکومت کے پاؤں زیادہ مضبوطی سے جمنے کا اندیشہ
ہے۔ کلکتہ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی گئی۔ سوائے مسلم

کان فرنس کے تمام پارٹیوں نے شرکت کی۔ قوم پرور مسلمانوں کی کوشش سے اس میں آخر کار یہ طے پایا کہ ہر پارٹی کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنے نصب العین پر قائم رہے، مگر ہندستان کو آزاد کرانے کا جہاں تک تعلق ہے، اس کوشش میں جب متحد و متفق ہو جائیں، اور مسلمان دوسرے برادران وطن کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت تعاون کریں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے الہ آباد میں ایک اتحاد کان فرنس بلائی گئی۔ اور اس کے بعد لکھنؤ میں بھی اس کا ایک جلسہ بلایا گیا۔ مگر مسلم لیگ چونکہ اپنے بائیسویں اجلاس دسمبر ۱۹۳۱ء میں جو چودھری سر ظفر اللہ خاں کی صدارت میں بمقام دہلی بلایا گیا تھا، مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب' اور ایک تہائی نشستوں کا فیصلہ کر چکی تھی، اس لئے اتحاد کان فرنسیں ناکام رہیں۔

ملک کی آزادی، اور ہندستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے قائم کرنے کی کوشش میں مولانا محمد علی جوہر پہلی گول میز کانفرنس کے موقعہ پر اپنی جان قربان کر چکے تھے، اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی بھی اسی مسلک پر گامزن تھے، اور صف اول کے دوسرے مسلمان لیڈر ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا احمد حسین مدنی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا ابوالکلام آزاد، جناب رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر خان صاحب، اور سرخ پوش لیڈر عبدالغفار خان بھی اسی مؤقف پر بڑی سختی سے قائم تھے، برطانیہ نے یہ دیکھا کہ قوم پرور مسلمانوں کی سرگرمیاں آئے دن بڑھتی جا رہی ہیں، اور اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی، تو پھر قابو پانا مشکل ہوگا۔ تو اس نے بدنام زمانہ کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) کا اعلان کر دیا۔ اور ہندستان میں فرقہ واریت کو آئینی حیثیت دے دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ پرست خواہ وہ ہندو تھے، یا مسلمان ان سب کی بن آئی، اور سرکاری عہدوں اور بلند منصبوں کے حصول کی خاطر انہوں نے برطانیہ کے آگے اپنی جھولیاں پھیلا دیں، ان میں سے ہندو مہاسبھا اور مسلم کان فرنس سب سے آگے تھیں۔ اور انہوں نے مل کر کانگریسی اور مسلم قوم پروروں کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

جب مسلم کان فرنس نے دیکھا کہ کمیونل ایوارڈ مسٹر جناح کی چودہ نکات ہی پر مبنی ہے، اور اس میں انہی کی فتح ہوئی ہے، تو اس نے سر آغا خاں کو بیچ میں ڈال کر مسٹر جناح کو ہندستان آنے پر رضامند کر لیا۔ اور اس کے بعد مارچ ۱۹۳۴ء میں مسلم کان فرنس اور جناح کے اختلافات ختم ہو گئے۔ اور مسٹر جناح کو مستقل طور پر مسلم لیگ کا صدر چن لیا گیا۔ مسلم لیگ نے کمیونل ایوارڈ کو باقاعدہ طور پر مان لیا۔ مگر کانگریس اور مسلم قوم پروروں نے اس کی مخالفت کی۔ مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے اجازت لے کر فریقین میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

۱۹۳۳ء میں ایک شخص چودھری رحمت علی نے جو انگلستان میں رہتا تھا، پہلی مرتبہ ہندستان کے مسلمانوں کی اقلیت کو "ایک قوم" کی حیثیت دی، اور لفظ پاکستان گھڑا یعنی مسلمانان ہند کا ایک علیحدہ قومی وطن، جس کا تصور ڈاکٹر اقبال اس سے تین سال پہلے پیش کر چکے تھے۔ لفظ "پاکستان" میں ان کی مراد "پ" سے پنجاب' "ا" سے افغانی علاقہ، "ک" سے کشمیر، "س" سندھ' اور "تان" سے بلوچستان تھا۔ غرض انہوں نے ہندستان کے ان علاقوں کو ملا کر مسلمانوں کا ایک قومی وطن قرار دیا اور اس کا نام "پاکستان" رکھا۔ مسٹر جناح نے بعد میں اسی تخیل اور اسی نام کو اپنا لیا، اور اس کے سات سال بعد لاہور میں اسے مسلم لیگ کے اجلاس میں پیش کر کے منظور کر لیا۔

یہ تمام کوششیں جو شروع شروع میں مسلم لیگ کے نام سے مسٹر جناح نے کیں، بے اثر رہیں۔ کیونکہ ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جو الیکشن لڑا گیا، اس میں صرف ۴½ فیصد مسلمانوں کے ووٹ انہیں حاصل ہوئے، پنجاب میں ڈاکٹر عالم جیسے قوم پروروں کی کوششوں سے مسلم لیگ کے مقابلہ میں

سر سکندر حیات خاں مرحوم کی یونینسٹ پارٹی کو اور بنگال میں مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے قوم پرور مسلمانوں کی جدوجہد سے مسٹر اے ۔ کے فضل الحق کی پرجا پارٹی کو کامیابی ہوئی ، اور سارے ہندوستان میں بھی اسی کی جیت رہی ۔

جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو مسلمانانِ ہند کے لئے ایک نئے آزمائشی دور کا آغاز ہوا ۔ علی الخصوص قوم پرور مسلمانوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہوگئیں ۔ مولانا محمد علی ، ڈاکٹر انصاری ، حکیم اجمل خاں ایسے زعیم قوم پرور مسلمان ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے ۔ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ عظیم میں ڈھکیل دیا گیا تھا ۔ قوم پرور مسلمانوں نے کانگریس کا ساتھ دیتے ہوئے جنگ کا مقاطعہ کر دیا تھا ، مگر مسلم لیگ نے اس کی حمایت کا اعلان کیا ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے دوسرے باب کی رو سے فیڈریشن بنانے کی جو مراعات دے رکھی تھیں ، ان کو منسوخ کر دیا ۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو یہ قابل قبول نہیں ۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا مطالبہ کر دیا ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو ہندوستان سے الگ کر دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو ۔ مسٹر جناح کا یہ مطالبہ دو قومی نظریہ پر مبنی تھا ۔ اور قوم پرور مسلمان ایک قوم ، ایک ملک ، اور ایک حکومت کے قائل تھے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو رام گڑھ کے کانگریس سیشن کے لئے صدر منتخب کر لیا گیا ۔ جو اس کے بعد ۱۹۴۵ء تک مسلسل چھ سال کانگریس کے صدر رہے ، اور آزادی کی جدوجہد کے ان آخری اور ہنگامہ خیز سالوں میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کی کشتی کے وہی ناخدا تھے ۔ ہندو مہاسبھا نے بھی موقعہ کو غنیمت جانا ، اور مسلمانوں پر پھر بے پناہ مظالم توڑنا شروع کر دیئے ۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے بھی جوابی کارروائیاں شروع کر دیں ۔ ان دونوں کے ان باہمی تصادم کا اثر عام مسلمانوں پر بہت برا پڑا ۔ چونکہ کانگریس کو چار محاذ پر جنگ کرنا پڑی تھی ، ایک پاکستان کا مطالبہ ، دوسرے فیڈریشن کی تنسیخ کا مسئلہ ۔ تیسرے آزادی کی خاطر جدوجہد ، اور چوتھے جنگ کا مقاطعہ ۔ اس لئے وہ فرقہ واریت کے اس دو منہ والے اژدہا کا سر کچلنے کی جانب اس وقت پوری توجہ نہ دے سکی ، اور عام مسلمانوں کی کافی تعداد اس سے روگرداں ہوگئی ۔ مسلم لیگ جو اب تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں بہیں مار رہی تھی اس نے اپنا نصب العین پاکستان متعین کر لیا تھا ۔ جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں ایک اسلامی حکومت تھا ۔ عام مسلمانوں کے لئے یہ الفاظ کافی سے زیادہ خوش آئند اور دلکش تھے ، چنانچہ وہ اس نصب العین کی جانب زیادہ کھنچتے چلے گئے ۔ اور جس مسلم لیگ کو گذشتہ انتخابات میں ۴ ۱/۲ فیصد ووٹ بمشکل ملے تھے ، اب تبدیلی حالات نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی ، اور وہ طاقتور ہوگئی ۔ چنانچہ سنہ ۴۲ء میں جب کانگریس نے دوسری جنگ عظیم کا مقاطعہ کیا ، تو مسلم لیگ نے برطانیہ کو خوش کرنے کے لئے اس کا ساتھ نہ دیا ، اور نہ اپنے حاشیہ بردار مسلمانوں کو اس کی حمایت کرنے دی ۔ اور ۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے " ہندوستان چھوڑ دو " کا نعرہ لگایا تو اس نے اس کی بھی تائید نہ کی ، بلکہ جب محبانِ وطن اپنے سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے ، اور قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے ، تو مسلم لیگ وزارتیں سنبھالنے کی فکر میں تھی ، بالآخر ۱۹۴۶ء میں لارڈ ویول نے اپنے ترکش سے نکال کر ایک آخری تیر مارا ۔ اور بظاہر یہ کوشش شروع کی کہ ہندوستان کے قضیہ کا کوئی تصفیہ ہو جائے ، مگر اصل میں ان کا منشا کچھ اور ہی تھا ، وہ مسٹر جناح کی زبان سے کچھ سننا چاہتے تھے ، چنانچہ جو پلان انہوں نے پیش کیا تھا ، جب مسٹر جناح نے یہ کہہ کر کہ ـــــ " ہندوستان کو پہلے تقسیم کرو اور پھر چھوڑو " اُسے رد کر دیا تو لارڈ ویول کی تسکین ہوگئی ۔ مسٹر جناح کا یہ جواب ـــــ " ہندوستان چھوڑ دو " کے نعرہ کا تھا ۔

پاکستان کا لفظ اور اس کا تصور اب مسلمانانِ ہند کے لئے غیر مانوس نہیں رہا تھا۔ ہندو مہاسبھا کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت کے باعث یہ مسلمانوں کی اکثریت کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا تھا، اور بعض حلقوں میں اس کا اثر اس حد تک قبول کیا گیا، کہ اس کے حصول کو اسلام کا جزو لاینفک سمجھا جانے لگا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ انگلستان میں مسٹر چرچل کی حکومت کو شکست ہوئی، اور اس کی عنان مزدور حکومت نے سنبھال لی، تو لارڈ ویول کو لندن بلایا گیا۔ واپسی پر انہوں نے کانگریس کی مجلس عاملہ کے تمام ارکان کو رہا کر دیا۔ اور شملہ میں ایک کانفرنس بلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی از سرِ نو تشکیل کی جائے، مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی طرف سے ناموں کی ایک فہرست پیش کی، جس میں ملک کی تمام بڑی بڑی پارٹیوں کے نمائندوں کو لیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ تھی۔

کانگریسی ہندو : ۳

" مسلمان :- ۲

لیگی مسلمان :- ۳

اور دوسرے

مسٹر جناح سے بھی اپنی فہرست بھیجنے کے لئے کہا گیا تھا، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اس سنہری جال میں پھنسنا نہیں چاہتے۔"

اس ناکامی کے بعد جب حکومت برطانیہ نے لارڈ پیتھک لارنس کی سرکردگی میں کیبنٹ مشن بھیجا، جس نے اپنی رپورٹ میں تمام پارٹیوں کے نمائندوں کی نشستیں مخصوص کیں، اور عبوری حکومت کے قیام کی تجویز کی۔ مگر جب دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے نمائندے گئے، تو وہاں کانگریس کی زبردست اکثریت اور اس میں قوم پرور مسلمانوں کو دیکھ کر انہوں نے اسمبلی سے بائیکاٹ کر کے "ڈائریکٹ ایکشن" کا اعلان کر دیا۔ اور جس کی ابتدا بنگال سے کی گئی۔ اس لئے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ منعقدہ دہلی میں سوائے بنگال کے مسلم لیگی نمائندہ مسٹر حسین شہید سہروردی کے کسی نے بھی اپنے صوبہ میں "ڈائریکٹ ایکشن" کی ابتدا کرنے کا ذمہ نہیں لیا تھا۔ بنگال میں اس "ڈائریکٹ ایکشن" سے جو کشت و خون ہوا۔ اس کا ردِ عمل ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے بہار میں اس کا ردِ عمل ہوا، اور اس کے بعد بہار کا ردِ عمل نواکھالی اور پنجاب میں غرض ردِ عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اس جنون میں ایسی انسانیت سوز حرکتیں کی گئیں کہ تاریخ عالم کے کسی متمدن اور مہذب دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ چونکہ مسٹر جناح اس پر تُلے ہوئے تھے، کہ خواہ کچھ بھی ہو پاکستان لے کر چھوڑیں گے، اور اگر مقصد میں حصول کی خاطر انہیں نو کروڑ مسلمانوں کو بھی قربان کرنا پڑے، تو اس میں کوئی دریغ نہیں کریں گے، اس لئے ایک طرف قتل و غارت گری کو انہوں نے جائز قرار دے رکھا تھا۔ اور دوسری طرف اسمبلی کے دوسرے اجلاس میں شرکت نہ کر کے آئینی جنگ شروع کر رکھی تھی، اور تیسری طرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ان کی ملاقاتوں اور مذاکروں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور پاکستان کو وجود میں لانے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تو اختیاراتِ حکومت کی سپردگی کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ اس لئے ان دونوں صورتوں میں سے جو بھی ہوتی وہ اس کے مطابق عمل کرتے، اگر ہندوستان متحد رہتا، تو ان کا فرض یہی تھا، اور اگر اس کا بٹوارہ ضروری سمجھا جاتا تو ان کا فرض یہی تھا۔ باوجودیکہ کانگریس نے ہندوستان کے بٹوارہ اور پاکستان کے مطالبہ کو چار و ناچار مان لیا تھا، گاندھی جی اور قوم پرور مسلمان اس کے لئے تیار نہ تھے، اور انہوں نے آخر وقت تک اس کی مخالفت کی۔ مگر پھر بھی ہندوستان کا بٹوارہ ہو کر رہا۔ اور ۱۵ اگست کو مسٹر جناح کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ مگر وہ کیا پاکستان تھا جو وجود میں آیا۔ ایسا پاکستان جس کو قبول کرنے کے لئے مسٹر جناح کبھی تیار نہ تھے، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے صاف لفظوں میں انہوں

کہہ دیا تھا، کہ پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ کر کے وہ لولا لنگڑا پاکستان نہیں لیں گے، مگر آخر کار پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ کرا کے چھوڑا۔ اور لولے لنگڑے پاکستان پر رضامند ہو گئے۔

اس بٹوارہ کے جو خوفناک، اور تباہ کن نتائج نکلے، وہ غیر متوقعہ تھے۔ مسلمانوں کو ہندستان میں فرقہ پرستوں نے تختۂ مشق ستم بنایا اور مطالبۂ پاکستان کرنے والوں کا انتقام ان سے لیا اور ہندوؤں اور سکھوں سے پاکستان میں انتقام لیا گیا۔ غرض اس جوابی انتقام کے باعث انسان حیوان ہو گئے۔ اور ہندستان اور پاکستان دونوں میں بدظنی اور عداوت کا ایک زہریلا بیج بو دیا گیا۔

"روزانہ ہند" کا کردار

۱۹۲۹ء کے سیاسی پس منظر میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ "روزانہ ہند" کو اگر ایک قوم پرور جریدہ کی حیثیت سے کبھی بھی شائع ہونا تھا، تو یہ اس کے لئے بہترین موقعہ تھا۔ مسلم لیگ دم توڑ رہی تھی، خلافت کمیٹی بے اثر ہو چکی تھی۔ اور اس کے علاوہ جو بھی چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتیں تھیں" ان کا دائرہ عمل بالکل محدود تھا، رہے مسلمان، ان پر جمود کی حالت طاری تھی۔ اور ان کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس کے برعکس ملک میں چاروں طرف سیاسی بے دردی تھی۔ اور حصول آزادی کے جذبۂ بے پناہ سے ہر شخص سرشار نظر آتا تھا۔ اس کی سخت ضرورت تھی، کہ مسلمان بھی اپنی علیحدگی پسندی کی روش کو چھوڑ کر برادران وطن کے دوش بدوش چلتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو اپنے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ پندرہ سال پہلے مسلمانوں کے اندر زندگی کی ایک نئی روح پھونک چکے تھے، انہوں نے پھر مسلمانوں کی قیادت کے لئے قدم بڑھایا اور مسلمانوں کو اکٹھا کر کے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈال دی۔ روزانہ ہند جو ابھی وجود میں آیا ہی تھا، اس نے پہلے ہی اداریہ میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر ہندستان جد و جہد آزادی میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، تو اسے متحدہ قومیت کے اصول پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ علی الخصوص مسلمانوں کے لئے تو سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ ایک تو سیاسی طور پر بیدار ہوں، اور دوسرے علیحدگی پسندی کو ترک کر دیں۔ کیونکہ ہندو، سکھ، مسلمان، پارسی، بدھی وغیرہ سب بلا امتیاز مذہب و ملت اسی مادرِ ہند کے سپوت ہیں اور اس سے متمتع ہونے کا حق بھی سب کو مساوی پہونچتا ہے، نیز اس امر کا بھی اعلان کر دیا کہ یہ اخبار کسی خاص سیاسی جماعت کا ترجمان نہیں ہوگا، بلکہ عوام کا ہوگا۔ اور ملک اور قوم کے متحدہ مفاد کے لئے اس کے صفحات وقف ہوں گے۔

روزانہ ہند کے اجراء سے فرقہ پرستوں کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مگر عوام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چند روز کے اندر ہی انہیں اس کا احساس ہونے لگا، کہ یہ اُن کا اپنا اخبار ہے اس کی آزاد اور پُر مغز پالیسی نے قوم پرور مسلمانوں کے حلقے میں خاص طور پر اثر کیا۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور ملکی اور قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے ان میں نئی طاقت آگئی۔ یہ لوگ متحدہ قومیت کے داعی تھے۔ اور ان کے نزدیک ہندستان کی نجات اسی میں تھی، کہ سب متحد و متفق ہو کر مادرِ وطن کو آزاد کرائیں۔ اور ایک ہی جھنڈے تلے اکٹھے ہو جائیں۔

مسٹر جناح مسلم لیگ سے بیزار ہو کر انگلستان میں رہائش اختیار کر چکے تھے، ان کے بعد اگرچہ مسلم لیگ کی جگہ مسلم کانفرنس نے لے لی تھی۔ مگر پھر بھی ۱۹۳۰ء میں اس کا ایک اجلاس الہ آباد میں ڈاکٹر اقبال رحمۃ کی صدارت میں ہوا۔ اور اس میں سب سے پہلے پاکستان کا ایک دھندلا سا تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ روزانہ ہند پہلا اخبار تھا، جس نے اس تصور کو مضحکہ خیز اور ناقابلِ عمل ثابت کر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں جاگزیں نہ ہونے دیا۔ اور اس کے جواب میں ایک آزاد متحدہ ہندستان کا خوش آئیند اور قابلِ عمل تصور پیش کر دیا۔ اور اس نے اسی

موضوع پر متعدد اداریے لکھے، یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء میں اسی شہر کلکتہ میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی، اور الٰہ آباد اور لکھنؤ میں اس کے بعد اتحاد کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ان کانفرنسوں کے بلانے کا جو ارفع اور اعلیٰ مقصد تھا، اگرچہ فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والوں نے اس کی راہ میں قدم قدم پر روڑے اٹکائے، اور اس کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر اس اخبار نے بڑی دلیری سے ان کو دنداں شکن جواب دیئے۔ اور ان کی وطن دشمن چالوں تار و پود بکھیر دیا۔ برطانوی حکومت جو ہر وقت ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھی، اور جب کبھی اسے یہ دکھائی دیا کہ ہندستان کے باشندے ایک نقطۂ خیال پر جمع ہو رہے ہیں، اور ان کے درمیان سے بیگانگی اور مغائرت کے پردے اٹھنے والے ہیں، تو اس نے جھٹ اپنی پٹاری میں سے نفاق اور اختلاف کی چھچھوندر نکال کر چھوڑ دی مسٹر جناح کے چودہ نکات اس نے اسی مقصد سے اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انہی چودہ نکات کو لے کر اس نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح نہ صرف ہندستان کے مختلف فرقوں کے اندر منافرت کے جذبات کو ہوا دی۔ بلکہ قوم پرور اور فرقہ پرست مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔ روزانہ ہند نے کمیونل ایوارڈ کی سختی سے مخالفت کی اور اس کے ساتھ ہی برطانیہ کے ارادوں کو بے نقاب کر دیا اور جو خطرناک کھیل وہ سرزمین ہند پر کھیلنا چاہتا تھا، اس کی قلعی کھول دی مسلم کانفرنس کے اہل حل و عقد کو یہ بات بہت بُری لگی، چونکہ وہ سرکار پرست اور حکام رس تھے۔ اس لئے انہوں نے روزانہ ہند کے خلاف شکایات کر کے حکومت ہند کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

یہ کمیونل ایوارڈ ہندستانیوں کو ایک طرح کا چیلنج تھا، جسے روزانہ ہند نے منظور کر لیا۔ اور اس کی مخالفت کے لئے اس نے کمر باندھ لی۔ اور مسلم کانفرنس، اور ہندو مہاسبھا جنھوں نے کمیونل ایوارڈ کا خیر مقدم کیا تھا، ان کو اس نے غدار وطن قرار دیا اور ان پر لعنت بھیجی۔ مسلم کانفرنس ہو یا مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا دونوں کی اس کی نظر میں یکساں حیثیت تھی۔ الور کے مواتیوں کی "شورش اور بغاوت" کی آڑ لے کر جب ہندو مہاسبھا نے "الور ڈے" منانا چاہا تو روزنامہ ہند نے اپنے ایک اداریہ میں اس طرح رائے زنی کی :-

"ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر مونجے، اور ان کی مہاسبھا کی اس شکوہ و شکایت اور "الور ڈے" منانے سے اصلی غرض کیا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ الور کے نام سے ہندوؤں میں جوش پیدا کرے، فرقہ پرست مسلمان قدرتی طور پر جواب دیں گے، اور مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح یہ دونوں خود غرض، دشمن وطن اور جاسوسی پیشہ جماعتیں باہمی تعاون کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیں گے۔ اور بندگان خدا کی اس خون ریزی سے اپنا اُلو سیدھا کر لیں گے۔"

۱۴ر جنوری ۱۹۳۳ء

مسلمانوں کی اندرونی اصلاح پر روزانہ ہند نے اکثر زور دیا۔ اور ان کے اندر سچے مسلمان بننے کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایسے مسلمان جو دین اور دنیا دونوں میں باعزت اور باوقار ہوں اور ہندستان کی متحدہ قومیت میں اپنا مقام رکھتے ہوں اس کے نزدیک فرقہ پرستی اسلامی تعلیمات کے منافی تھی۔ اور آج بھی وہ اسی اصول پر قائم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندو فرقہ پرستی اور مسلمان فرقہ پرستی دونوں کے خلاف ان ۲۵ سال کے اندر مسلسل قلمی جہاد کرتا رہا جس کے باعث اسے نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا مگر اس نے حق و صداقت کی اس آواز کو بلند رکھا۔ فرقہ پرست اور رجعت پسند اس کے شروع ہی سے بانی دشمن ہیں اور انہوں نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ چنانچہ ابھی ۲۱

روجود میں آئے پانچ سال ہی ہوئے تھے، کہ انہوں نے اس کے لاف اشتہار چھپوائے، اور اس کے بائیکاٹ کا اعلان کیا، ہاکروں لالچ دے کر ان سے اسٹرائک کرائے۔ اور پرچہ فروخت بنے سے منع کیا۔ اس کے علاوہ حکومت وقت سے اس کی جاسوسی ا غرض ان تمام تدبیروں اور حیلوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ روزانہ ہند سی طرح بند ہو جائے، اور اس کی آواز عوام تک نہ پہونچ سکے یہ کے ادارتی نوٹ سے کے اقتباس سے ناظرین کرام اندازہ فرما سکتے ہیں :-

"واقعہ یہ ہے کہ اس اخبار کے مخالفین پہلے دن سے اپنا پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ کہ جس طرح بنے، اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ چنانچہ ہاکروں سے اسٹرائیک کرائی گئی ہاکروں کو پرچہ فروخت کرنے سے منع کیا گیا۔ ہاکروں کو لالچ بھی دیا گیا۔ اور دھمکایا بھی گیا۔ اس کے خلاف اشتہارات بھی تقسیم کرائے گئے، جلسے بھی کئے گئے، بائیکاٹ کا بار بار اعلان کیا گیا۔ اور حکومت سے جاسوسی بھی کی گئی۔ غرضیکہ تمام تدبیریں، اور اخبار کو نقصان پہونچانے اور اسی کو بند کرنے کی کی گئیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے تمام مکائد اور تمام سازشیں توڑ ڈالیں، اور کسی ایک کو بھی کامیاب ہونے نہ دیا۔ عام مسلمانوں نے اپنے اخبار کا خیر مقدم پورے جوش سے کیا۔"

۱۷ر فروری ۱۹۳۳ء

روزانہ ہند شروع ہی سے مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کی روش کا مخالف تھا۔ اور اس کے خطرناک اور تباہ کن نتائج سے پیشگی آگاہ کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں جب کلکتہ کارپوریشن کے انتخابات کا وقت آیا تو یہ طے پایا کہ مخلوط انتخاب ہو تو اس وقت ان مسلمانوں نے جو گذشتہ بیس برس سے علیحدگی پسندی کے اصول پر خود بھی تھے۔ اور مسلمانوں کو اس پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے روزانہ ہند نے للکار کر کہا تھا۔ کہ اگر تم میں رتی بھر بھی غیرت، اور خود داری ہے تو اس شجر ممنوعہ کے قریب بھی مت جاؤ۔ یہ کلکتہ کارپوریشن کا پہلا مخلوط انتخاب تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق روزانہ ہند نے اپنی ادارتی نوٹ میں لکھا تھا۔

"ہم شروع سے مخلوط انتخاب کے حامی ہیں، ہم نے اسے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے مفید سمجھا ہے۔ ہم مطمئن اور خوش ہیں۔ کہ کلکتہ کارپوریشن کا پہلا مخلوط انتخاب ہو رہا ہے۔ جو آئندہ کونسلوں کے لئے مخلوط انتخاب کا راستہ صاف کر دے گا۔ لیکن یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اپنی جہالت اور غفلت سے کہیں ان فوائد سے محروم نہ رہ جائیں، جو مخلوط انتخاب سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔"

۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء

ڈاکٹر سید محمود جو صوبہ بہار میں وزیر ترقیات تھے، اور اس وقت پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ روزانہ ہند کے مسلک کی انہوں نے ہمیشہ تائید کی۔ اور اس کی بے لاگ رائے اور تنقید کو سراہا۔ ۴ر مارچ ۱۹۳۳ء کو اپنے ایک مکتوب میں جو انہوں نے اڈیٹر کے نام لکھا تھا، رقمطراز ہیں۔

"اس اخبار نے گذشتہ سال جو اسلامی اور ملکی خدمات انجام دی ہیں، اس کا نہ صرف معترف ہوں، بلکہ بہت مداح ہوں۔ اس نے اپنی ایک جگہ بنا لی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی ایک خاص وقعت قائم ہو گئی ہے، اور اکثر لوگ اس کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس کے ساتھ میرا تعلق شروع ہی سے ہے، اس کے اجراء کے وقت بھی مجھ سے بارہا مشورہ کیا گیا۔ اور جو ناچیز خدمات میں انجام دے سکا میں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔"

روزانہ ہند نے نہ صرف مسلمانوں کو اس کی تلقین کی کہ وہ فرقہ واریت سے پرہیز کریں ۔ بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہندوؤں پر بھی بارہا کیا ۔ کہ وہ ایثار و قربانی سے کام لیں ۔ اور اکثریت کے زعم میں اقلیتوں کو پریشان نہ کریں ۔ چونکہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلم اکثریت تھے ۔ اسی لئے ہندوؤں کو صاف لفظوں میں اس نے آگاہ کیا ۔ کہ اگر وہ ایثار اور قربانی سے کام نہیں لیتے ، تو پھر مسلم اکثریت کے ان صوبوں میں مسلمانوں سے کیسے بہتر توقعات رکھ سکتے ہیں ؟ اسے اس کا اعتراف رہا کہ فرقہ پرستی صرف مسلمانوں کے اندر ہی نہیں ، بلکہ ہندوؤں میں بھی ہے ، چنانچہ ایک اداریہ میں اس نے لکھا :۔

"ہم بار بار اس حقیقت کا اعلان کر چکے ، اور اسے ناقابل تردید دلائل سے ثابت کر چکے ہیں ۔ کہ فرقہ وارانہ مسائل میں ایثار و قربانی کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہونا چاہیئے ، نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے ۔ کیونکہ ایثار کا مطالبہ ہمیشہ اس سے کیا جاتا ہے ، جس کے پاس ایثار کے بعد کچھ بچ رہے لیکن جو بالکل قلاش اور مفلس الید ہے اس سے ایثار کا مطالبہ نیک نیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ۔ مسلمانوں کے پاس رکھا ہی کیا ہے جو ایثار کریں ۔ صرف بنگال اور پنجاب میں برائے نام مسلم اکثریت ہے ، مگر ہندوؤں کی وطن پروری ملاحظہ ہو کہ وہ انہی صوبوں میں مسلمانوں سے ایثار کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔"

۱۵ / مارچ ۳۳ء

مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق پر روزانہ ہند اکثر زور دیتا رہا ۔ اور اس کے نزدیک یہی ایک صورت تھی جس پر عمل پیرا ہونے سے مسلمان ہندستان میں باعزت زندگی بسر کر سکتے تھے ۔ اور ہندوؤں سے بھی اپنے مطالبات منوا سکتے تھے ایک طرف اس وقت قوم پرور مسلمان تھے ، اور دوسری طرف مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ ، قوم پرور مسلمان اور ان کا پروگرام فرقہ پرستی سے بلند اور اتحاد و اتفاق کی بنیادوں پر تھا ۔ اور وہ ہر دو صورت اتحاد کو نیک کہتے تھے ۔ کلکتہ ، لکھنؤ ، الہ آباد ، جہاں کہیں بھی ان کو یہ نظر آتا تھا کہ اس نیک مقصد کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں یہ اڑ کر پہونچتے ، مگر اس کے برعکس مسلم کانفرنس ہو یا مسلم لیگ ان کا مقصد فرقہ پروری تھا ۔ اور اتحاد و اتفاق سے ان کو بُعد تھا نہ صرف ہندوؤں ، بلکہ قوم پرور مسلمانوں کے ساتھ مل کر چلنا بھی ان کو پسند نہیں تھا ۔ " اب کیا کرنا چاہیئے " کے عنوان سے جو اداریہ لکھا گیا تھا ، اس کا صرف آخری پیرا ملاحظہ ہو :۔

"آج اگر مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتیں باہم متحد و متفق ہو جائیں ، تو صرف یہی نہیں کہ ہندو ان کے تمام مطالبات منظور کر لیں گے ، بلکہ حکومت بھی ان کی قوت کے آگے جھک جائے گی ..... ہم اب بھی مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے لوگوں سے عرض کرتے ہیں کہ للّٰہ افتراق سے باز آؤ ۔ اور اپنے بھائیوں سے گلے مل جاؤ جبکہ وطن پرور مسلمان خود تمہارے تمام مطالبات منظور کر چکے ہیں ، تو کوئی وجہ نہیں کہ ملت کا شیرازہ اسطرح بکھر رہا ہے ، اور تم اتحادِ اسلامی میں داخل نہ ہو جاؤ ۔"

۲۴ / مارچ ۳۳ء

مسلمانانِ ہند کی زبوں حالی کو دیکھ کر روزانہ ہند کا دل بہت کڑھتا تھا ۔ اور اس کی یہ دلی تمنا رہی کہ کسی طرح ان کو زمین سے اٹھا کر عرش تک پہونچا دے ، اسی ایک مقصد کے لئے اس نے ہزار جتن کئے ۔ اور عمل کی مختلف راہیں ان کے سامنے کھول کر رکھ دیں ۔ نہ صرف یہ کہ سیاسی ، اور اقتصادی پہلوؤں میں انہیں کامران و بامراد دیکھنے کی اسے خواہش تھی ، بلکہ خالص دینی اور تعلیمی اعتبار سے بھی ، ان کو بلند مرتبہ دیکھنا چاہتی تھی ، اور ان موضوعات پر اکثر خامہ فرسائی کی ، یہاں تک کہ ان کو اپنے برادرانِ وطن کی مثالیں دے دے کر غیرت دلائی اور قوم اور وطن کا صحیح تصور

ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر جمہوریۂ ہند

شریمتی وجے لکشمی پنڈت صدر ادارۂ اقوام متحدہ

ان کے ذہنوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی، کیونکہ روزانہ ہند کے
سامنے یہی ایک زبردست رکاوٹ تھی، جو مسلمانان ہند کو قومی تحریکات
آزادانہ حصہ لینے سے باز رکھتی تھی۔ چنانچہ ۲۴ مئی ۱۹۳۳ء کی
میں اس نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا :-

"حیرت ہوتی ہے کہ خود اسی ہندوستان میں مسلمانوں
کی آنکھوں کے سامنے ہندو موجود ہیں اور روز بلند مقام
کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں۔ معمولی ہندو نہیں،
بلکہ گاندھی جی کے مرتبہ کے ہندو بھی۔ تمام ہندو قوم میں
ایک عجیب جوش پھیلا رہے ہیں، اور ہندوؤں کے اندر
ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دینے کا
جذبہ پیدا ہو رہا ہے، لیکن مسلمان یہ سب کچھ دیکھنے پر
بھی کچھ نہیں دیکھتے، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے سب
اپنے اپنے فائدے کی فکر میں ہیں، اور قوم کی خدمت
جذبہ بہت کم افراد کے دلوں میں ہے۔

مسلمانوں کو قوم و وطن کی راہ میں قربانیوں سے
روکنے والے ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ وطنیت ایک
مذہب ہے، جو یورپ کے الحاد نے تراشا ہے، اور یہ
مسلمانوں کو سب کچھ ثواب خداوندی کے لئے کرنا چاہئے
دوسری طرف عمل کی یہ صورت کہ ہمہ وقت حکومت کی
چوکھٹ پر پڑے ہیں، کہ کوئی خطاب یا نوکری مل جائے
خود بھی یہی کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو بھی یہی تعلیم دیتے
ہیں۔ یہ ہے حال وطنیت کا بت ڈھانے والوں کا
یہ ہے عمل "فرزندانِ توحید" کا۔"

۲۴ مئی ۱۹۳۳ء

گاندھی جی نے ۲۱ روز کا کامیاب برت رکھا، تو اپنے ایک
اداریہ میں روزانہ ہند نے ان کے ضبطِ نفس اور ان کی اس
قربانی کی تعریف میں لکھا تھا، کہ گاندھی جی اس میں فتحمند
رہے ہیں، علم طب پر بھی فتح حاصل کی، اور ڈاکٹروں کو بھی مبہوت
اور مغلوب کر دیا۔ اور ان کے اس برت کو جسم پر روح کی زبردست
فتح قرار دیا تھا۔ وہاں اسے مسلمانوں کی بے روح زندگی پر بھی بہت
افسوس ہوا۔ جو اپنی زبان سے اسلام، اسلام کہتے رہتے تھے
مگر اسلام کی حقیقی روح سے ان کے جسم عاری ہوتے ہیں، چنانچہ
اپنے ایک اداریہ میں جو دراصل گاندھی جی کی اس فتحمندی پر تھا
جو ۲۱ روز کا کامیاب برت رکھنے سے انہیں حاصل ہوئی تھی، یہ
مسلمانوں کو مخاطب کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا
ہے کہ روزانہ ہند کے دل میں مسلمانوں کے لئے کتنی تڑپ تھی۔

"یقیناً گاندھی جی کا یہ روزہ ہندوؤں میں بڑی
تبدیلی پیدا کر دے گا۔ اور ان کی جماعت چھوت
چھات کی لعنت سے بہت کچھ نجات پائے گی، گاندھی
جی کے اس ہیجان انگیز عمل نے درحقیقت ہندوؤں میں
ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اور اب ان کی ترقی کے
میدان میں رفتار اور بھی تیز ہو جائے گی۔ اس ذکر کے
ساتھ ہی بے اختیار مسلمانوں کا نام بھی زبان پر آ جاتا ہے
ایک ہی زمین پر ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں۔
ہندوؤں میں زبردست انقلاب جاری ہے، مگر
مسلمان ؟ ـــــــ تو افسوس اس طرح سوئے پڑے
ہیں کہ زندہ ہی نہیں معلوم ہوتے۔

"کس قدر شرم کا مقام ہے، کہ ہم اپنی آنکھوں سے
ہندوؤں کی ترقیاں دیکھ رہے ہیں، لیکن ہمارے
خون میں کوئی بھی گرمی نہیں پیدا ہوتی۔ ہم آج بھی ویسے
ہی بے حس ہیں، جیسے ہمیشہ سے چلے آتے ہیں بالکل
اپاہج بنے ہوئے ہیں۔ ہرگز کوئی اصلاح کرنا نہیں چاہتے
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے جادو کر دیا ہے اور ہم
جاگتے بھی سو رہے ہیں۔" (۲۱ مئی ۱۹۳۳ء)

روزانہ ہند کی جسارتِ تحریر کا یہ حال رہا ہے، کہ اس نے ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہا۔ اور حق و صداقت کے روشن اصول پر کاربند رہا۔ مذہبی ہو یا سیاسی، یا معاشرتی غرض جو مسئلہ بھی اس کے سامنے آیا، اس نے ایمانی جوش اور اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہوا، باوجودیکہ گاندھی جی کا عزت و احترام اس کی نظر میں بہت زیادہ تھا۔ اور ان کا بے حد مداح تھا۔ مگر جب انہوں نے چھ ماہ کے لئے سول نافرمانی کو ملتوی کر دیا، تو روزانہ ہند نے ان کے اس اقدام کو ناپسند کیا۔ اور اس پر مخالفانہ رائے زنی کی۔ اسی طرح پونا کانفرنس سے پہلے جب مولانا شوکت علیؒ نے اپنے ایک غیر دانشمندانہ بیان میں جب یہ رائے ظاہر کی تھی، کہ کانگریس کو چاہئے کہ وہ سول نافرمانی بالکل موقوف کر دے، تو روزانہ ہند کے ایک ادارتی نوٹ میں ان کی اس تجویز کی مخالفت کی گئی تھی۔

"ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا شوکت علیؒ نے پھر اپنی روش بدل دی ہے، اور اس مسلم کانفرنس کی ذہنیت پر آگئے ہیں، جس کے دلدل سے ابھی حال ہی میں نکلے تھے۔ یورپ اور امریکہ کے آزاد ملکوں میں طویل سیاحت بھی آپ کے دماغ کا تنقیہ نہ کر سکی اور واپسی کے بعد آپ نے ایک طرف والیانِ ریاست کی اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ اس ذہنیت کے ساتھ مولانا شوکت علیؒ سے فرقہ وارانہ تصفیہ کی گفت و شنید بالکل بے فائدہ ہوگی، کیونکہ وہ اپنی عقل سے کام لینے کی جگہ حکام کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ مولانا صاحب کو ہمارا یہ مخلصانہ مشورہ ہے، کہ وہ میدان سے ہٹ جائیں۔ کیونکہ اب ان میں کام کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔"

۹ر جون ۳۳ء

سر عبدالحلیم غزنوی نے اپنی سرکار پرستی کے جوش میں آکر لندن میں وزیر اعظم برطانیہ کے کیونل ایوارڈ کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں تمام مسلمانوں کو نہایت تاکید سے حکم دیا گیا ہے کہ ہر حال میں نہایت سچی اور وفادارانہ خدمت اپنے بادشاہ کی کرتے رہیں۔ اس مفسدانہ قرآنی تاویل اور اس دروغ بے فروغ کی قلعی روزانہ ہند نے اپنے ایک اداریہ میں کھول کر رکھ دی

"کیا اس جھوٹ سے بھی بڑھ کر کوئی جھوٹ اس زمین کے نیچے ممکن ہے۔ کیا اللہ کے مقابلہ میں اس جرأت سے بھی زیادہ جرأت کا تصور کیا جا سکتا ہے، کوئی ارذل ترین خوشامدی بھی کہہ نہیں سکتا کہ قرآن میں اس طرح کی کوئی بات موجود ہے جس کا مسٹر غزنوی نے دعوے کیا ہے، ہرگز ہرگز کوئی شخص کسی دور کی تاویل سے بھی یہ بات قرآن سے ثابت نہیں کر سکتا قرآن نے کس جگہ یہ حکم دیا ہے، کہ مسلمان اپنے "بادشاہ" کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں؟ قرآن نے کہیں کسی جگہ بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کا کبھی کوئی بادشاہ ہو سکتا ہے؟ اسلامی حکومت کا نظام جمہوری ہے اور قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو سکے، کہ مسلمان کسی کو اپنا بادشاہ بنا سکتے ہیں۔ بلکہ قرآن نے بادشاہ کی ہر جگہ مذمت کی ہے

"اگر مسٹر غزنوی نے یہی بات اپنی طرف سے کہی ہوتی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ ہر آدمی آزاد ہے اور جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے۔ مگر انہوں نے قرآن مجید میں تحریف کی ہے، اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ پر تہمت لگائی ہے، لہذا ہمارا اور ہر مسلمان کا دینی فرض

ہے کہ ان کے جھوٹ کی تردید کریں ۔ اور دنیا کو یہ بتادیں ، کہ قرآن مجید پر یہ اس شخص کی سراسر تہمت ہے ، اور بہت ہی شرمناک تہمت ۔

۹ مئی ۱۹۳۳ء

ہندستان میں ایک طرف تو آرڈی نینس پر آرڈی نینس جاری کئے جار ہے تھے ، اور دوسری طرف اصلاحات کے دلفریب کھلونوں سے یہاں کے باشندوں کے دلوں کو بہلایا جارہا تھا ۔ حالانکہ وہ اصلاحات برائے نام تھیں ۔ اور ان کی پیشکش کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندستانیوں کے اندر پھوٹ کا بیج بویا جائے ، اور ان کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا نہ ہونے دیا جائے ۔ اور جن ہندستانیوں کے ذہن قدرے بیدار بھی ہوتے تھے ، انہیں مفروضہ اصلاحات کی افیون سے پھر سُلا دیا جاتے ۔ چنانچہ نتیجہ وہی نکلا کہ مختلف جماعتیں آپس میں دست و گریباں ہونے لگیں ، اور ایک دوسرے کے مفاد کو پامال کرنے کی خاطر کربستہ ہوگئیں ۔ اور ہندستان کا متحدہ مفاد معرض خطر میں پڑ گیا ۔ اس صورت حالات پر بڑی سختی سے رائے زنی کرتے ہوئے روزانہ ہند کے ایک اداریہ میں یہ لکھا گیا

" ہندستان کے اکثر باشندے ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ یا کوئی اور ، سخت بے حیا اور خود غرض واقع ہوئے ہیں انگریز نے اپنے خوانِ نعمت پر سے ایک ہڈی پھینکی ، اور یہ لوگ کتوں کی طرح ایک دوسرے پر غرّانے اور دانت نکالنے لگے ، ابھی کچھ ملا نہیں ، اور یہاں جھگڑا شروع ہو گیا ۔ کہ اتنے حقوق ہم لیں گے ۔ ہندو ، مسلمان اور سکھ تینوں پرلے درجہ کے بے وقوف واقع ہوئے ہیں ، اگر ان میں ذرا بھی سمجھ ہوتی تو پہلے انگریزوں سے حقوق حاصل کرتے ۔ پھر اگر چاہتے ، تو باہم دل کھول کر لڑ لیتے مگر غیر سے نامرد ہیں ، لڑنا بھی چاہتے ہیں تو انگریزی سنگینوں کی حفاظت میں تاکہ زیادہ چوٹ لگنے نہ پائے ۔

" ایسی صورت میں اصلاحات کا نام بھی ہندستان کے حق میں مُضر ہے ۔ یہ کہیں بہتر ہے ، کہ تمام ہندو مسلمان سکھ نامردوں کو معلوم ہوجاتے ، کہ انگریزی حکومت نہ کوئی اصلاحات دینا چاہتی ہے ، نہ کوئی حقوق تاکہ ان بے غیرتوں کو نصیحت ہو ۔ اور یہ آپس میں لڑنا موقوف کرکے اپنے جائز انسانی حقوق حاصل کرنے کا ارادہ کریں ۔ "

۹ جولائی ۱۹۳۳ء

کانگریس کو روزانہ ہند اکثر یہ مشورہ دیا کہ وہ مزدوروں کو کسانوں کو اپنے دائرہ عمل میں لائے ، اور یہ وہ مشورہ تھا جو اس وقت دیا گیا ، جب کہ کسی کو اس کی جانب توجہ نہ تھی ، چونکہ ہندستان میں مزدوروں اور کسانوں کی تعداد ہمیشہ سے بکثرت رہی اور کسی تحریک کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار بھی انہی کے تعاون پر سمجھا گیا ۔ اس لئے اس کی جانب توجہ دلائی گئی ۔ اس موضوع پر اکثر اداراتی نوٹ لکھے گئے ، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس پر سرمایہ دار اور زمیندار چھائے ہوئے تھے ، اور ان سرمایہ داروں اور زمینداروں کو کانگریس کے ساتھ اتنی ہمدردی نہ تھی ، جتنی کہ اپنے اپنے مفاد کے ساتھ تھی ۔ اور جب ان کا مفاد پورا ہوجاتا : تو وہ اس سے الگ ہوجاتے ، اس سے تحریک آزادی کو نقصان پہنچتا تھا ۔ ایک طویل اداریہ کی آخری سطور ملاحظہ ہوں ۔

" کانگرس جس روز یہ اعلان کردے گی کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی جماعت بن گئی ہے ، اس روز اس کی طاقت بے پناہ ہو جائے گی ۔ حکومت بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہوگی ، اور تمام ہندستانی سرمایہ دار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے کانگرس کو یہ ناکامیاں صرف اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ مزدوروں

اور کسانوں کی قوت ساتھ نہیں ، یہ قوت نہایت عظیم الشان ہے ، مگر افسوس تنظیم نہیں ۔ اگر کانگریس اسے تنظیم کرلے تو سب کچھ کرسکتی ہے ۔"

۱۵ / جولائی ۳۴ء

ایک دوسرے مقام پر اسی حقیقت کا اعادہ کیا ہے ، اور ایک نئی بات جو اس سلسلہ میں کہی گئی ، وہ یہ تھی ، کہ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم سے فرقہ پرستی میں بھی کمی آجائے گی ، کیونکہ ان طبقوں میں فرقہ وارانہ خیالات ہوتے ہی نہیں ۔ اور یہ بلا امتیاز مذہب وملت اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں ؛ اور ان محنت مزدوری اور کھیتی باڑی کا دارومدار ہی باہمی اتحاد و تعاون پر ہوتا ہے ، ورنہ یہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے ۔

" ایک اور صرف ایک ہی پروگرام ہے ، اور وہ وہی ہے جسے ہم شروع سے برابر پیش کرتے آئے ہیں ، یعنی ہندستان کے مزدوروں ، کسانوں ، اور غریبوں کی تنظیم و تحریک

" ہندستان بے حد غریب ہو چکا ہے ، اور بے چارے مسلمان تو روٹیوں کو محتاج ہو رہے ہیں ۔ بھوکے آدمی کے دل پر سب سے زیادہ جو چیز اثر کرسکتی ہے ، وہ روٹی ہے ۔ بھوک کی شدت میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے اور صرف روٹی ہی کی دھن اسے ہوتی ہے ، فی الحال ساری دنیا میں جتنی تحریکیں چل رہی ہیں ، تمام کی تمام اقتصادی ہیں ۔ اور ہندستان میں کوئی تحریک کامیاب ہی نہیں ہو سکتی ، جو سراسر اقتصادی نہ ہو ۔

" مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں فرقہ پرستی داخل نہیں ہو سکتی ۔ مزدور اور کسان ہندو ہوں ، یا مسلمان ، یا سکھ یا اچھوت ۔ سب کا مفاد بالکل ایک ہے ۔ اور اس مفاد میں کسی کا فرقہ وارانہ خیال شامل ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ جس طرح تمام فرقوں کے سرمایہ داروں کا مفاد ایک ہے ، اسی طرح تمام فرقوں کے مزدوروں اور کسانوں کا مفاد بھی ایک ہی ہے "

---------- !

اس اخبار کی آزادانہ پالیسی پر اکثر لوگ اعتراضات کیا کرتے تھے ۔ دراصل اس میں ان ہی کا قصور ہوتا تھا ۔ کیونکہ وہ اپنے ہی مخصوص زاویۂ نظر سے اسے دیکھا کرتے ، اور جب کوئی بات ان کے زاویۂ نظر کے خلاف لکھی جاتی تو وہ بھڑک اٹھتے ۔ مگر کون ہے جو سب کو خوش رکھ سکے ۔ اور ہر ایک کی خواہشوں ، اور تمناؤں کو پورا کرسکے ۔ چونکہ عام طور پر ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی ، کہ اخبار کے وظائف کار کیا ہیں ، اس کی حدود کہاں تک ہیں اور اپنے مفوضہ فرائض ادا کرنے میں اسے کتنی وسعت نظر و فکر سے کام لینا پڑتا ہے ، اور آئے دن کے متنوع مسائل کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں اسے کتنی کاوش درکار ہوتی ہے ۔ اس لئے کوتاہ نظر اور کوتاہ اندیش لوگ اکثر غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں ۔ روزانہ ہند نے ایسے معترضین کے جوابات ہمیشہ بڑی جرأت اور بے باکی سے دیئے ایک معترض کو جواب دیتے ہوئے اس نے لکھا تھا ۔

" یہ اخبار دراصل بیدار کرنے والی ایک پکار ہے ، اور برابر یہی کوشش کرتا رہا ہے کہ کسی طرح ہندستانی عام طور پر اور مسلمان خاص طور پر بیدار ہو جائیں ۔ ہر اخبار قدرتی طور پر ایک لحاظ سے تجارت بھی ہے ، مگر روزانہ ہند کے کارکن محض تجارت کی غرض سے کبھی میدان میں نہیں اترے ہیں ۔ ان کے پیش نظر انسانیت کی خدمت ہے ۔ اور اگر اس خدمت کی پاداش میں یہ اخبار بند ہو جائے ، تو بھی اس کے کارکن ذرا متاسف نہ ہوں گے بلکہ خوش ہوں گے ، کہ اپنے اعلیٰ مقصد پر قربان ہو گئے "

" یہ غلط فہمی ہے کہ وہی اخبار کامیاب ہو سکتا ہے

جو پبلک کی خوشنودی کو پیش نظر رکھے، لیکن ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے، ہمیں بھی معلوم ہے کہ کوئی جماعت بھی روزانہ ہند کی مؤید نہیں ہے، اور سب کو کچھ نہ کچھ شکایت اس سے چلی آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں مسلم پبلک کی اس ذہنی بلندی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ کہ وہ اس اخبار کا شروع سے آج تک برابر گرمجوشی سے خیر مقدم کرتی رہی ہے۔"

۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

روزانہ ہند نے نہ صرف مسلمانان ہند کے معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ بلکہ مسلمانانِ عالم کا کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں تھا، جس کے ساتھ اس نے اظہار ہمدردی نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر سید محمود کو بھی اسی لئے اپنے ایک خط میں روزانہ ہند کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ خط صفحات ماسبق میں شائع کر دیا گیا ہے۔ شام ہو یا فلسطین، یا ترکی یا مصر، یا عراق، یا حجاز یا لبنان یا جزیرہ العرب غرض ان تمام اسلامی ممالک میں سے جب بھی کوئی وفد آتا تو اس کی آنکھیں فرش راہ ہوتیں۔ اور مسلمانانِ ہند کو ان کی امداد کے لئے اپیلیں کی جاتیں مگر اس سلسلہ میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کہ جہاں کہیں حق و صداقت کے خلاف کوئی بات ان وفود اور ان سے متعلقہ مسائل میں روزانہ ہند کو نظر آئی، اس نے اس کا اظہار بھی بڑی بے باکی سے کیا۔ مگر اصل مقصد کو نقصان پہونچانے کی کوئی حرکت اس سے کبھی سرزد نہ ہوئی۔ ۴ر اکتوبر ۳۳ء کے اداریے میں " فلسطین کو بچاؤ " کی آخری سطور میں اس نے لکھا :۔

" درحقیقت یہ داستان بہت طویل ہے، اور ایک مضمون میں اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اتنی تفصیل سے بھی مسلمان اندازہ کر سکتے ہیں، کہ فلسطین اور اس کے مقامات مقدسہ کس درجہ خطرے میں مبتلا ہو گئے ہیں ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی سلطنت برطانیہ یہودیوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کر رہی ہے، اور دوسری طرف یہودیوں کے قارونی خزانوں کے منہ کھلے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں فلسطین کا ہمیشہ کے لئے اسلام سے خالی ہو جانا یقینی ہے، لیکن اسے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر مسلمانانِ عالم خصوصاً مسلمانانِ ہند بچانا چاہیں۔"

اس کے بعد بھی روزانہ ہند میں متعدد اداریئے ——— " بیت المقدس ہاتھ سے جاتا ہے، اسے بچاؤ " " مسجدِ اقصیٰ کی جگہ یہودی ہیکلِ سلیمان بنانا چاہتے ہیں " وغیرہ عنوانات پر لکھے گئے، جس میں اسرائیلیوں کے بُرے عزائم کو بے نقاب کیا گیا۔

روزانہ ہند کی صاف گوئی اور بے باکی، اور اس کی قوم پروری آخر رنگ لائی۔ اور مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے کرتا دھرتا جو اس کی حق و صداقت کی آواز کو دبانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور حکومت نے اس اخبار سے، اور اس کے پریس سے پانچ، پانچ سو روپیہ کی الگ الگ دو ضمانتیں طلب کر لیں۔ اور ضمانت اس مضمون کی وجہ سے ہوئی جو کاونٹ طالسطائی کے نام سے بعنوان " تو قتل نہ کر " ۱۲ر نومبر ۳۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا تعلق ہندستان اور اس کی سیاسیات کے ساتھ دُور کا بھی نہیں تھا۔ مگر روزانہ ہند کو بند کرنے کے لئے تو ایک بہانہ کی تلاش تھی۔ چنانچہ وہ بہانہ نکال لیا گیا۔ مگر روزانہ ہند نے اس کی قطعاً پروا نہ کی۔ دوسرے خداوند دو عالم کو یہ منظور نہ تھا۔ کہ روزانہ ہند کی صدائے حق بند ہو جاتی۔ اس لئے مقررہ وقت کے اندر ہی ایک ہزار روپیہ کی رقم ضمانت داخل کرنے کا انتظام ہو گیا، اور اسے داخل کر دیا گیا۔ ۱۳ر دسمبر ۳۳ء کے اداریہ میں اس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا گیا۔

"ضمانت کے داخلہ کے بعد بہر حال اخبار کی زندگی فی الحال محفوظ ہوگئی ہے۔ لیکن ہمیں نہ اس زندگی پر کوئی غیر معمولی خوشی ہے۔ اور اگر ختم ہو جاتی، تو نہ اس کی موت پر غیر معمولی غم ہوتا۔ ہمارا پختہ یقین ہے کہ انسان اپنا فرض ادا کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، نہ کہ خوشی اور غم کھانے کے لئے اس اخبار کی زندگی پر بھی ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی موت پر بھی راضی برضائے الٰہی ہیں۔

وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں، جو یہ سمجھ کر اس اخبار کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں، کہ اس اخبار کو بند کرا کے وہ ہماری آواز بند کر سکتے ہیں اور ہمیں اپنے فرض سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے ایک ہزار اخبار بند ہو جائیں، تو بھی ہماری آواز برابر بلند ہوتی رہے گی، اور ہم کسی نہ کسی طرح اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔"

"ہمارے خاص مہربان" کے موضوع پر ایک دوسرے اداریہ میں پھر قارئین کرام کو خطاب کرتے ہوئے لکھا:-

"اسی قدر نہیں بلکہ روز ہمارے مضامین کے وہ حصے جو ہمارے مہربانوں کی نظر میں حکومت کے خلاف ہوں ترجمہ کئے جاتے اور حکومت میں بھیج دیئے جاتے تھے، اور اب تک بھیجے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اس فعل کا نام سوائے "جاسوسی" کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ بلکہ کچھ مدت ہوئی، ہم نے ایک انگریزی کتاب کے بارے میں ایک مراسلہ شائع کیا تھا جس میں اس کتاب کے ان حصوں پر اعتراض تھا جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی ہے۔ تو ہمارے مہربانوں کے ایک سرغنہ فوراً پولیس کے پاس دوڑ گئے، اور شکایت کر دی کہ یہ اخبار ہندو مسلم فساد کرانا چاہتا ہے

"کہاں تک بیان کیا جائے، مختصر یہ کہ ہماری بیخ کنی کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ہم نہایت ہی بے سرو سامان اور کمزور تھے۔ لیکن اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہمیشہ ہمارا پشت پناہ تھا۔ چنانچہ کوئی مخالفت بھی ہمیں نقصان نہ پہونچا سکی۔ حتیٰ کہ دو مرتبہ ہم سے ضمانتوں کا بھی مطالبہ کرایا گیا اور الحمد للہ ہم دونوں مرتبہ اس آزمائش سے صحیح وسالم نکل آئے۔"

۵ر جنوری ۱۹۳۲ء

لندن کی گول میز کانفرنسیں روزانہ ہند کے نزدیک ایک مضحکہ خیز تماشا تھیں۔ جن کا یہ اکثر ماتم کرتا رہا۔ اور اپنے سرشک خونیں بہاتا رہا۔ اس نے اپنے ان محبان وطن کے اس فعل کو عقلمندوں کی بے وقوفی قرار دیا جو بار بار اس میں شرکت کرنے کے لئے لندن جاتے تھے۔ اور واپس آنے کے بعد ایسی ایسی قلابازیاں کھاتے تھے کہ ہر سنجیدہ آدمی ہنس دینے پر مجبور ہوتا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جب پٹنہ والے اجلاس میں یہ دو اہم فیصلے کئے، کہ سول نافرمانی کی تحریک قطعی منسوخ کر دی جائے، اور مجالس قانون ساز کے لئے انتخاب لڑے جائیں اور ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ تو بدلے ہوئے حالات کے ماتحت روزانہ ہند نے بھی ان دونوں فیصلوں کے ساتھ اتفاق کیا۔ حالانکہ پہلے وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ مگر اتفاق کرتے ہوئے بھی اس نے کانگریس کو ان اندیشوں اور خطروں سے آگاہ کر دیا۔ جو ان فیصلوں پر عمل کرنے کی صورت میں رونما ہو سکتے تھے۔

"مجالس قانون ساز پر کانگریسیوں کے قبضہ سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں حکومت کانگریس کے سرمایہ دار عناصر سے جو اب تک کانگریس پر قابض ہیں سمجھوتہ کر لے اور اس طرح سرمایہ دار نظام کو اور بھی تقویت حاصل ہو جائے۔

"جس اندیشہ سے ہم نے اظہار کیا ہے، اسے اس

واقعہ سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ انتخابات لڑنے کے لئے کانگریس کمیٹی نے جو بورڈ بنایا ہے، اس کے اکثر ممبر سرمایہ دار ہیں، اور ان میں سے بعض کی نسبت یقین سے معلوم ہے کہ وہ اشتراکیت کے دشمن ہیں، اور یہ کہ وہ ہندستانیوں کی اشتراکی حکومت پر انگریزوں کی سرمایہ دارانہ حکومت کو ہمیشہ ترجیح دیں گے۔"

۲۴ مئی ۱۹۳۴ء

کانگریس اور گاندھی جی کے ساتھ اس اخبار کا گہرا لگاؤ تھا اور یہ ان کی حمایت میں تھا۔ بعضوں کا یہ خیال تھا کہ یہ اخبار کانگریس کے ہاتھوں بک چکا ہے، اور اسی کا حاشیہ بردار ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا۔ اسی نے کانگریس اور گاندھی جی دونوں کے طرز عمل پر اکثر نکتہ چینی کی اور ان کی ہر بات پر کبھی آمنا و صدقنا نہ کہا۔ ایک اداریہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھتا ہے:۔

"جو لوگ اس اخبار کا شروع سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم ہر اس جماعت اور ہر اس شخص کو پسند کرتے ہیں، جن کی نسبت یقین ہو کہ وہ آزادی کے لئے کوشاں ہے، عام اس سے کہ وہ کسی مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھے، عام اس سے کہ وہ ہندستانی ہو یا غیر ہندستانی مسلم ہو یا غیر مسلم۔

"گاندھی جی کی نسبت ہمیں یقین ہے، کہ وہ آزادی کے سچے طالب ہیں، نیک نفس ہیں، بلند اخلاق ہیں، بے ریا ہیں، غیر متعصب ہیں، غرض کہ بہترین آدمی ہیں، ایسے بہترین کہ زندہ آدمیوں میں ہمیں ان کی نظیر دکھائی نہیں دیتی۔

"ہم کانگریس کے حامی ہیں، کیونکہ وہ ہندستان کی آزادی چاہتی ہے، اور اس کے لئے قربانیاں کر رہی ہے۔ کبھی کبھی ہم اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے، کہ ہم اس کے مسلک اور مقصد میں تبدیلی چاہتے ہیں، اور وہ تبدیلی یہ کہ کانگریس، مزدوروں، کسانوں، اور غریبوں کی جماعت بن جائے۔"

مگر جب گاندھی جی کی رائے بھی مزدوروں، کسانوں، اور غریبوں کے بارے میں واضح نہیں ہوتی تھی، تو یہ اخبار ان سے بھی وضاحت طلب کرتا تھا۔ اور اشتراکیت اور سوشلزم کے بارے میں ان کی جو رائے تھی، اس سے اختلاف کرتا تھا۔ اور جب کانگریس نے بھی اپنی ورکنگ کمیٹی میں سوشلسٹ پارٹی کے بارے میں ایک تجویز پاس کی، تو روزانہ ہند نے اس کی مخالفت میں لکھا:۔

" یہ تجویز ورکنگ کمیٹی کے مرتبہ سے گری ہوئی ہے اور اس سے بہت سی غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے بلکہ ہمیں نہایت رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز سوشلسٹ پارٹی کے خلاف نہ صرف سرمایہ داروں کو اشتعال دلانے والی ہے، بلکہ حکومت کو بھی یہ دعوت دے رہی ہے، کہ وہ اس پارٹی کو اپنی قوت سے کچل ڈالے

" ہم یقین سے کہتے ہیں۔ کہ ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز بہت ہی بری ہے۔ اور اگر کانگریس نے اس پر عمل کیا تو خودکشی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ کانگریس کا دارو مدار صرف عوام ہی کی ہمدردی پر ہے۔ کہ انہیں برسر اقتدار لانے کے لئے وہ عملی جدوجہد کرے۔"

۲۲ جون ۱۹۳۴ء

اس اخبار نے کانگریس اور گاندھی جی کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا، کہ وہ سرمایہ داروں، اور زمینداروں کے چنگل میں نہ پھنسیں، اور ان کی سرپرستی سے بچے رہیں۔ چونکہ کانگریس کے اندر سرمایہ دار گھس آتے تھے۔ اور ان کو باہر نکالا آسان کام نہیں تھا۔ اس لئے گاندھی جی نے خود ہی کانگریس کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور علیحدگی اختیار

بھی کرلی۔ مگر اس سے پہلے انہوں نے کانگریس کے بمبئی کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کردی، کہ کانگریس کے جملہ اختیارات ورکنگ کمیٹی کو سونپ دیئے جائیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی توڑ دی جائے، اور کانگریس کے مختلف نمائندوں کی تعداد چھ ہزار سے گھٹا کر ایک ہزار کردی جائے۔ روزانہ ہند نے اپنے ۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء کے اداریہ میں اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے کانگریس پر سرمایہ داروں کا پورا پورا قبضہ ہوجائے گا۔ اور سوشلسٹ الگ ہوجائیں گے۔"

گاندھی جی نے نومبر سنہ ۱۹۳۴ء میں بدلے ہوئے حالات سے مجبور ہوکر ایک اور کروٹ لی۔ اور راستہ کو اختیار کیا۔ جس کے لئے روزانہ ہند میں شروع ہی سے لکھا جارہا تھا۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے اور مزدوروں کی بہبودی کی جانب توجہ دی۔ نالے کھودنے کی تجویز کی، اور گاؤں گاؤں پھر کر گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کا پرچار کرنے لگے، مگر یہ ان کا ذاتی فعل تھا۔ کانگریس کا بحیثیت جماعت اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے ان کو اس اقدام سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔

جہاں تک مسٹر محمد علی جناح کا تعلق ہے روزانہ ہند ان کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کا ہمیشہ معترف رہا۔ مگر سیاسی امور میں جب بھی انہوں نے کوئی غلط قدم اٹھایا، اس نے ان کی مخالفت کی اور جب صحیح قدم اٹھایا، ان کی موافقت کی۔ چونکہ مسٹر محمد علی جناح نے بعد میں مستقل طور پر ایک ایسا نادیۂ نظر اختیار کرلیا، جو متحدہ قومیت کے منافی تھا۔ اور روزانہ ہند متحدہ قومیت کا داعی تھا، اس لئے دونوں کے راستے الگ الگ ہوگئے، اور ان کے ایک ہونے کا امکان بھی نہ رہا۔ مگر روزانہ ہند اس کے باوجود فراخدلی سے کام لیتا رہا۔ چنانچہ ۷ر اپریل سنہ ۱۹۳۷ء کے اداریہ میں "مسٹر محمد علی جناح کی قیادت" کے عنوان سے ایک اداریہ میں ان کے بارے میں یہ رائے زنی کی۔

"مسٹر جناح کی قابلیت، دانشمندی، سیاسی تدبر اور مستقل مزاجی میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں وہ بحیثیت سیاسی مدبر کے خاص مقام رکھتے ہیں .. .. لیکن اس کے باوجود ہم یہ باور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، کہ وہ اپنی قیادت میں لیگ کو یا مسلمانوں کو کسی اولوالعزمانہ اقدام کے لئے آگے بڑھا سکتے ہیں۔ مسٹر جناح اعتدال پسند ہیں، اور ہم ہمیشہ یہی سمجھتے آئے ہیں۔ کہ اعتدال پسند جی حضوری سے بھی زیادہ ملک کے لئے فتنہ ہوتا ہے۔"

اس اخبار کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ اور اعتدال پسند نہ صرف فتنہ، بلکہ فتنۂ عظیم ثابت ہوئے۔ اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوکر رہا۔

جب حکومت برطانیہ نے ہندستان کے لئے اصلاحات کا اعلان کیا تو اس اخبار نے اس کی پوری رپورٹ کا خلاصہ اس عنوان سے کہ —— "سب کچھ تمہارا ہے، مگر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا" ۲۳ر نومبر سنہ ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ اور اس کی مخالفت میں مسلسل پانچ اداریئے لکھے، جن کا مفاد یہ تھا کہ یہ اصلاحات ہندستانیوں کو خوش حال بنانے کی بجائے قلاش کردیں گی۔ اور بجائے آزادی کی جانب لے جانے کے غلامی کی زنجیروں میں زیادہ کس کر جکڑ دیں گی۔ اصلاحات کے نام پر یہ ایک نئی چال چلی جارہی ہے۔ ان اصلاحات کو سوائے سرکار پرستوں کے سارے ہندستان نے مسترد کردیا تھا۔ اور سرکار پرستوں نے بھی اس طرح کہ پہلے دبی زبان میں مخالفت کی۔ اور پھر اسے قبول کرلیا روزانہ ہند کی ۲۴ر دسمبر کی اشاعت میں اس موضوع پر ایک اداریہ میں یوں لکھا گیا۔

"اس وقت رپورٹ کے بارے میں تین قسم کے خیالات

لوگ ظاہر کر رہے ہیں۔ ایک گروہ اسے قطعی طور پر مسترد کر رہا ہے، اور کہتا ہے کہ رپورٹ کی تجویزیں حد درجہ توہین آمیز اور مضر ہیں۔ لہٰذا انہیں بغیر کسی قید و شرط کے ٹھکرا دینا چاہئے یہ خیال وطن پرور جماعت ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں، جو کمال بے حیائی سے رپورٹ کی تائید کر رہے ہیں، اور صد درجہ بیہودہ دلیلوں سے اسے ٹھیک ثابت کر رہے ہیں، یہ لوگ ازلی ابدی جی حضوری ہیں۔ تیسری جماعت ان لوگوں کی ہے جنہیں سیاسی خچر کہنا چاہیئے۔ یہ لوگ نہ وطن پرور ہیں نہ اپنے آپ کو جی حضوریوں میں شامل کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنا نام لبرل، ماڈریٹ اور اعتدال پسند رکھ کر چھوڑ دے، جس طرح ان کا نام عجیب اور مسلک منافقانہ ہے اسی طرح رپورٹ کے بارے میں ان کا اعلان بھی حد درجہ گمراہ کن ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں، کہ واقعی رپورٹ بے حد خراب ہے، بے حد مضر ہے، بے حد توہین آمیز ہے، کسی حال میں بھی قابل قبول نہیں۔ مگر ہم "مسترد" کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے۔

جب فرقہ وارانہ سمجھوتے کی گفتگو جو مسٹر جناح اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے مابین ہو رہی تھی بے نتیجہ ختم ہو گئی۔ تو روزانہ ہند نے فرقہ پرستی کا علاج یہ بتایا تھا، کہ سب لوگ سوشلسٹ اصول کو تسلیم کر لیں۔ ان اصول کے تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ مذہبی عقائد کے اختلافات کی بنا پر جو باہمی کشمکش ہے، از خود ختم ہو جائے گی موجودہ فرقہ پرستی باقی رہے گی۔ بلکہ یہ ہو گا کہ تمام غریب اور مزدور پیشہ باشندے ایک صف میں کھڑے ہو جائیں گے، اور سرمایہ دار اور زمیندار باشندے دوسری صف میں۔ یہ علاج اس لئے بتایا گیا تھا۔ کہ سوشلسٹ اصول کا تعلق سراسر اقتصادیات سے ہے۔ اور ان اصول کی غرض و غایت یہ ہے کہ غریبوں اور مزدوروں کو خوشحال بنایا جائے۔

ملک کے فرقہ وارانہ اور دیگر حالات سے مایوس ہو کر جب گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری سیاسیات سے دست کش ہو گئے اور یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی، کہ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے بھی گوشہ نشین ہونے والے ہیں۔ تو روزانہ ہند کو اس کا بہت قلق ہوا۔ اور اس نے اس پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے لکھا:-

"ہم نہیں سمجھ سکتے، کہ سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کی یہ ہوا کیسے چل گئی ہے۔ اگر کسی آدمی کی تندرستی خراب ہو گئی ہے، اور قویٰ جواب دے چکے ہیں، تو بے شک اسے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ لیکن اگر یہ سبب نہیں ہے تو موجودہ حالات میں کسی ہندستانی کا اپنے ملک کی سیاسی خدمت سے الگ ہونا ہماری رائے میں پسندیدہ نہیں!

"موجودہ زمانہ ایک ایسا زمانہ ہے جس میں غداروں کی کثرت ہے۔ اور سچے قومی خادموں کی قلت، ایسے زمانے میں ہر ہندستانی، کا فرض ہے کہ میدان میں ڈٹا رہے۔ اور جو کچھ بھی اس کے بس میں ہو ملک کی نجات کے لئے کرتا رہے۔ اس زمانہ میں سچائی کا ایک بول بھی قیمتی ہے۔ اور اگر کوئی زبان اسے کہہ رہی ہو تو بیشک ملک کی خدمت کر رہی ہے۔"

۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۳۵ء

"سکھ خواتین سے سبق لو" کے عنوان سے اس اخبار نے ایک اداریہ لکھ کر مسلمانوں کو غیرت دلائی۔ اس واقعہ کا تعلق شریمتی امرت کور سے تھا۔ جو اس وقت مرکزی کابینہ میں وزیر صحت ہیں، جنہوں نے سکھ قوم کی باہمی پھوٹ اور نا اتفاقی سے متاثر ہو کر دیگر چالیس سکھ خواتین کے ساتھ مل کر یہ اعلان کیا تھا، کہ وہ اس کے خلاف بھوک ہڑتال کریں گی، اور جان دے دیں گی۔ تاوقتیکہ سکھ اپنے اندرونی اختلافات کو ختم نہیں کر دیں گے، اس اداریہ کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو:-

"مشہور سکھ خاتون امرت کور نے ایک ایسا اعلان کیا

ہے جس سے سنگ دل سے سنگدل آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے اعلان میں کہتی ہیں، کہ سکھوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ سکھ لیڈر آپس میں لڑ رہے ہیں اور قوم تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ لہذا چالیس سکھ عورتوں نے طے کیا ہے (جن میں خود موصوفہ بھی ہیں)، کہ وہ بھوکی رہیں گی یہاں تک کہ مر جائیں، یا سکھ اپنی روش بدل ڈالیں۔ اعلان میں بتایا گیا ہے، کہ یہ عورتیں گمنام جگہوں میں فاقہ کشی کریں گی، اور جب ان میں سے کوئی مر جائے گی، تو اس کی لاش سکھ قوم کے حوالے کر دی جائے گی

"سکھ خواتین نے بہت ہی دلیرانہ اقدام کرنے کا اعلان کیا ہے، اور اگر انہوں نے اپنا فیصلہ نافذ کیا، اور اس پر ثابت قدم رہیں، تو ہمیں یقین ہے، کہ سکھوں کی بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ اور ان کی زندگی دراز ہو جائے گی۔ کیونکہ جس جماعت کی عورتیں ایسی بے لوث قربانیاں دے سکتی ہیں وہ قوم مر نہیں سکتی۔ بلکہ اس کا ترقی و عظمت حاصل کرنا یقینی ہے۔ ضرورت ہے، کہ مسلمانوں میں بھی کچھ لوگوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو اصلاح حال کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان میں اتر آئے اور سب کو اپنی بے لاگ قربانیوں سے مجبور کر دے، کہ موجودہ ذلت اور ابتری سے نکل آئیں۔"

۲۲ مئی ۱۹۳۵ء

وائسرائے ہند نے الٰہ آباد میونسپلٹی کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے اپیل کی، کہ ہندستان کے مختلف فرقے آپس میں رواداری اور امن سے رہیں۔ روزانہ ہند نے وائسرائے ہند کی اس اپیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک مخلصانہ گذارش کی، اور وہ یہ تھی:۔

"ہندستان کے موجودہ فرقے صدیوں سے باہم میل ملاپ سے رہتے تھے۔ ان میں نہ عداوت تھی، نہ فساد ہوتے تھے، لیکن جب سے انگریزی تعلیم پھیلی، اور سیاسی حالات

بدلے فرقوں میں کشمکش بھی پیدا ہو گئی ہے اور جن اسباب نے فرقہ وارانہ کشمکش پیدا کی ہے، ان میں سے ایک بڑا سبب، بلکہ سب سے بڑا سبب جداگانہ انتخاب ہے، اگر اس طریق انتخاب کو حکومت نے رواج نہ دیا ہوتا، تو فرقوں میں اتنی گہری منافرت بھی پیدا نہ ہوتی۔ جداگانہ انتخاب وہی چند مسلمان چاہتے ہیں جو حکومت کے نوکر ہیں، یا حکومت سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں ان لوگوں کی ذاتی مصلحت اس میں ہے، کہ جداگانہ انتخاب باقی رہے، تاکہ فرقہ پرستی سے پیدا ہونے والی شرمناک صورت حال سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مسلمانوں کے بھی لیڈر بنے رہیں، اور حکومت کے بھی ہوا خواہ۔"

۲۷ جولائی ۱۹۳۳ء

لندن کی اطلاعات سے جب یہ معلوم ہوا کہ وہاں کی پارلیمنٹ کے ممبروں، انگریزی اخباروں، اور سیاسی انجمنوں کے پاس ایک مینی فیسٹو ہندستان کے چند مسلمانوں کی جانب سے بھیجا گیا ہے جس میں "پاکستان" کو ہندستان سے الگ کر دینے کی ضرورت جتائی گئی تھی۔ اگرچہ اس کا تصور ڈاکٹر سر محمد اقبال الٰہ آباد کی مسلم کانفرنس میں پیش کر چکے تھے، اور لندن میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک طالب العلم چودھری رحمت علی نے یہ لفظ بھی اختراع کر لیا تھا، مگر مطالبہ کی صورت میں اس لفظ کا استعمال پہلی بار کیا گیا جس سے ہندستانی مسلمانوں کے کان کھڑے ہوئے اور روزانہ ہند نے اس پر اس طرح رائے زنی کی:۔

"پاکستان کی تحریک بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کر سکتی ہے۔ یہ ایک سبز باغ ہے جو بے وقوفوں کو با آسانی لبھا سکتا ہے، لیکن واقف کار جانتے ہیں، کہ یہ تحریک سراسر مفسدانہ ہے اور اس لئے شروع کی گئی ہے، کہ ایک طرف ہندستان ہمیشہ

کے لئے غلامی کی لعنت میں پڑا رہے ۔ اور دوسری طرف
اسلامی دنیا کی آزادی و زندگی کو خطرے لاحق رہیں ۔

" اس تحریک کا مقصد ان کے بیان کے بموجب یہ ہے
کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، آسام، اور بلوچستان
کو باقی ہندستان سے الگ کر کے ایک مستقل حکومت کے
ماتحت کر دیا جائے ۔ کھلی بات ہے، کہ اگر ان علاقوں کو
الگ کر کے " اسلامی " بنا دیا جائے گا ۔ تو باقی ہندستان
کے مسلمانوں پر ہندوؤں کو بے حد غصہ آئے گا ۔ اور وہ کوشش
کریں گے کہ ان کو نقصان پہنچائیں، اگرچہ ان علاقوں میں
مسلم اکثریت ہے، مگر ہندستان کے دوسرے علاقوں میں
تو اقلیت ہے ۔ پاکستان کے علیحدہ ہونے کے بعد یہ اقلیت
مجبور کر دی جائے گی، کہ یا تو ہندوؤں کے مظالم سہے یا ہندستان
سے ہجرت کر جائے ۔ اس طرح ہندستان میں اسلام کو
ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا ، اشاعت اسلام کا دروازہ
بند ہو جائے گا ۔ اور ہندستان ہمیشہ کے لئے ہندو ہی رہیگا

" پاکستان کی تحریک حد درجہ شرارت آمیز ہے مسلمانوں
کو چاہئے کہ اس قسم کی خطرناک تحریکوں سے ہشیار رہیں جو
بظاہر اسلام کے لئے مفید ہوتی ہیں، مگر حقیقت میں اسلام
کی جڑ کاٹنے والی ہیں ۔ "

۲۳ اگست ۱۹۳۵ء

نیا دستور اساسی جسے بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نام سے
موسوم کیا گیا، جب پارلیمنٹ نے اس پر شاہی مہر ثبت کر دی اور اسے
ہندستان کے سر زبردستی منڈھ دیا گیا۔ حالانکہ ہندستان کی کوئی
سیاسی پارٹی پسند نہیں کرتی تھی ۔ حتیٰ کہ غدار جماعتوں نے بھی بظاہر
اس کی مخالفت کی، مگر برطانوی حکومت نے اسے قانون بنا کر
ہی دم لیا ۔ اور اس کے نفاذ کا بھی فیصلہ کر دیا ، روزانہ ہند پہلے
بھی ان اصلاحات کی مخالفت کر چکا تھا ۔ مگر جب پارلیمنٹ نے
اسے پاس ہی کر دیا ، تو اس نے اسے ہندستان کی بدترین توہین
قرار دیا اور برطانوی دوعملی کی شاندار فتح ۔

پنڈت نہرو کی رفیقۂ حیات شریمتی کملا نہرو جرمنی میں زیر علاج تھیں جب
ان کی حالت اتنی نازک ہو گئی، کہ زندگی کی کوئی امید نہ رہی اور وہاں سے
تار آیا، تو وائسرائے ہند نے اس سے متاثر ہو کر پنڈت نہرو کی رہائی کا
حکم صادر فرما دیا ، مگر قید کی باقی مدت معاف نہ کی ، وائسرائے نے پنڈت نہرو
کی رہائی کا حکم اس لئے صادر کیا تھا، کہ وہ فوراً جرمنی جا سکیں ، روزانہ ہند
نے وائسرائے کو ان کے اس انسانی عمل پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھا ۔

" بدنصیب ہندستان کے لیڈروں میں سے شاید ہی کسی نے
اتنی قربانیاں کی ہوں جتنی کہ پنڈت نہرو اور ان کی بیوی نے
کی ہیں ۔ جواہرلال بہت امیر گھرانے میں پیدا ہوئے ، اور
شاہانہ تربیت پائی ۔ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کے شاہانہ
مزاج سے سب واقف ہیں ، پھر جواہرلال نہرو یورپ گئے اور
نہایت کامیابی سے بیرسٹری پاس کی ۔ خدا نے انہیں خاندانی
وجاہت، جسمانی حسن ، اعلیٰ اخلاق ، اعلیٰ تعلیم کے ساتھ بہترین
دماغ بھی بخشا ہے ، اگر وہ چاہتے ، تو اس وقت کسی بڑے
عہدہ پر مامور ہوتے ، اور عیش سے زندگی بسر کرتے ۔

" پنڈت جی کو اپنی بیوی سے عشق کے درجہ تک محبت ہے
اور وہ بھی ان پر دل و جان سے فدا ہیں ، پنڈت جی اگر چاہتے
تو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی محبوب بیوی سے علیحدہ نہ ہوتے لیکن
وہ وطن کی محبت تھی جو ان کی ذاتی محبت اور ذاتی خواہش
پر غالب آئی ۔"

روزانہ ہند کسانوں، مزدوروں، پیشہ وروں اور دستکاروں کا ہمیشہ سے
حامی رہا ۔ اور ان کے معاشرتی اور معاشی مسائل میں دلچسپی لیتا رہا ہے کلکتہ
ہندستان بھر کے بیڑی بنانے والوں کا بہت بڑا مرکز ہے ۔ آج بھی اس
کی اہمیت وہی ہے جو اس سے پہلے تھی ، مگر روزانہ ہند نے آج سے انیس
سال قبل سب سے پہلے ان کی حمایت میں آواز اٹھائی تھی اور انہیں مشورہ دیا

تھا کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں، اور آج ان کی جتنی بھی تنظیمیں ہیں روزانہ ہند کی اسی آواز کا نتیجہ ہیں :۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ خاص شہر کلکتہ میں ۸۰ ، اسی ہزار بیڑی بنانے والے موجود ہیں ۔ یہ تعداد بہت بڑی ہے ۔ اور بغیر مبالغہ کے کہا جا سکتا ہے کہ کلکتہ میں بیڑی بنانے والوں کی بہت بڑی جماعت ہے ، لیکن افسوس ہے کہ اس جماعت میں فی الحال کوئی طاقت نہیں ، بلکہ اسے جماعت کہنا ہی غلط ہے ۔ کیونکہ اس کی تنظیم مفقود ہے ۔ تعداد تو بہت زیادہ ہے ۔ مگر تنظیم اور شیرازہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کوئی وزن نہیں رکھتے

" اگر کلکتہ کے بیڑی والے اپنی تنظیم کر لیں ، تو بہت فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ، اور ۸۰ ہزار بیڑی والے اگر ایک آنہ ماہوار ہی چندہ دیں ، تو ہر مہینہ ۵۰۰۰ ۴ روپیہ جمع ہو جائے ، سال بھر میں یہ رقم باون ہزار روپیہ ہو جاتی ہے ، یہ رقم اتنی بڑی ہے ، کہ اس سے بیڑی کا کام کرنے والوں کے بچوں کا خاطر خواہ انتظام کیا جا سکتا ہے ، ان کی بیواؤں ، اور یتیموں کی خبر گیری کی جا سکتی ہے ۔ ہم تنظیم کے حامی ہیں ۔ اور چاہتے ہیں کہ ہر قسم کے دستکار اپنی اپنی جماعتیں قائم کر لیں ۔ تاکہ بعد میں یہ تمام جماعتیں متحد ہو کر ملک کے لئے مفید طاقت بن جائیں ، اور اس کی نجات کے کام میں بہترین مدد دے سکیں ۔" (۱۹ ؍ اکتوبر ۳۵ء)

اس کے بعد ہی کلکتہ میں حافظ خدا بخش ، ایم ، اے ، حسین اور بشارت حسین نے کلکتہ کے بیڑی والوں کی ایک یونین "اسموک میکرس یونین" کے نام سے قایم کی تھی ، اور منومنٹ کے نیچے بیڑی کے دکانداروں اور کاریگروں کا جلسہ بلایا تھا ۔

۱۹۳۶ء میں فرقہ وارانہ فسادات نے پھر زور باندھا ۔ یکم جنوری ہی کو کلکتہ میں عید کے دن ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا ۔ ۲ ؍ جنوری کو بنارس میں نماز پڑھتے مسلمانوں پر فرقہ پرستوں نے مظالم توڑے جس کی وجہ سے روزانہ ہند کو ان فرقہ پرستوں کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا ، اسی سال

پنڈت جواہر لال نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں صاف لفظوں میں ظاہر کر دیا ۔ کہ وہ سوشلزم پر ایمان رکھتے ہیں ، ان کا یقین ہے کہ سوشلزم ہی سے ہندستان کی نجات ہوگی اور انہوں نے اپنی خواہش کو بھی نہ چھپایا ۔ کہ کانگریس کو سوشلسٹ جماعت بن جانا چاہیئے ، اور یہ وہ حقیقت تھی جس کا اظہار روزانہ ہند اس سے قبل کر چکا تھا ۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے ان خیالات کی حمایت میں روزانہ ہند نے ایک اداریہ لکھا ۔

۲۰ ؍ مئی ۳۶ء کو روزانہ ہند میں ایک اداریہ "نئی سیاسی پارٹی" کے عنوان سے لکھا گیا تھا جس میں " یونائیٹڈ مسلم پارٹی " کے نام سے جو جماعت کلکتہ میں قائم کی گئی تھی ، اس کی مخالفت کی گئی تھی ۔ اس نئی پارٹی میں سر عبد الحلیم غزنوی بھی شامل تھے ، جنہوں نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے قرآن مجید پر تہمت تراشی تھی ۔ چنانچہ روزانہ ہند اس سے پہلے بھی اس سلسلہ میں ان کے خلاف ایک اداریہ لکھ چکا تھا اس "نئی سیاسی پارٹی " کے عنوان سے جو اداریہ لکھا گیا ۔ اس میں بھی ان کی اس تاویل کا حوالہ دیا گیا ۔ چونکہ سر عبد الحلیم غزنوی کے دل میں پہلے ہی روزانہ ہند کے خلاف جذبۂ عناد تھا ۔ اس لئے انہوں نے اس مرتبہ روزانہ ہند کے ایڈیٹر کو نوٹس دے دیا ۔ اور عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی دھمکی دی ۔ "نئی سیاسی پارٹی" کے زیر عنوان اداریہ میں اس نے یہ لکھا تھا :۔

" ہمیں اس پارٹی سے کسی بھلائی کی امید نہیں ہے ، جس پارٹی میں سر عبد الحلیم غزنوی جیسے لوگ شریک ہوں ۔ ظاہر ہے ، کہ وہ پارٹی مسلمانوں کے لئے یا ملک کے لئے کیا کرے گی ۔ سر عبد الحلیم غزنوی کی نسبت مسلم پبلک کو معلوم ہے کہ انہوں نے حکومت کی وفاداری کے جوش میں آ کر خود قرآن مجید پر بھی تہمت تراش دی تھی ۔ پس اس پارٹی سے جس میں سر عبد الحلیم غزنوی شریک ہیں ۔ یہی توقع کی جا سکتی ہے ، کہ وہ پارٹی مسلمانوں کو حکومت پر اعتقاد کی تلقین کریگی ،

اور مسلمانوں کے نام پر خطاب، اور عہدے حاصل کئے جائیں گے"

۲۸ مئی ۱۹۳۶ء

روزانہ ہند کو یہ نوٹس ۲۰ جون ۱۹۳۶ء کو موصول ہوا تھا جس کے جواب میں اس نے ایک معرکۃ الآرا اداریہ "سر عبدالحلیم غزنوی کا چیلنج" کے عنوان سے لکھا تھا۔ عدم گنجائش کے باعث اس اداریہ کا مختصر اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے ناظرین کو روزانہ ہند کی جرأت و دلیری کا اندازہ ہو جائے گا۔ علی الخصوص ایسے وقت میں جب کہ اس کے چاروں طرف ناسازگار ماحول تھا۔ اور اس سے وہ کس طرح بزد آزما تھا

"افسوس ہمارے مخالف اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ ہم ایک دوسری طبیعت کے آدمی ہیں۔ ہم نے اخبار اس لئے نہیں نکالا، کہ تجارت کریں .... ہم اس میدان میں اس عزم مصمم کے ساتھ اترے ہیں، کہ قربانیاں کریں گے کمائیں گے نہیں، بلکہ کھوئیں گے، راحت نہیں اٹھائیں گے، بلکہ تکلیفیں جھیلیں گے، اور یہ اس لئے کہ قومی خدمت کے میدان میں پھول نہیں کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ آرزوؤں اور ارمانوں کے لہلہاتے ہوئے چمن نہیں، بلکہ حسرتوں اور امیدوں کی قبریں ہر جگہ کھدی ہوئی ہیں۔ اس میدان میں پختہ کار اور بلند ہمت ہی ٹک سکتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا پروردگار ہمیشہ ہماری مدد کرے گا۔ اور ہمارے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں دیگا

"سر غزنوی کی نسبت ہم نے حال میں دو ایک سطریں لکھدی تھیں، موصوف نے ان سطروں کو اپنی توہین پر محمول کیا اور اپنے وکیل کی معرفت ہمیں نوٹس بھیجدیا ہے کہ ان سے دست بستہ معافی مانگیں، اور نقد روپیہ بھی ادا کریں ورنہ ہم پر وہ مقدمہ چلائیں گے، اور دیوانی و فوجداری دونوں قسم کی کارروائیاں ہمارے خلاف کریں گے۔"

سر عبدالحلیم نے ایک دوسرا نوٹس روزانہ ہند کو دے دیا، اور اس کی وجہ بھی تھی جو پہلے نوٹس کی تھی۔ اس کے جواب میں ایک وضاحتی اداریہ لکھا لکھا گیا۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ روزانہ ہند کو غزنوی سے کوئی ذاتی عداوت نہیں، چونکہ انہوں نے قرآن مجید پر تہمت تراشی تھی۔ اس لئے جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ قرآن مجید کی عزت و توقیر کو برقرار رکھنے کے لئے تھا۔

روزانہ ہند نہ توہین قرآن برداشت کر سکتا ہے، اور نہ توہین رسولؐ صلعم، چنانچہ جب مدراس سے شائع ہونے والے ایک اخبار "یونین" نے رسول مقبول صلعم کی شان میں توہین آمیز الفاظ لکھے تھے، تو روزانہ ہند نے اپنے ۲۱ ستمبر ۱۹۳۶ء کے اداریہ میں اس کی اچھی طرح خبر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ناموس اسلام کی حفاظت کے لئے ایک انجمن بنائیں۔ جس کا کام یہ ہو کہ قانونی کارروائی کے ذریعہ اس قسم کے جرائم کا سدباب کرے۔

۱۹۳۷ء میں انڈیا ایکٹ کے تحت ہندستان میں انتخابات شروع ہوئے تھے۔ روزانہ ہند نے اس سلسلہ میں تمام مسلمانوں کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش بلیغ کی۔ تمام فرقہ پرست جماعتوں، اور عناصر کی مخالفت میں متعدد اداریے لکھے، اور مسلمانان ہند کو متحد و متفق ہونے کی بار بار تلقین کی۔ جمعیۃ علمائے ہند جو علماء کی جماعت تھی اور سیاسی معاملات میں وہ ہمیشہ صحیح روش پر چلتی رہی۔ لیکن جب اس کے بارے میں روزانہ ہند کو معلوم ہوا کہ اس نے مسلم لیگ کی حمایت کا مسلک اختیار کیا تو اس نے اس کو ایک اداریہ میں انتباہ کیا۔

"لیکن تازہ انتخابات میں جمعیۃ علماء نے جو مسلک اختیار کیا وہ اس کی شان، وقار، شہرت کے منافی تھا جمعیۃ علماء نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا جس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے لوگ صوبہ متحدہ کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سراسر رجعت پسند اور جی حضوری تھے، بمبئی میں سید عبداللہ بریلوی کے خلاف جو رجعت پسند امیدوار کھڑا ہوا تھا۔ صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا مفتی کفایت اللہ نے اس کی تائید کی، اور کلکتہ میں مسٹر حسین شہید سہروردی کی حمایت کا اعلان کیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جمعیۃ علماء نے یہ روش کیوں اختیار کی

(بقیہ ۲۲۸ صفحہ پر ملاحظہ کریں)

علامہ آرزو لکھنوی مرحوم

غزل

دل رنج کا مارا ڈوب چلا بچنے کا سہارا کوئی نہیں
ہیں موجیں ہی موجیں چار طرف دریا کا کنارہ کوئی نہیں

جو رات ہے وہ بے چاند کی ہے جو دن ہے وہ ہے بے سورج کا
اس اپنی اندھیری دنیا میں اُمید کا تارہ کوئی نہیں

پھولوں کی جگہ ہر گلشن میں کانٹوں کا ٹھکانہ جنگل میں
سب کے لئے کوئی سہارا ہے اک میرا سہارا کوئی نہیں

جب کوئل کوک سناتی ہے پتّی پتّی لہراتی ہے
ہم کس سے کہیں اور کون سُنے ہمدرد ہمارا کوئی نہیں

غیر کے شریک غم کیوں ہو انساں کو نہ پرایا جانو
خود پھاند پڑے پرائی آگ میں جو وہ عقل کا مارا کوئی نہیں

جب دل نہ پسیجا ظالم کا رونا بھی بُرا ہنسنا بھی بُرا
اس کا بھی بھروسہ کوئی نہیں اس کا بھی سہارا کوئی نہیں

غیرت سے ہے دل پانی پانی اور جی ہے کہ ڈوبا جاتا ہے
غم کی ہے وہ طوفانی ندی جس کا کہ کنارا کوئی نہیں

جیسا کہ ہے مجھ پر وقت پڑا کون آرزو اور ایسا ہوگا
مرنے کا بہانا کوئی نہیں جینے کا سہارا کوئی نہیں

حضرت جرم محمد آبادی

غزل

دلِ دل تنگ میں محبوس ہیں ارماں کتنے — غنچہ مٹھی میں دبائے ہے گلستاں کتنے

یہ بھی سوچو کہ ہو تم فتنۂ دوراں کتنے — یہ بھی دیکھا کہ ہوئے چاک گریباں کتنے

ناامیدی کے سہارے مرے دل کے گوشے — کتنے آباد نظر آتے ہیں، ویراں کتنے

دل کی لہروں کا کرشمہ ابھی دیکھا کیا ہے — ابھی اُٹھینگے انہیں موجوں سے طوفاں کتنے

کتنی امیدوں کے الفت میں گلے گھونٹ دیئے — گُل کیے ہم نے چراغ تہِ داماں کتنے

فتنہ سازی کا یہی ڈھب ہے تو میرے ایسے — ابھی آئیں گے یہاں بے سر و ساماں کتنے

ہو طلبگار کوئی مثلِ زلیخا تو کھلے — اور بازار میں ہیں یوسفِ کنعاں کتنے

اثرِ حسنِ جنوں ساز کی ہو عمر دراز — دیکھو آباد ہوئے جاتے ہیں زنداں کتنے

فیصلہ جرم بُرا وقت کرے گا اس کا
کتنے حیواں یہاں بستے ہیں انساں کتنے

اِس وسیع دُنیا میں
زیادہ تر لوگ اپنی گاڑیوں میں
دوسرے ٹائروں کی بہ نسبت
گڈ ییر ٹائر ہی استعمال کرتے ہیں۔
زیادہ سے زیدہ مال لادنے والی
گاڑیوں میں بہ نسبت دوسرے ٹائروں
کے گڈ ییر ٹائر ہی استعمال کئے جاتے ہیں
زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے
جوتوں میں دوسری چیزوں کی
نسبت گڈ ییر کے ربر کے تلے
اور ایڑی لگاتے ہیں۔
زیادہ سے زیادہ مال اِدھر اُدھر
پہنچانے کیلئے فیکٹریوں میں دوسرے
بلٹ کے مقابلہ میں گڈ ییر کا پٹہ
ہی استعمال ہوتا ہے۔
زیادہ سے زیادہ ہوائی جہازوں میں کسی
دوسری کمپنی کی نسبت گڈ ییر ہی کے
ٹائر، ٹیوب، پہیئے اور بریک استعمال کئے
جاتے ہیں!
گڈ ییر
ربڑ کی صنعت میں بلند پایہ اور شہرت یافتہ
PR/18

کلیانی کانگریس سیشن ۱۹۵۴ء کے موقعہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کا ہوائی اڈا پر خیر مقدم۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔ سی رائے کے علاوہ صدر پراونشیل کانگریس کمیٹی شری اتولیہ گھوش اور روزانہ ہند کے ڈائریکٹر جناب ٹی۔ ایم ظریف بھی موجود ہیں۔

روزنامہ عبرت کے ڈائریکٹر اور ایڈیٹر

(بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے)— غلام سرور وکار ایڈیٹر، اشوک برادرز سدگھہ،

ڈی۔ ایم۔ طارق۔ طیب علی قادرجی۔

(کھڑے ہوئے)— وحیدالدین قمرالدین۔ عبدالرحیم اللہ رکھیا۔ اس۔ کے۔ بدرجی

پروفیسر سید احتشام حسین ایم۔اے لکھنؤ

اُردو نظم کا ارتقا

اردو نظم کے ارتقاء کی داستان شروع کرنے سے پہلے نظم کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ یہ لفظ مختلف سلسلوں میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے کبھی نثر کے مقابلہ میں شاعری کا ذکر کرتے ہوئے نظم کہہ کر شاعری مراد لیتے ہیں۔ وہاں شاعری کی سبھی قسمیں اس میں شامل ہوتی ہیں کبھی غزل کو الگ کر کے باقی تمام اصناف کو نظم کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایک ایسا مجموعہ جس میں ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو اور جس کا مرکزی تاثر کسی مخصوص خیال سے وابستہ ہو۔ اس لئے نہ تو موضوع کی کوئی قید ہے اور نہ ہیئت کی لیکن اردو کے ان قدیم اور عام اصناف ادب کو اس سے الگ ہی رکھا جاتا ہے جن کو اپنی علیحدہ حیثیت اور تاریخ ہے جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ یہاں تک کہ جدید مفہوم میں، ان قطعات کو جو غزلوں کے بیچ میں آ جاتے ہیں یا ان مسلسل غزلوں کو جو ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک ہی خیال یا جذبہ کی ترجمان ہوتی ہیں، نظم کہنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ان مختصر اشارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک علاحدہ اور مخصوص صنف کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے دور جدید کی وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی معین موضوع ہو اور جن میں بیانیہ، فلسفیانہ، یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ داخلی یا خارجی یا دونوں قسم کے تاثرات پیش کئے ہوں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مفہوم میں نظموں کی ابتداء دور جدید میں ہوئی۔ اگر ہم شعوری طور پر ایک صنف شاعری کو ترقی دینے کا خیال پیش نظر رکھیں تو یہ بات درست ہے لیکن اگر محض نظم نگاری کی روایت کی جستجو کریں تو اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو شاعری کی یعنی دکن میں جہاں اردو نے تعلیم کی شاعری نے عروج کی منزلیں طے کیں۔ شروع ہی سے مختصر مثنویوں کی شکل میں صوفیانہ یا مذہبی نظمیں ملنے لگتی ہیں اور ۱۶۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس کی شکل واضح ہو جاتی ہے۔ گولکنڈہ کے مشہور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد نظمیں نظم کے موجودہ مفہوم میں موجود ہیں۔ اس کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ عید، شب برات، بسنت، اپنی محبوباؤں کے حسن کا بیان، اپنی فتوحات کا تفاخر، اپنی تعمیر کردہ عمارتوں کا ذکر۔ یہ تمام نظمیں اس کے ذوق شعری اور حسن نگاہ کا آئینہ ہیں۔ منظر نگاری، سراپا کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے اس دور کی متعدد مثنویوں میں سے ایسے ٹکڑے الگ کئے جا سکتے ہیں جن پر علیحدہ مکمل نظم کا اطلاق ہو اسی طرح واقعہ کربلا کے متعلق نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جو موضوع کے اعتبار سے تو مرثیہ ہے لیکن اپنی صورت کے لحاظ سے نظموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

شمالی ہند میں شاعری کی گرم بازاری اٹھارہویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی جب افضل جھنجھانوی اور میر جعفر زٹلی کے بنائے ہوئے راستہ پر چل کر شعراء کے ایک بہت بڑے گروہ نے فارسی کے بجائے اردو میں اظہار خیال کی اہمیت کو تسلیم کیا اور امیر خسرو کے روشن کئے ہوئے چراغ کی لو تیز کی۔ فائز دہلوی، جن کا شمار دہلی کے ابتدائی شاعروں میں ہوتا ہے، اچھے نظم نگار کہے جا سکتے ہیں، انہوں نے دہلی کے میلوں، گھاٹوں، اور بعض پیشہ وروں کے بارے میں خوبصورت نظمیں لکھی ہیں اس کے علاوہ مثنوی کی شکل میں شعراء نے قہوہ اور حقہ پر اظہار خیال کیا ہے

میر اور سودا نے بھی مخمسوں، شہر آشوبوں، مثنویوں، ہجوؤں کی شکل میں مختلف مسائل زندگی پر دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلہ کی تکمیل ہی نہیں بلکہ ایک نئی روایت کی ابتدا، نظیر اکبرآبادی سے ہوجاتی ہے جنہوں نے نظم نگاری ہی کو اپنا خاص فن بنایا۔ ان کی غزل گوئی بڑی بڑی حد تک روایتی اور رسمی ہے لیکن نظمیں اچانک زندگی کی لاتعداد راہیں روشن کر دیتی ہیں، انہوں نے عشق، مذہب، موسم، تیوہار، کھیل کود، تفریحات، فلسفۂ حیات و مرگ، تغیرات زمانہ، بچپن، جوانی، بڑھاپا، غریبی امیری ہر موضوع پر نظمیں لکھیں، ان کے کلام میں عام انسانی زندگی کا افسون جاگ اٹھا ہے، محبت ارضی اور سادی معلوم ہوتی ہے اور مظاہر حیات رقصاں و جولاں نظر آتے ہیں، یہاں ٹھہر کر ہم غزل کی کسی حد تک محدود دنیا کے باہر نظم گوئی کے امکانات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نظیر کی زبان سادہ اور بول چال کے انداز سے قریب، انہوں نے نظم کی ہیئت میں بہت سے تجربے نہیں کئے، پھر بھی مختلف بحروں اور زمینوں میں انہوں نے یکساں روانی کے ساتھ عام فہم انداز میں زندگی کے تجربات اور تصورات کے خزانے پیش کئے ہیں۔ اس عہد کے دوسرے شعراء اسطرح آٹے دال، مفلسی، کبوتر بازی، تیراکی کے میلے، تل کے لڈو، کورے برتن، مہابیر کے میلے، کنہیا جی کے جنم، برسات، ہولی، آگرہ کی تباہی، جوانی، موت، ریچھ کے بچے، جاڑا، تاج گنج کے روضے پر نہ تو نظمیں لکھتے تھے اور نہ زندگی کے محدود تجربات اور درباری فضا کے جادو اور مخصوص خیالی تصورات کی وجہ سے ایسی نظمیں لکھ سکتے تھے۔ نظیر کا تنوع، انکی حقیقت نگاری، ان کی معلومات بہت کم شاعروں کے حصہ میں آتی ہیں اور گو نظم اردو کا کارواں بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن نظیر اپنی جگہ پر ایک روشن منارہ کی طرح کھڑے ہیں اور بہت سے نظم نگاروں کی راہ روشن کر رہے ہیں

نظیر کا انتقال سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوا اور کچھ دنوں تک نظم کی دنیا سنسان رہی، مرثیوں اور مثنویوں میں ایسے حصے مل جائیں گے جن سے نظم کا لطف اٹھایا جا سکے لیکن ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے نظم کو اس دورِ جدید کا انتظار کرنا پڑا جس نے انیسویں صدی کے وسط میں زندگی کی بنیادوں میں تبدیلی پیدا کر دی۔ یہ موقع اس تبدیلی کی وضاحت کا نہیں ہے بس یہ سمجھ لینا چاہیئے اس وقت سے نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور شعوری طور پر غزل کے مقابلہ میں نظم کو اہمیت دینے کی مہم کا آغاز ہوا۔ جن ذہنی تقاضوں نے ناول، تنقید، مضمون نگاری کی طرف متوجہ کیا، جنہوں نے نئی تعلیم، سائنس، مغربی فلسفہ، اصلاح مذاہب کا خیر مقدم کیا۔ انہیں نے مسلسل مربوط اور مخصوص اور معین موضوعات کے متعلق لکھی ہوئی نظموں کا مطالبہ بھی کیا۔ ان تمام باتوں کا تجزیہ تفصیل چاہتا ہے جو تھوڑے سے وقت میں ممکن نہیں، ہاں عملاً جو کچھ بھی ہوا وہ یہ تھا کہ لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد پڑی اور سنہ ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے ان مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جن میں غزلوں کے بجائے نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور مصرع طرح کی جگہ نظم کے لئے موضوع دیئے جاتے تھے۔ یہ اہم تبدیلی ایک علم دوست انگریز کرنل ہالرائڈ کے اشارہ سے ہوئی تھی اور اس تحریک کو ساز و برگ عطا کرنے والوں میں آزاد کے علاوہ حالی اور منشی پیارے لال آشوب کے سے بزرگوں کا ہاتھ تھا یہاں بحث کے کئی پہلو پیدا ہوتے ہیں، کیا یہ تحریک غزل کے خلاف تھی؟ کیا غزل کی مقبولیت کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت رکھتی تھی؟ کیا غزل کی پستی اور زوال کا نتیجہ تھی؟ کیا محض انگریزی تعلیم اور شاعری کے مطالعہ کا اثر تھی؟ کیا واقعی اس سے ادب و شعر زندگی کے قریب پہنچ رہے تھے؟ ایسے اور سوالات بھی اٹھتے ہیں۔ لیکن ان سب کا جواب ایک دفتر چاہتا ہے، مختصر اشارے غلط فہمی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسلئے اس وقت ان سے آنکھیں بند کر کے محض نظم کے تاریخی ارتقا کی کہانی کو مکمل کر لینا مناسب ہے۔

جب انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا، اسوقت دہلی، لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد کے اہم شاعرانہ مرکز اسی نظم نگاری کی تحریک سے متاثر نہیں ہوئے کیونکہ درباری اور جاگیردارانہ اثرات میں رہے بسے ہونے کی وجہ سے وہ فطرتاً روایتی شاعری کے حلقوں سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے، لیکن آزاد اور حالی نے اپنی بعض بہترین نظمیں اسی مشاعرے کے لئے لکھیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ اس تحریک کی

علمی حیثیت متعین کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی مخالفتوں کے باوجود غزل کے جادو کے کام کرتے رہنے کے باوجود نئے دور کے ذہن نے اس میں آسودگی پائی۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی اور بیسویں صدی کی ابتداء میں جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی حالات پیدا ہو گئے تھے وہ نئے خیالات کو جنم دے رہے تھے ان خیالات کا اظہار نثر و نظم میں برابر ہو رہا تھا اس میں شک نہیں کہ اس وقت کی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو محض افادیت اور مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے اور اسے حالی کے الفاظ میں "ابالی ہوئی کھچڑی" سے زیادہ بامزہ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم جو حدیں ٹوٹی تھیں، جو نئے موڑ نظر آنے لگے تھے، جو نئی زندگی شکل پذیر ہوئی تھی اس نے شاعری کے نئے پیکر تیار کئے، یہ انقلاب اس وقت بھی اہم تھا لیکن اس کے اثرات جو مستقبل میں پھیلے وہ اور زیادہ عہد آفریں تھے کیونکہ ایک دفعہ شاعری زندگی کے ساتھ چلی تو پھر بہت سی غلط راہوں پر بھٹکنے کے باوجود شعوری طور سے پلٹ پلٹ کر حقائق کے اظہار کی طرف آتی رہی۔ حالی اور آزاد کے نظموں مجموعہ کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ جہاں خیالات میں تغیرات ہوئے وہاں نظم کی ہیئت میں بہت سی تبدیلیاں نہیں ہوئیں، مثنوی، قطعہ، مسدس وغیرہ کے پرانے بنائے فارم کام میں لائے گئے اور یہ ہوتا بھی ہے، ہیئت میں جلد جلد تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ پرانی ہی شکلوں سے نئے کام لئے جاتے ہیں اسلوب اور انداز بیان بدلتا رہتا ہے۔

حالی اور آزاد کے علاوہ اسی عہد میں ڈاکٹر نذیر احمد، اکبر الٰہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، چکبست، اقبال، پنڈت کیفی، نادر کاکوروی، سرور جہان آبادی، صفی لکھنوی، شوق قدوائی وغیرہ نے نظم سے رسمی اور غیر رسمی، روایتی اور انقلابی بہت سے کام لئے، بہت سے سوئے ہوئے احساس جاگے، دبے ہوئے جذبے ابھرے، دھندلے خیالات روشن ہو گئے، محدود تصورات کی حدیں وسیع ہوئیں۔ اور قدیم و جدید کی آمیزش سے رنگارنگی اور تنوع پیدا ہوا۔ جس طرح ہندوستان بدلا تھا اس میں خود قدیم و جدید کی آمیزش تھی۔ زندگی کا کوئی بالکل نیا تصور نہیں پیدا ہوا تھا۔ ماضی اور حال کے امتزاج سے، جاگیردارانہ تصورات اور صنعتی دور کی لائی ہوئی قدروں کے میل سے زندگی سنوارنے کی کوشش تھی اسی لئے ان تمام شعراء کے یہاں ماضی کی مرثیہ خوانی اور حال کی برکتوں کا خیر مقدم دونوں موجود ہیں۔ ابھی بین الاقوامی تصورات سے متاثر ہونے کا وقت نہیں آیا تھا لیکن وطن کی محبت نے سیاسی کم اور اخلاقی زیادہ بلکہ انداز نظر کے لحاظ سے رومانی رنگ اختیار کیا تھا۔ اردو کی قدیم شاعری نے رسمیت کے زیر اثر مقامی اور ملکی خصوصیات کو بڑی حد تک نظر انداز کیا تھا، نئے شعراء نے یہاں کی برسات، چاندنی، دریاؤں، پہاڑوں، جانوروں اور چڑیوں کا ذکر کیا اس میں مقصد یہ تھا۔ لیکن نظیر کی نگاہ کی معصومیت نہ تھی مشرق کی تصویر میں رنگ بھرنے کی خواہش تھی، شاعرانہ وابستگی نہ تھی پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے تک جدید نظم نگاری کی روایت بھی جڑ پکڑ چکی تھی، مغرب کا اثر اس میں شامل تھا مگر ہیئت کے تجربے نہیں ہو رہے تھے، مغرب کے اسالیب کو اپنانے پر زور تھا اور نہ وہاں کی اشاریت سے اپنا دامن بھرنے پر۔ لیکن اس جنگ نے مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ اس کا مطلب تاریخی اعتبار سے یہ ہے کہ قوم پرستی، آزادی، مساوات، ترقی، سود و زیاں کے احساس نے ہر خطۂ ارض میں کروٹیں بدلیں اور ہندوستان کے ذہن پر اس کی پرچھائیاں پڑیں کیونکہ سیاسی اور معاشی غلامی کے احساس نے کچھ اپنی حالت سے غذا حاصل کی کچھ بیرونی ممالک کے انقلابات سے اور یہ پیچیدہ تاثر جنگ عظیم کے بعد ادب کے دوسرے شعبوں کی طرح نظم میں بھی پھوٹ نکلا۔

آزادی کی خواہش نے، اثرات نئے وقوف اور تجدد کے ذوق نے، رومانیت کی طرف رہنمائی کی اور اس خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بے تکان اور بے روک ٹوک گلگشت کرنے کے سلسلہ میں کئی رکاوٹیں دور ہوئیں اور کئی قلعے سر ہوئے، مثلاً جوش، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری وغیرہ نے عورت کا ذکر بے باکی، محبت، وارفتگی اور رومانی تصورات کے ساتھ کیا۔ ہیئت میں نئی راہیں نکالیں، ہندی

شاعری کے بعض خوشگوار اثر قبول کئے۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن سے ایک طرف نظم میں معنوی وسعت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف فنی تکمیل کی جانب قدم بڑھے۔ کچھ دنوں کے لئے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہردلعزیزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نظم نے غزل کو اس کی مسند سے اتار دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زندگی کے مسائل کا احاطہ کرنے کی جو سہولت ہر طرح کے تجربات بیان کرنے کی جو آسانی نظموں میں تھی وہ غزل میں نہیں تھی اور شاعری بھی آزادی اور ترقی کی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنا فرض ادا کرنا چاہتی تھی جن شعرا کا ذکر ہوا ان کے علاوہ شاعروں کی ایک بڑی تعداد نظم کی طرف مائل ہوئی اور مشکل ہی سے کوئی ایسا موضوع ہوا جس نے ان کی نظموں میں جگہ نہ پائی ہو۔ سیماب اکبرآبادی، ساغر، تلوک چند محروم، روش صدیقی، مہاراج برشاد برق، سورج نرائن مہر، نوبت رائے نظر، طریف تلا، احسان دانش، آنند جیت شرما، آگرہ سریکھی، مقبول حسین احمدپوری اور دوسرے شعرا نے حسن فطرت حسن انسان اور حسن تخیل کے راگ نظموں میں الاپے، سیاسی اور معاشی جدوجہد کو اپنا موضوع بنایا اور ترکیب بند و ترجیع بند، سانیٹ، مختصر اور طویل نظموں کا ایک انبار اکٹھا کر دیا جس میں رطب و یابس دونوں ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے قومی ضروریات اور بین الاقوامی اثرات کے ماتحت مادی زندگی اور فکر میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوئیں۔ انجمنیں برہم بھی ہوئیں اور محفلیں سجائی بھی گئیں، چنگاریاں بجھیں بھی اور بھڑک کر شعلے بھی بنیں اور زندگی ہی نے سوز و ساز اور رنگ و روپ کے وہ سامان فراہم کر دیئے کہ مختلف قسم کا شعور رکھنے والے مختلف راہوں پر چل نکلے، آزادی کی تعبیریں مختلف شکلوں میں کی گئیں اور جدیدیت کے نام پر طرح طرح کے گل کھلائے گئے، یہ سب کچھ ایک ہی وقت میں اس لئے ممکن تھا ہندستان میں سماج کی بنیاد طبقاتی تفریق پر ہے کئی روائتیں ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ قدیم اور جدید کی آویزش ہر ذہن میں دامن گیر نہیں ہے، اقتصادی بدحالی، معاشرتی ناانصافی مسلط ہے۔ اسی انتشار اور احساس کے بطن سے ترقی پسندی کی تحریک پیدا ہوئی جس نے زندگی اور ادب کے گوناگوں تعلقات کو نظم میں قائم رکھنے اور زیادہ نمایاں کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایک گروہ نے جنس اور اسکے اسرار و رموز کی شعوری یا غیر شعوری پردہ دری کو نظم گوئی کا شعار بنایا۔ کچھ لوگوں نے ہیئت کے تجربوں ہی کو خاص جز سمجھا اور بے قافیہ سے لے کر آزاد نظم تک چلنے میں کامیابی اور ناکامی کے بہت سے معرکے سر کئے، اس طرح نظم مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ہجو، شہر آشوب وغیرہ کی بہت سی صنفوں کو پیار کر کے نظم و ادب کا ایک بہت بڑا شعبہ بن گئی ہے اور اپنے دامن میں عشق و محبت، امن و جنگ، دلسوزی اور انسان دوستی، اشتراکیت اور انفرادیت، عقیدہ پرستی اور بغاوت کے ہزارہا پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور اگر اس کے پجاریوں کا محض نام لیا جائے تو اس کے لئے کافی جگہ درکار ہوگی، پھر بھی مجاز، سردار جعفری، جذبی، مخدوم، میراجی، جمیل مظہری، راشد، فراق، آزاد، اختر، لطیف، احمد ندیم، شاد، پرویز شاہدی، مجروح، وامق کے نام مثالاً لئے جا سکتے ہیں، ان کے یہاں عقیدوں، خیالوں، انداز بیان، مقصد شاعری ہر چیز کے متعلق اختلاف ہیں یا ہوتے رہتے ہیں لیکن اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی پہلو سے اردو نظم کی حدیں وسیع کر رہے ہیں اور شاعری کا مستقبل روشن ہے۔
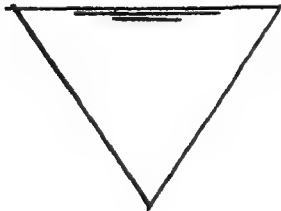
عاؔلم فتحپوری

"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"

○

رک گئی آ کے مرے کلبۂ احزاں کے قریب
ایک دوشیزۂ معصوم بایں حال تباہ
بھوک کی آگ سے مرجھایا ہوا روئے حسین
گرد جلتی ہوئی آنکھوں کے گلابی حلقے
اشک پیہم کی روانی کے نشاں ہوں جیسے
دے کے دستک مرے دروازہ پر یوں کہنے لگی
میں تو معروفِ زمانہ ہوں مرا نام ہے "نیند"
پوچھ دنیا سے کہ میں جان سے بھی پیاری ہوں
کھول دروازہ کہ اس وقت تھکی ہاری ہوں
جستجو ہے مجھے اک عمر سے ان آنکھوں کی
جو مجھے شوق سے آغوش میں اپنے لے لیں
بارہا گاؤں کی پیچیدہ گذر گاہوں میں
خاک چھانی ہے صعوبات سفر جھیلے ہیں
اوس پڑتی ہوئی راتوں میں کھڑے رہ رہ کر
بند دروازوں پہ کاٹی ہیں اندھیری راتیں
مجھ پہ سوزِ غم انساں کی حقیقت بھی کھلی
پھول سی خلد بداماں و درخشاں آنکھیں
روبرو میرے ہوئیں شعلۂ تر میں تحلیل"

○

"کھٹکھٹایا درِ دہقاں کو بھی جا کر میں نے
اس کے غم خانہ کا انداز نرالا دیکھا!
خاک کا ڈھیر تھا، سوراخ تھے اتنے چھت میں
جس کے آگے دلِ عاشق بھی خجل ہو جائے
التجا کی کہ میں آئی ہوں ذرا کھول دوار
تیرے اس حال پریشاں پہ دل و جاں سے نثار
میں نے دروازہ کے کھلوانے پہ اصرار کیا
اک خموشی کے سوا کچھ نہ ملا پھر بھی جواب
ایک دل دوز حقیقت تھی خموشی کا سبب
اپنی ٹوٹی ہوئی چھت کے انہی سوراخوں سے
تک رہا تھا وہ فلک کو نگہِ یاس کے ساتھ
خود فراموشی کے عالم میں مری کیا سنتا"

○

"بالاخانہ پہ طوائف کے بھی چڑھ کر میں نے
دے کے دستک کہا تیرا ہی درِ ناز ہو وا
میں ترے واسطے اے خواب پریشاں کی اسیر
آئی ہوں گود میں تسکین کا تحفہ لے کر!
اسی اثناء میں دریچے سے جو جھانکا میں نے
اک عجب عبرت دلدوز کا منظر دیکھا
سخت بیداری سے بھاری تھے پپوٹے ان کے
پھر بھی اک نفس کا شیدائی و خواہش کا غلام
جس کی آنکھوں میں تھی مکروہ چمک سونے کی
اسی ہر بزم سے ٹھکرائی ہوئی عورت کے
دست دیا چوم رہا تھا کچھ اس انداز کے ساتھ

جیسے وہ اس کے لئے جان بھی دے ڈالے گا
بے خبر خود سے تھی وہ ۔ میری خبر کیا لیتی!"

○

"سوختہ بخت ہوں مردودِ زمانہ ہوں میں
لاکھوں اُن خواب زدہ آنکھوں کی ٹھکرائی ہوئی
نیند آور شبِ یخ بستہ کی تاریکی میں
ایک لمحہ بھی پلک تک نہیں جھپکی جن کی"
"آج شاعر مری عصمت کا محافظ تو ہے
مجھ کو تو اپنے ہی غم خانہ میں آجانے دے
ڈر رہی ہوں کہ ندیدہ ہے بہت پیرِ فلک
میری دوشیزگی کا رنگ اڑا لے نہ کہیں"

○

اس حقیقت میں تصنع کو ذرا دخل نہیں
کہ میں خود نیند ہوں اور نیند سے بیگانہ ہوں
میں نے وہ آدمی دیکھے ہیں کہ جن کے تکیے
رات بھر آنسو سے بھیگے ہوئے رہتے ہیں
ان تھکی ہاری خواتین کو بھی دیکھا ہے
بیٹھ کر خاک میں چوکھٹ پہ طرب خانوں میں
اونگھتے اونگھتے کٹ جاتی ہیں راتیں جن کی"

○

کھول دروازہ، کوئی غیر نہیں، نیند ہوں میں
میرے شاعر! مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے
بس بہانہ ایک طرف پھینک کے گل کر دے چراغ
اور اگر اس کو بجھانے میں تکلف ہو تجھے
جب میں آؤں تو ذرا روشنی دھیمی کر دے"

"رات بھر تو یونہی بیٹھا ہوا کیا کرتا ہے؟"

بڑی سنجیدگی سے نیند نے پوچھا مجھ سے
میں نے جھنجھلا کے دیا نیند کو سنجیدہ سا جواب
"سخت حیرت ہے مجھے بے خبری پر تیری!
دیکھ اس چرخِ ستم پیشہ کے سایہ میں ابھی
سامنے کتنی بیاباں میں پڑی ہیں لاشیں
آج تک جن کے مقدر میں نہیں گور و کفن!
اُن پہ خونخوار درندوں کی ہے پیہم یورش
جن کی چیخوں سے دہلتا ہے کلیجہ میرا
ہڈیاں دیکھ وہ تازہ و جواں لاشوں کی
گھونسلے جن سے سجائے ہیں ابھی چیلوں نے
جن کی بو تیر کی مانند ادھر آتی ہے
میرے دل، میری رگِ جاں میں گھسی جاتی ہے
ایسے عالم میں قرار آئے تو کیوں کر آئے
کوئی پتھر نہیں، حساس ہوں شاعر ہوں میں"

○

"غمِ پنہاں سے جو دل خون ہوا جاتا ہے
اس کی دھڑکن کی صدا تک نہیں آتی تجھ کو
یہ قلق ہے کہ یہ بدمست مئے جاہ و حشم
بے وفا جھوٹی حکومت پہ اکڑنے والے
سوچنے اور سمجھنے پہ بھی دیتے ہیں سزا
ہم کو سمجھائیں، یا سمجھیں، یا کوئی حل سوچیں،
یہ ستمگر تو کسی بات پہ راضی ہی نہیں"
"ان غریبوں کے مسائل ہی پہ کچھ غور کریں
خونِ ناحق کے پیاسوں نے جفا کاروں نے
اپنی جباری و قہاری و چنگیزی سے
نوعِ انساں کی بلندی سے گرایا ہے جنہیں
چند انسانوں کی چوکھٹ کا بنایا ہے غلام"

آج جب خون کے سیلاب میں ڈوبا ہی وطن
غلبۂ موت سے جب دست و گریباں ہیں عوام
راہزن گھات میں ہیں، راہنما سوتے ہیں
میں بھی مرجاؤں یہ منشا، یہ تمنا ہے تری؟
جا۔ یہاں تیری تمنا نہیں پوری ہوگی
نہ کھلا ہے نہ کھلے گا مرا در تیرے لئے
تجھ سے پوشیدہ ہے شاید ابھی شاعر کا مقام
میں جو سو جاؤں تو یہ سارا جہاں سو جائے
مجھ کو معلوم ہے جو مجھ پہ وطن کا حق ہے
جو مرا فرض ہے، وہ مجھ کو ادا کرنا ہے
مجھ پہ لازم ہے کہ ہر وقت میں بیدار رہوں
اور سوئے ہوئے انسان کو بیدار کروں
مجھ سے نادان یہ اصرار ہے بیکار ترا
جا۔ کہ بزم مہ و انجم میں جگہ ہے تیری
یا کسی شبنمی وادی میں بسیرا کر لے
کیونکہ یہ رات تو انساں پہ بہت طاری ہے
سینکڑوں مر چکے اس رات کی تاریکی میں
سینکڑوں موت کا ارمان لئے بیٹھے ہیں
صرف دو چار ہیں خونخوار درندے ایسے
جن کے کاندھوں پہ دکھانے کو ہے انساں کا لباس
وہ تیری راہ میں آنکھیں بھی بچھا سکتے ہیں
وہی مشتاق ہیں تیرے وہی طالب ہیں تیرے
تیری زلفوں کو وہ شانوں پہ پریشاں کریں
نا امیدی کے سوا کچھ نہ ملے گا مجھ سے
نہ کھلا ہے۔ نہ کھلے گا مرا در تیرے لئے
جا۔ کہ بزم مہ و انجم میں جگہ ہے تیری

نشاط الایمان

میرا کردار

یہ میں ہوں، صرف میں، لغت میں میں کی تعریف کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے لغت کی رو سے میں کی تعریف ساون ندی کا وہ امنڈتا ہوا سیلاب ہو جو رزم کی ابھرتی ہوئی رعنائیوں کی طرح پل بھر میں ایک گاتے اور ہنستے ہوئے گاؤں سے اسکا نغمہ چھین لیتا ہے، ہو سکتا ہے لغت میں میں کے معنی بیچی کے باغوں کی سحر خیز ہواؤں کا وہ جھونکا ہو جس کی مہکتی ہوئی لپیٹوں میں زندگی کی تڑپ کسی کنواری محبت کی مچلتی ہوئی حیا کی طرح سمائی رہتی ہے، ہو سکتا ہے لغت میں، میں کا مطلب وہ لمبی چوڑی سڑک ہو جس پر صبح و شام ایک کوڑھی بھی چلتا ہے، اور ایک صحتمند آدمی بھی، ایک رولس کار بھی سن سے گزرتی ہے اور ایک رکشا بھی رینگتا ہے، ہو سکتا ہے لغت میں میں کی تعریف وہ عفت اور عصمت ہو جس کی قیمت امتحان کے اس پرچے کی طرح ہو جو صفر لاتا ہے۔ غرضکہ کوئی بھی معنی ہو سکتا ہے میں کا جسے میں جانتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ اتنی معمولی بات پر کبھی غور کروں، ہاں، اپنے میں کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بالکل اچھی طرح، لیکن میں جھوٹ کہہ رہا ہوں، میں اپنے میں کی بھی تعریف نہیں جانتا، میں نے کہا ہے نا، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے، میں ہر وقت معروف رہتا ہوں

میری دنیا کے آسمان اور زمین کا رقبہ بہت وسیع ہے اس دنیا کے آکاش اور دھرتی سے بھی زیادہ۔ اس لئے میرے مصروفیات کے ذرائع بہت زیادہ ہیں، سجارت ورش کے ننگے بھوکوں سے دوگنا اور انکی شاہراہیں بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ اتنی دور، جتنی کہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے جراثیم جاسکتے ہیں۔ میری باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے، میں نوجوان ہوں اس لئے۔ لیکن میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں اگر سچ میں یقین نہیں آتا ہے تو سنئے جناب، میری دنیا کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔

میں ایک شاندار اور عظیم مل کا واحد اور مسلّم مالک ہوں۔ سیٹھ بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن مجھے اس لفظ سے سخت چڑ ہے۔ نہ جانے کیوں مگر اس بھید سے دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں صرف مالک کہلانے پر خوش ہوتا ہوں۔ خوشی اور مسرت کی بات بھی ہے خدا سارے جہاں کا مالک ہے۔ اس سارے جہاں کا جس کے آسمان کے نیچے اور زمین کی سطح پر پہاڑ ہیں سمندر ہیں اور انسان بستے ہیں۔ اور جس کے دوسری یعنی روپوش دنیا میں شاندار الحمرا ہیں جس کے کمرے میں بہترین قسم کی حوریں ہیں۔ جسکے ارد گرد شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ جس کی کھڑکیوں میں انگور کے خوشے جھولتے ہیں ——— خدا ان سبھوں کا مالک ہے۔ میں اسی مالک کے ناطے سے اپنے کو مالک کہتا ہوں۔ وہ بڑا مہربان اور رحمدل ہے، میں اس کا بہت بہت شکرگزار ہوں۔ اس نے مجھے بھوکے بنگال کا کوئی کنگال نہیں بنایا۔ ایک شاندار مل کا مالک بنایا۔ مل مالک ہونا مجھے وراثت میں ملا ہے۔ میرے والد بھی مل مالک تھے۔ جو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔ میرے دادا بھی مل مالک تھے جن کی قبر شاندار گل بوٹوں سے سجی ہوئی ہے، میرے پردادا بھی مل مالک تھے جو اپنے زمانہ میں حاتم کے بے لوث مریدوں میں شمار ہوتے تھے اس لئے میں بھی مل مالک ہوں، اور میں بھی ایک دنیا کا خدا ہوں میری اس خدائی سے کسی کو کوئی فائدہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، مگر جب کبھی کوئی میری اس خدائی تہذیب، تمدن، اصول اور قانون سے

نافرمانی کرتا ہے، اس کا حشر میرے خدا کے ابلیس کی طرح ہوتا ہے ــــ ابلیس کی تاریخ سے ہر کوئی واقف ہے!

میں ایک ایرویز (AIR WAYS) کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوں۔ بہت قیمتی اور وزن دار۔ اس کی کہانی بڑی دلچسپ اور انوکھی ہے اور اس کا ہیرو سراسر میرے ہوٹل بزنس کا جنرل منیجر ہے۔ وہ کافی عمر رسیدہ ہے، لیکن شکل صورت سے اس کی اصلی عمر کا پتہ لگانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ آج کل ایک سوسائٹی زدہ چھوکری کو دیکھ کر یہ معلوم کر لینا کہ وہ شریف ہے یا ذلیل۔ وہ اپنی پکی عمر سے زیادہ جہاندیدہ اور زمانہ شناس ہے۔ اس لئے میں اس کی باتوں پر زیادہ چلتا ہوں اور اس کی باتوں پر کم، ذاتی حیثیت سے مجھے یہ بات کھلتی ضرور ہے لیکن راز کی بات کہاں آنے پر مسکرا دیتا ہوں اور اس کی باتوں کی خوب داد دیتا ہوں ــــ اس نے ایک دن کہا تھا۔ میرے مالک اپنی دنیا کا معائنہ کرنے اور اسے ہزار دیسے پرکھنے کے لئے زمینی کل پرزوں کے علاوہ آسمانی آلہ بھی ہونا چاہیئے، اس سے آپ اپنے کاروبار میں پھیلاؤ کے ساتھ اپنے تھکے ماندے مزاج کو تازہ اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی تازہ دنیا کی عیاشی کر لیں گے۔ میں عیاشی کے لفظ پر چونکا تھا مگر جب اس نے اس کا مطلب بتایا تو خوشی سے اچھل کر میں نے اس کو ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اسی زمانہ میں میرے عظیم ترین مل کے مزدور یونین کے سکریٹری نے مجھے ایک نوٹس بھیج رکھی تھی کہ اگر فلاں تاریخ سے تنخواہ میں اضافہ نہیں کیا گیا تو اس کے دوسرے دن سے ہڑتال ہو جائے گی ــــ جسے میں اور میرے منیجر نے کمال عقلمندی سے پھاڑ دیا تھا اور یونین کے سکریٹری کو چوڑیاں پہنا کر نامعلوم مدت کے لئے کہیں بھجوا دیا تھا، تو خیر میں ایرویز کمپنی کا حصہ دار ہو گیا۔ حصہ دار ہونا تھا کہ میری آمدنی دوگنی ہو گئی اور میرے تعلقات دوسرے ملکوں کے معیشوں سے اور زیادہ پختہ ہو گئے جس سے مجھے کاروبار اور عیاشی میں ڈبل ڈبل فائدے ہوئے۔

ہر دوسرے تیسرے دن تو نہیں۔ لیکن مہینہ میں ایک دو بار ضرور کسی ملک کی سیر کرتا ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ارجنٹ اور امپورٹنٹ کام کے سلسلے میں کئی بار جانا پڑتا ہے۔ میں زیادہ تر امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی سیر کرتا ہوں۔ جہاں کی گلریز دنیا اور رنگین الیکٹرک مناظر آنکھوں کو بالکل خیرہ کئے دیتے ہیں۔ میں ان سے بے حد محظوظ ہوتا ہوں۔ خاص طور پر ایسے موقع پر جب میں اپنے جدید ترین کل پرزوں والے شاندار مل کے غنڈے مزدوروں کی نت نئی مانگوں سے پریشان ہو جاتا ہوں تو تمام بوجھ کو اپنے جہاندیدہ اور تجربہ کار منیجر کے کاندھوں پر ڈال کر امریکہ، برطانیہ اور فرانس آ جاتا ہوں، جہاں ہم عصروں سے مل کر ان پریشانیوں کا مداوا ڈھونڈتا ہوں اور خوب داد عیش دیتا ہوں۔ یہاں کی سوسائٹی میں شراب اور عورت اتنا ہی بلند درجہ رکھتی ہے جتنا مذہب میں "صوم و صلوٰۃ" کا مرتبہ ہے پیگ چڑھاتے اور کسی کسی ہوئی جوانی کا بھرپور رس لیتے وقت میں اپنے روایتی اصولوں کی بنا پر بھول جاتا ہوں کہ "بھارت ورشن مل" کی چمنی سے جو بوسیدہ بوسیدہ دھواں نکل رہا ہوگا۔ اس میں ہزاروں غنڈے دل اور ہزاروں پیٹوں کی جلتی ہوئی روحوں کا دھواں بھی شامل ہے ــــ پھر میں اپنی ایرویز کمپنی کے اسپیشل جہاز میں سفید ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا واپس آ جاتا ہوں، کمپنی کے گیٹ پر دونوں طرف کمپنی کے دربان ملتے ہیں جو بھارت کی ہر مال ملے گا۔ دس پیسے والی فضا میں داخل ہوتے وقت جھک کر مجھے سلام کرتے ہیں اور پھر ان کی عقیدت مندی میں مجھے ان کی تشنہ روح کا بدمعاش چہرہ دکھائی دیتا ہے، میں ان کا سلام کرنا بھول جاتا ہوں اور فوراً اپنی امریکہ یا جاپان کی بہترین کار میں بیٹھ جاتا ہوں۔

میں آرٹ اور فن کے قدر دانوں میں سے ہوں اور اس میں آغا خاں اور ریجنس کے گھوڑوں کی مقابلہ بازی سے بھی دو تین فرلانگ آگے ہوں۔ یوں مجھے آرٹ اور فن سے کوئی لگاؤ اور اہمیت نہیں ہے۔ لیکن میں نے آرٹ اور فن کی نشر و اشاعت کے لئے

ایک فلم اسٹوڈیو کھول رکھا ہے، میں اس کا سولہ آنے کا مالک اور آقا ہوں، میرے فلم اسٹوڈیو میں ہر سال دوسری فلم کمپنیوں کے مقابلہ میں زیادہ فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر سلور جوبلی گولڈن جوبلی مناتی ہیں۔ ان میں آرٹ اور فن کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ گرچہ بیشتر دیگ شروع ان پر خوب لے دے ہوتی ہیں مگر ہفتہ بھر تے ہی تمام گندے اور دشمن فن اعتراضات کا فور ہو جاتے ہیں۔ ان سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی فلموں کی تیاری میں میری محبوب ایکٹریسیں، زر خرید ڈائرکٹر، خوشامدی کیمرہ مین، پیچھے پیچھے رہنے والا میوزک ڈائرکٹر کار کا دروازہ کھولنے والا ڈانس ماسٹر، میری اجازت کے بغیر نہ بیٹھنے والا کہانی کار اور مکالمہ نویس، مجھے دیکھتے ہی گنگنانے والا شاعر اور میز پر چائے کا گلاس رکھنے والا ایکٹر وغیرہ ہم بہت زیادہ میرے معاون ہوتے ہیں۔

فلم اسٹوڈیو میرے لئے وہ حسین منی بیگ ہے جس میں دوسرے زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ میں صرف دو ہی خانے کی طرف زیادہ مائل رہتا ہوں، ایک تجوری پسند پروگرام پر جس کی تیاری کے بعد مجھے بھارت ورش کی بھوک کی سوکھی اور جنس کی ماری جنتا سے لاکھوں لاکھ پیسے بھی ملتے ہیں اور داد بھی۔ میری دوسری نگاہ متحرک ہوئی ایکٹریسوں پر رہتی ہے، یہ ایکٹریسیں جنہیں عرف عام میں ترقی یافتہ حسن فروش کہا جاتا ہے، بہت مرغوب اور کار آمد ہیں۔ پہلے پہل جب فلمی صنعت کی ابتدا ہوئی تھی تو حسین چھوکریاں اور چنی چنائی بازاری چھوکریوں سے ایکٹریسوں کا فنی کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ آرٹ بہت ترقی کر گیا ہے یا یوں کہئے کہ بھارت ورش کی لڑکیاں بہت زیادہ باشعور اور عقلمند ہو گئی ہیں، اس لئے فلمی صنعت میں خاندانی لڑکیاں اور شبھ اور نیک بیٹریاں بڑے شوق و ذوق سے آرہی ہیں۔ مجھے ایکٹریسیں اس لئے مرغوب، لذیذ اور مفید ہیں کہ وہ مجھے شہرت اور دولت کے ساتھ جنس "مانگوں" میں پیلیں کا کام بھی کرتی ہیں۔

ہی کوئی فلم بنانے سے پہلے امریکہ اور برطانیہ کے فلم اسٹوڈیو کا ایک دو چکر ضرور لگاتا ہوں، کوئی اسے اہم سمجھے یا نہ سمجھے مگر میں اسے مذہبی رسم کی طرح ضروری اور نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہاں سے جب واپس ہوتا ہوں تو جہاں میرے دماغ میں وہاں کے فلمی صنعت کے تازہ گنوں کے تارے روشن ہوتے ہیں۔ وہاں سے ساتھ ساتھ امریکن لونڈیوں اور برطانوی چھوکریوں کی بے باک اداکاری اور زہرناک جنسی جوہر لئے آتا ہوں۔

میں ایک مذہبی ادارے کا صدر ہوں۔ یہ مذہبی ادارہ میری وجہ سے چل رہا ہے اس ادارہ کے ذریعہ بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ مجھے مذہب اور اس کی تعلیم سے خاص طور پر لگاؤ ہے یوں بھی ایک مذہبی برادری میں پیدا ہونے کی وجہ سے مجھے مذہب سے نسلی محبت ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کاروباری زندگی میں مجھے مذہب کے اصول سے کم قربت رہی ہو۔ لیکن میں دہریوں اور ملحدوں کی طرح جان بوجھ کر مذہب سے کبھی غافل نہیں رہا۔ جب بھی موقع ملا ہے عبادت گاہوں کی زیارت اور دورہ کیا ہے مذہبی ادارے میں ایک سے زیادہ پیشوا ہیں جو سب کے سب میرے معتقد اور مرید ہیں۔ یہ میرے آڑے وقتوں میں بہت کام آتے ہیں۔ جب دنیا میں میرے پھیلائے ہوئے جال سے لوگوں میں آندھی اور طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جب لوگوں سے میری دولت، میری شہرت اور میری نئی نئی جدت نہیں دیکھی جاتی ہے اور وہ سب مجھے چاروں طرف سے گھیرنے والے ہوتے ہیں۔ تو یہ میرے مرید اور معتقد اپنی سرگیں آنکھوں، پان زدہ ہونٹوں، مہندی آلود لمبی داڑھیوں سر پر مقدس عمامہ، ٹخنوں تک جھلتا ہوا گنگا جمنی جبہ اور ہاتھوں میں مقدس کتاب کے پارینہ اوراق لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور غصہ سے تھر تھر کانپتے ہوئے اعلان کرتے ہیں ـــ اسے خداوند کریم کے راستوں سے بھٹکنے والو! ڈرو، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو۔ شیطان کے پھندے میں مت آؤ۔ یہ دنیا فانی ہے دنیا سے کبھی محبت

نہ کرو۔ قیامت کا خیال رکھو۔ بڑائی چھوٹائی سب پروردگار کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں دخل نہ دو۔ اور اسی ڈھرے کی دوسری باتیں جو شاید مذہبی کتابوں سے چنی ہوتی ہیں، کہہ کر مجھے صاف بچا لیتے ہیں۔

میں ان سے اس فعل سے خوش ہوکر اکثر انہیں انعام و اکرام دیا کرتا ہوں۔ جسے وہ بار بار چومتے ہیں۔ جیسے وہ آسمانی کتاب ہوں۔ بڑے کام کے بندے ہیں یہ سب۔ مذہبی مریضوں کے لئے تو مجرب نسخہ ہے۔

انعام و اکرام کا ذریعہ انہیں تک محدود نہیں رکھتا ہوں۔ سال میں ایک بار دینی تعلیم پانے والے بچوں اور بچیوں میں بھی بانٹتا ہوں۔ جو بچے اور بچیاں، دینی تعلیم میں ہونہار، ہوشیار اور تیز نکلتے ہیں انہیں زیادہ انعام دیتا ہوں، ان کے والدین کو سراہتا ہوں جو انعام دیتے وقت مذہبی پنڈال میں موجود رہتے ہیں۔

پنڈال سے جاتے وقت سب کے سب مجھے نیک دعائیں دیتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ اور میں اس وقت اپنے مجرب نسخوں کو دلی مبارکباد دیتا ہوں!

میں ایم پی ہوں یعنی ممبر آف پارلیمنٹ ہوں، شاہی دور میں اگرچہ میرے والد صاحب جو بقید حیات تھے، ایم پی نہیں تھے مگر ان کے تعلقات شاہی دور کے بڑے بڑے افسروں سے کافی گہرے تھے، انہوں نے ایک مرتبہ اپنے صوبہ کے گورنر صاحب کو اپنے محل میں شاندار پارٹی دی تھی۔ جس سے خوش ہوکر گورنر صاحب نے ان کو ایک بہت بڑے اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ اور ان کے دیگر خدمات کو خوب سراہا تھا۔ میرے والد صاحب آنجہانی خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ہمیشہ ملکی مفاد کے پیش نظر "ولیشی غنڈوں اور لفنگوں" کے خلاف شاہی دور کی حمایت میں قدم اٹھایا کرتے تھے، کئی مرتبہ انہیں کے اشاروں پر ولیشی غنڈوں کے بڑے بڑے سرغنوں کو جو ہمیشہ "شاہی دور

ختم کرو" کا نعرہ لگایا کرتے تھے، قید و بند کی ہوا کھانی پڑی، اس شاندار پارٹی میں والد صاحب نے مجھے گورنر صاحب سے ملایا تھا حالانکہ اس وقت میں خوب جوان اور جہاندیدہ نہیں تھا مگر گورنر صاحب سے 'شیک ہینڈ' کی گرمی آج بھی اپنے ہاتھ میں محسوس کرتا ہوں اور اسی گرمی کے طفیل آج اپنے جمہوری دیس میں ایم پی ہوں۔

ایم پی کے لئے مجھے زیادہ کد و کاوش نہیں کرنی پڑی تھی۔ کیوں کہ ایم پی کے لئے کاغذ برسر اقتدار پارٹی کی طرف سے پیش کیا تھا۔ جیسا کہ دوسرے نوابوں اور راجوں نے کیا تھا۔ جن کا زیادہ تر وقت حسین تر چھوکریوں، خوبصورت موٹروں اور اپنی بنائی ہوئی جنتی کنجوں میں گزرتا ہے، ہاں الیکشن کے زمانہ میں ایک آدھ بار ایسی جگہ جانا پڑا تھا جہاں گندے کنجوس اور بخیل انسانوں کی آبادی جو ہمیشہ رقم جمع کرنے کے خیال سے پھٹے حال میں رہتے ہیں۔ ان سے طرح طرح کی باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اور ان سے ہاتھ بھی ملانا پڑتا تھا۔ الیکشن کی تیاری اور پروپگنڈہ میں چونکہ مجھے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا تھیں اس لئے میری زیادہ رقم صرف نہیں ہوئی تھی۔

پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے بعد مجھ پر نئے نئے راز آشکار ہوئے پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی دنیا میں اپنے جنرل منیجر کے بعد میں ہی زمانہ شناس ہوں، مگر یہاں معلوم ہوا کہ اور بھی لوگ ایسے ہیں جو میرے کاروبار کے جنرل منیجر کے لائق ہیں میں ان رازوں سے بہت خوش ہوا۔

ایم پی ہونے سے مجھے کچھ اور فائدہ ہوا یا نہ ہوا ہو لیکن امپورٹ ایکسپورٹ، کئی طرح کی ٹیکسوں، نئے نئے لائسنس، بڑی بڑی ٹھیکہ داریتی اور اسی قماش کی دوسری چیزوں کی حصول یابی میں مجھے کافی فائدہ ہے، بازاری اجناس اور اشیاء کی قیمت کے بڑھاؤ گھٹاؤ میں میرا پورا پورا ہاتھ رہتا ہے، پارلیمنٹ کے اجلاس میں میرا کام صرف

اتا ہے کہ حکومت کے پیش کردہ بل اور تجویز کی پوری پوری حمایت کرتا ہوں، حالانکہ اس وقت مجھے گندے، اکھڑ، بخیل اور پچھڑے حال انسانوں کا خیال رہتا ہے، جن کے ووٹوں سے ایم پی ہوا ہوں لیکن وہ جاہل ہی کیا جو سر پر چڑھ کر نہ بولے۔!

میں ایک بہت بڑے پرنٹنگ اور پبلشنگ ہاؤس کا مالک ہوں جہاں سے میں ایک روزانہ اخبار بھی نکالتا ہوں میرے اخبار کے لئے بیک وقت کئی چیف ایڈیٹرز اور نائب ایڈیٹرز ہیں، اور کارکن تو سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ دن رات کام ہوتا رہتا ہے۔ مدیروں میں بڑے اعلیٰ ادیب اور شاعر ہیں، میں ان کی ذہانت اور ادراک کا بہت زیادہ قائل ہوں، پہلے پہل تو ان میں سے کئی نے پینترا بدلا تھا۔ لیکن کسی نے کہا ہے کہ پیٹ کی مار اور تن کی پوشش کا خیال بہت پریشان کن اور فکر انگیز ہے، انہوں نے میری نگاہ کو دیکھا اور مستقبل کے اندھیروں کے خوف سے سنبھل گئے اور میرے پکے مرید اور دوست راست بن گئے۔ مگر دو ایڈیٹروں نے بڑی غنڈہ گردی سے کام لیا۔ انہوں نے میری نگاہوں کا ذرا بھی اثر نہیں لیا اور اپنی گھسی ہوئی چپل میں پاؤں اٹکاتے اور فولادی مٹھیوں کو اٹھائے ہوئے میری نظروں سے دور ہو گئے، ان کے جانے پر مجھے اپنے آپ پر جھنجلاہٹ ہوئی مگر فوراً ہی یہ احساس کافور کی طرح زائل ہو گیا۔ میرا ان لفنگوں سے کیا مقابلہ میرے باقی ایڈیٹر بھی قابل اور فاضل ہیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔

میرا اخبار بھارت ورش کے چند اعلیٰ اور مشہور اخبارات میں سے ہے، اخبار نکال کر میں شروع سے فائدے میں رہا۔ کبھی نقصان اور گھاٹے کی صورت نہیں دیکھی، اخبار ہے بھی بڑے کام کی چیز اس میں اتنی طاقت ہے کہ فرشتوں کو زمین پر اور شیطانوں کو آسمان پر پہنچا دیتا ہے، آج کے زمانے میں تو اس کے بغیر ایک "قدم" چلنا مشکل ہے دنیا کا کون سا کاروبار ہے جو اس کے بغیر بڑا ہوا ہے، لیڈروں کی لیڈری اور حکومت کی مشینری تو اسی کے دم سے قائم ہے۔

میرا ایمان ہے، ساری دنیا میں اگر کوئی امن یا بھلائی کا توازن قائم رکھتا ہے تو ایک اخبار اور دوسرے مذہبی پیشوا!

میں ایک کلب کا سکریٹری بھی ہوں جسے ہم لوگوں نے قلوپطرہ محل نام دے رکھا ہے، قلوپطرہ بہت ہی پرفضا اور رنگین مقام پر واقع ہے اس کے ایک طرف سے دریائے گنگا کی ایک شاخ بھری ہوئی عورت کی طرح چلی گئی ہے، دوسری طرف سرسبز پہاڑیوں کا ایک بانکا سلسلہ نظر آتا ہے، قلوپطرہ میں وہ تمام مشغلوں کے سامان مہیا ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔

قلوپطرہ کے تمام ممبران جن میں زیادہ تر رئیس، نواب، سیٹھ اور راجہ کے علاوہ فلم کمپنی کے مالک، بیمہ کمپنی کے ڈائرکٹر، بینک کے منیجر اور فوج کے جنرل کرنل ہیں ــــ شام کو اپنی اپنی ہر رنگ کی بیویوں، بیگموں، خریلیتوں اور نت نئی محبوباؤں کے ساتھ تشریف لاتے ہیں ان کے آنے اور بیٹھنے کا انداز اتنا قابل دید نہیں ہوتا جتنا ان کے مسکرانے، گفتگو کرنے اور آنکھیں لڑانے کا انداز قابل نوٹ ہوتا ہے، قلوپطرہ میں آنے کے بعد عشق کرنا تو عام بات ہے یہی وجہ ہے کہ کرنل حبیب کی بیگم راجہ مہندر کی بغل میں، راجہ مہندر کی رانی نواب دران کے پہلو میں، نواب دران کی بیگم سیٹھ جیونت کے بازو میں اور سیٹھ جیونت کی بیوی میرے عشق میں پاگل رہتی ہو غرض کہ قوس قزح جیسی ایک زنجیر ہے جو علیش محل کے تمام ممبروں کو گلے میں بل دیتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔

مجھے عورتوں کی ذات سے ہمیشہ نفرت رہی مگر میں ان کے بغیر جی بھی نہیں سکتا ہوں۔ اس لئے ان سے نفرت کرتے ہوئے بھی میں ان کو اس ڈھنگ اور سادگی سے استعمال کرتا ہوں کہ ان کی اماں حوا کو بھی خبر نہیں ہوتی ہے، چھوکریوں کے استعمال کرنے کا گر تو امریکی برطانوی اور فرانسیسی آقاؤں کو آتا ہے اور یہ راز کی بات کہتا ہوں کہ حوا کی بیٹیوں کو استعمال میں لانے کے معاملے میں میں ان آقاؤں کا سند یافتہ شاگرد ہوں!

میں آوارہ گردوں کا سرغنہ بھی ہوں۔ مطلب یہ کہ اتنی پوزیشن
انک اور ذمہ داری کا بوجھ لئے ہوئے بھی ابھی تک کالج کی آزاد
ندگی کو بھولا نہیں ہوں۔ اس لئے جب کبھی طبیعت میں اس کے
ئے ابال محسوس کرتا ہوں تو چند آوارہ خیال دوستوں اور محبوباؤں
ے ساتھ نت نئے شہروں کے بڑے بڑے شاندار باروں، ہوٹلوں
رکوں اور تاریخی مقاموں کا چکر لگا لیتا ہوں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
میرے ساتھ صرف ایک دوست یا کوئی چھوکری ہوتی ہے۔

ایسے آوارہ دنوں کا ذکر ہے ــــــ؟

میں برسوں ایک مشہور شہر کے ایک شاندار سے بار کے صحن میں
یک میز کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ میری ایک منظور نظر محبوبہ
تی جو شہر کے ایک رئیس اعظم کی صاحبزادی کہلاتی ہیں ہم دونوں
انی طالب نظر آرہے تھے، کافی کا دور چل رہا تھا، بار نئی تہذیب
مدن کے نمائندوں سے جو بن پر تھا۔ آرکسٹرا کی دھن پہلے دیسی
لتی رہی مگر اب امریکی دھن کھڑکی کے رنگین پردوں سے الجھ
ہی تھی۔

میری میز ایک ایسی جگہ پر تھی جہاں سے میں بار میں ہر آنیوالے
آسانی سے دیکھ رہا تھا۔ اب کی جب مری نگاہ دروازہ پر پڑی
میں ٹھٹھکا چونکا، ایک اچھے اور قد و قامت والا دبلا پتلا گھبرایا ہوا سا
جوان بار میں داخل ہو رہا تھا، میں اسے پہچان رہا تھا اسکے کانوں
ک جھولتے ہوئے بڑے بڑے بال، کھلی ہوئی پیشانی ستوان
ئے گول سی ناک غلافی آنکھیں اور سانولا سلونا رنگ۔ ارے
تو نوری تھا۔ ایک لکھ پتی گھرانے کا نوری، لیکن اپنے لکھ پتی باپ
ا باغی جس نے ہمیشہ اپنے باپ کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی
صول کی مخالفت کی اور انہیں ہمیشہ دیس کے لاکھوں انسانوں
قاتل ٹھہرایا ـــ اور نوری کا سراپا میری نگاہوں میں ناچ گیا اس اثنا
نوری صحن کے بیچ میں آکر گھبرائے ہوئے انداز میں کوئی کرسی
اش کر رہا تھا۔ نوری کو اس کے مسلک کی رو سے یاد رکھوں یا نہ رکھوں

مگر اسے اس خیال سے ضرور یاد رکھوں گا کہ وہ کالج میں ذہین ترین
طالب علم تھا۔ میں لپک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے اپنی میز
پر لا بٹھایا۔ وہ مجھے پہچانتے ہی گلے لپٹ گیا۔ ہم برسوں کے بعد ملے
تھے۔ برسوں کے بعد میں نے کچھ کھانے کے لئے کہا مگر اس نے انکار کیا۔
کافی کا آرڈر دینا چاہا تو بولا، یار! تم اپنے لئے دیتے ہو تو دے لو۔
مجھے چھوڑو۔ میں تمہاری پیالی کی بقیہ کافی پیئے لیتا ہوں، وقت نہیں
ہے، مجھے جلدی جانا ہے یوں بھی ہم برسوں کے بعد ملے ہو۔ تمہارے
منہ سے لگی ہوئی یہ کافی ہماری پرانی دوستی کو تازہ بنائے گی۔ میں اس کی
باتیں سنکر مسکرایا۔ میری محبوبہ بھی مسکرائی اور ہم دونوں کو مسکراتے
دیکھ کر نوری بھی مسکرایا۔

نوری کی آدھی پشت دروازے کی طرف تھی اس لئے وہ جھکے
جھکے انداز میں باتیں کرتے اور کافی پیتے وقت کنکھیوں سے دروازہ
کی طرف نگاہ اٹھا لیتا تھا۔ جب نوری کی پیالی میں دو تین گھونٹ کافی
رہ گئی تھی تو اسی درمیان تین شریف آدمی دروازہ میں داخل ہوئے
تینوں میرے جانے پہچانے ہوئے تھے ان میں سے ایک خفیہ پولیس
کا افسر تھا اور دوسرے دونوں ان کے ساتھی تھے، تینوں کچھ دیر تک
صحن کا عقابی نگاہوں سے جائزہ لیتے رہے لیکن شاید صحن میں کوئی میز
خالی نہیں تھی اس لئے واپس چلے گئے ان کے جانے کے کچھ ہی منٹ
بعد نوری اٹھ کھڑا ہوا جس کا مجھے گمان بھی نہیں تھا اور بولا جانِ من!
مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے اجنبی کی طرح نہیں مل سکا مجھے معاف کرنا
اب وقت بالکل نہیں رہا۔ مجھے یہاں سے جانا ضروری ہے۔ لیکن
پیارے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے اس بار بہت جلد ملوں گا اور چلتے
چلتے یہ پوچھ گیا کہ میں ان دنوں کہاں رہتا ہوں اور کس دنیا میں رہتا
ہوں میں اپنا پتہ تو دے دیا لیکن اپنی دنیا کے بارے میں کہا کہ جب تم
پھر ملوگے تو بتاؤں گا۔ اور وہ دوسرے دروازہ سے آن کی آن میں
غائب ہو گیا اس کے جاتے ہی یکایک مجھے اخبار کا وہ نمبر یاد آ گیا جس
کے ایک صفحہ پر حال ہی میں کسا نوری کی گرفتاری کا وارنٹ چھپا تھا کہ وہ

قطعہ

ہوتے ہوتے صبح ستارے کانپ گئے
منزل تک پہنچے بھی نہ تھے اور ہانپ گئے
بزم میں کس خورشید لقا کی آمد ہے
تاریکی میں رہنے والے بھانپ گئے

(وامق جونپوری)

نوری بھی تو نہیں تھا۔ یہ خیال آتا تھا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا ایک جال پھیل گیا مجھے مسکراتے دیکھ کر میری محبوبہ بھی مسکرائی لیکن میری مسکراہٹوں میں ایک جال تھا اس کی مسکراہٹوں میں میری دنیا بھر کی بے بسی اور مجبوری تھی ——— میں نے دل ہی دل میں کہا نوری! تم اب بھی بڑے ذہین اور چالاک ہو، اور تمہاری ذہانت اور اداکاری کا اب بھی قائل ہوں۔ لیکن کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم وہی نوری ہو جس کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہوا ہے اور جو اپنے جیسے ساتھیوں کے ساتھ "میری دنیا" کی بنیادوں میں سرنگ لگا رہی ہے،
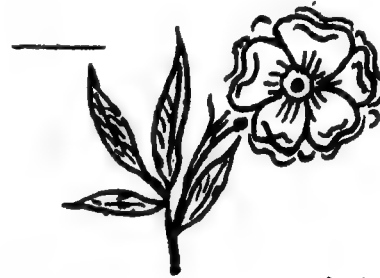
تو ——— ؟
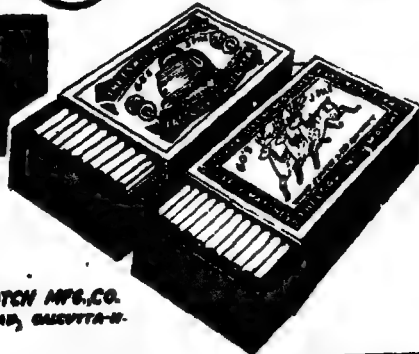
اشک امرتسری

خط کا جواب

(۱)

آج تخئیل کی دنیا سے مجھے کام نہیں   شاعری کی مئے و مینا سے مجھے کام نہیں
نجد او ہام کی لیلےٰ سے مجھے کام نہیں،   کسی عذرا کسی سلمےٰ سے مجھے کام نہیں

موجِ طوفاں کی طرح طبع رواں ہے بے تاب
اپنے محبوب کے خط کا مجھے لکھنا ہے جواب

آج وہ حسن غزلخواں بھی ہے برہم بھی ہے   آج وہ زلفِ پریشاں بھی ہے پُرخم بھی ہے
آج وہ روحِ غزل مرثیۂ غم بھی ہے   آج وہ جانِ وفا قہرِ مجسّم بھی ہے

نامۂ شوق میں شکووں کا کھلا ہے دفتر
الٹی سیدھی سی لکیریں ہیں کہ تیر و نشتر

سختیاں سہنے کا جس نے دیا یارا مجھ کو   جس نے طوفاں میں دکھایا ہے کنارا مجھ کو
ہر قدم پر ہے دیا جس نے سہارا مجھ کو   آج پھر دور سے ہے اس نے پکارا مجھ کو

آہ اب شیشۂ دل چور ہوا جاتا ہے
زخم رِستا ہوا ناسور ہوا جاتا ہے

نہ ہوئی ہے نہ زر و سیم کی بارش ہو گی، رحمتیں ہونگی کسی کی نہ نوازش ہو گی
زندگی بھر یہی بے سود سی کاوش ہو گی، یہی محنت یہی سرمائے کی سازش ہو گی

یہی دنیا ہے تو انجامِ محبت معلوم
قدرِ فن کار کی افکار کی قیمت معلوم

حاصلِ جہد و عمل علم و ہنر کچھ بھی نہیں پرسشِ سنگ ہی تو قیمتِ گہر کچھ بھی نہیں،
دورِ صرصر میں ہوائے گلِ تر کچھ بھی نہیں رات ہی رات ہے دنیا میں سحر کچھ بھی نہیں،

تیرگی اور ہمہ گیر ہوئی جاتی ہے
زندگی موت کی تفسیر ہوئی جاتی ہے

بس بہت چھان چکے شہر و بیاباں آؤ وادیٔ موت میں کیا زیست کا امکاں آؤ
تم سے ہوگا نہ علاجِ غمِ دوراں آؤ اور بھی ہو گئیں آنکھیں مری ویراں آؤ

آؤ یہ زہرِ ہلاہل بھی گوارا کر لیں
چند دن اور ہیں مل جل کے گزارا کر لیں

نامۂ شوق ملا کوند گئی برقِ عتاب (۲) جس کا ہر حرف ہوا سازِ سخن کو مضراب
دل میں اک درد اٹھا ہو گئے نغمے بے تاب ایسی حالت میں لکھا جائیگا کیا خط کا جواب

ہے لفافہ میں جنازہ تری خودداری کا
پیٹتا ہے جو ڈھنڈورا مری ناداری کا

میرے محبوب یہی وقت ہے وقتِ عبرت ختم ہو جاتی ہے جب قلب و نظر کی وسعت
پست ہو جاتی ہے اربابِ ہنر کی ہمت ذہن ہو جاتے ہیں مرعوبِ شکوہِ دولت

تیرگی دوزخِ سرمایہ کے در کھولتی ہے
خواجگی دہر پہ چھا جانے کو پر تولتی ہے

شری پرولا چندر سین وزیر کو آپریٹو و سپلائی

ڈاکٹر آر احمد
وزیر زراعت مغربی بنگال

سر دھیرین مترا شریف آف کلکتہ

بجلیاں صحنِ گلستاں سے اُلجھ جاتی ہیں   آندھیاں بادِ بہاراں سے اُلجھ جاتی ہیں
ظلمتیں مہرِ درخشاں سے اُلجھ جاتی ہیں   لعنتیں رحمتِ یزداں سے اُلجھ جاتی ہیں

صُورتِ حال سے انکار نہیں ہے مجھ کو
ہاں مگر قوتِ بازو پہ یقیں ہے مجھ کو

میں زر و سیم کی عظمت کا نہیں ہوں قائل   میں امارت کی شرافت کا نہیں ہوں قائل
میں جہالت کی فضیلت کا نہیں ہوں قائل   خوبی۔ و۔ شومیٔ قسمت کا نہیں ہوں قائل

میری دولت مری محنت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری جاگیر محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں

اور میں سعیٔ مسلسل سے گریزاں تو نہیں   اپنی ناکامیٔ پیہم سے پریشاں تو نہیں
ہوں تو افلاس کی زد میں پہ ہراساں تو نہیں   اُجڑے گلشن میں بھی مایوسِ بہاراں تو نہیں

میں عنادل کو غزل خواں تو کئے جاتا ہوں
دل کے داغوں سے چراغاں تو کئے جاتا ہوں

میری اس شعلہ نوائی پہ نظر ہے کہ نہیں   یہ تگ و تاز بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں
یہ شبِ تار عناں گیرِ سحر ہے کہ نہیں   اس حقیقت کی مری جان خبر ہے کہ نہیں

سحرِ سرمایہ سے فرعون خدا بنتا ہے
حُسنِ تدبیر سے موسیٰ کا عصا بنتا ہے

جانِ من شیوۂ تسلیم و رضا کچھ بھی نہیں   اثرِ نالہ و تاثیرِ دعا کچھ بھی نہیں
صبر کا پھل ثمرِ آہ و بکا کچھ بھی نہیں   زندگی جہدِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

جب عمل داخلِ اقدارِ جنوں ہوتا ہے
عزمِ انساں بدل کُن فیکون ہوتا ہے

مولانا حفظ الرحمن ممبر پارلیمنٹ

ہندستان ایک غیر مذہبی جمہوریہ کیوں ہے

آج کی دنیا میں اگر آپ مختلف ممالک اور حکومتوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو طرح طرح کے نظام حکومت نظر آئیں گے، ان میں سے کچھ تاریخ کے پچھلے دوروں کی یادگار ہیں۔ اور کچھ انسان کے فکر جدید کے نتائج ہیں۔ ہر ملک کے باشندوں نے اپنے حالات اور اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ایک خاص قسم کا نظام حکومت اختیار کیا ہے، اور اسی کی بنیادوں پر وہ اپنی حکومت کا نظم ونسق چلا رہے ہیں۔

پچھلا دور اگر حاکمیت (ڈکٹیٹرشپ) اور شہنشاہیت کا دور تھا تو آج "جمہوریت" کو بہترین طرز حکومت سمجھا جاتا ہے

ہمارا ملک "ہندستان" کم وبیش ڈیڑھ سو سال کی غلامی کے بعد ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا، تو آزادیٔ وطن کے ساتھ ساتھ سب سے پہلا، اہم اور بنیادی سوال جو ہمارے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ہم آزاد ہونے کے بعد اپنی حکومت کس ڈھنگ سے چلائیں گے' یا' بالفاظ دیگر، اپنے لئے کون سا اور کیسا نظام حکومت پسند کریں گے۔

یہی وہ سوال تھا جس کے حل کرنے کے لئے پورے ملک کے نمائندوں کی ایک مجلس "مجلس دستور ساز" یا "کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی" بٹھائی گئی۔ اور اس نے ڈھائی، تین سال کی مسلسل محنت کے بعد اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ایک بہترین حل مرتب کیا، یہی آزاد ہندستان کا "دستور" یا "کانسٹی ٹیوشن" ہے

ہم نے اس دستور میں اپنے وطن کے لئے "غیر مذہبی عوامی جمہوری طرز حکومت" کو پسند کیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر دستور کی تمام تفصیلات مرتب کی ہیں۔

ہندستان جیسے عظیم الشان ملک کے لئے کسی خاص طرز حکومت کا انتخاب کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمارے دور اندیش اور دانشمند رہنماؤں نے مجلس دستور ساز میں بیٹھ کر بہت طویل غور وفکر اور بہت زیادہ کاوش اور دماغ سوزی کے بعد پورے ملک کے حالات کا جائزہ لے کر اور اس کی گذشتہ تاریخ وروایات کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آزاد ہندستان کے لئے وہی نظام حکومت بہتر اور کامیاب ہو سکتا ہے، جس کی بنیاد غیر مذہبی عوامی جمہوریت پر قائم ہو، اس لئے کہ حقیقت میں ہمارا یہ ملک زمین کی ایک جغرافیائی حد بندی اور انسانوں کا ایک جنگل ہی نہیں بلکہ دستِ قدرت کا سجایا ہوا ایک گلدستہ اور ایک شاہکار ہے۔ ایک چمنِ طرفہ بہار اور ایک مرغزار ہے، جس میں ہر رنگ وبو، ہر آن وشان، ہر ذوق ومزاج کے پھول کھل رہے ہیں۔ اور اپنی دلفریبی اور دلآویزی سے، اپنی اہک اور مہک سے، اور اپنے رنگ وبو سے اس چمن زرنگار اور باغ سدا بہار کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ ؎

گلہائے رنگا رنگ سے زیب اس چمن کو ہے

یہ وہ ملک ہے جس میں مختلف مذاہب وملل، رنگ ونسل، ذوق وفطرت، تہذیب وتمدن کے انسان آباد ہیں، جو آج یا کل سے نہیں، بلکہ صدیوں سے آباد ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمین کی خاک ان کا

خیر بن چکی ہے ، اور وطنیت کے لازوال رشتہ نے ان کو باہم شیر و شکر کر دیا ۔

ہندستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے آثار و روایات کو دیکھئے : امرتسر کا دربار ، مغربی ہند کے پیرتھ اور آتشکدے آگرہ کا تاج ، دہلی کی جامع مسجد ، اور قطب مینار ۔ بنارس و ہردوار کے گھاٹ سانچی ، ایلورا اور اجنتا کے آثار ، اس ملک کی " قدرتی اور لازوال جمہوریت " کے وہ نشانات ہیں جن میں ہمارے ماضی اور مستقبل دونوں کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے ، اور جو اپنی زبان حال سے اس ناقابل انکار حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ اس ملک کے مزاج کو صرف "غیر مذہبی جمہوریت " ہی کی ہوائیں راس آسکتی ہیں اور اس باغ کی بہار جب ہی قائم رہ سکتی ہے ، کہ اس کا دستور چمن بندی مذہب و دھرم کے تعصبات اور رنگ و نسل کے امتیازات سے پاک و صاف ہو ۔ "

پھر اس حقیقت کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ ہندستان کی آزادی ابنائے وطن کی ایک طویل اور جانبازانہ جدوجہد کا ثمر خوشگوار ہے جس میں سرزمین ہند پر بسنے والے ہر فرقہ ، ہر مذہب ، ہر رنگ و نسل کے بہادر قدردانِ وطن نے ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لیا ہے ۔ اور اپنے خون سے نونہالِ آزادی کی آبیاری کی ہے ۔

پس جمہوریت اور قومی اتحاد ہماری تاریخ وہ سرمایہ اور شہیدانِ وطن کی وہ یادگار ہے جس کو ہم ہمیشہ اپنے سینہ سے لگا کر محفوظ رکھیں گے ۔ "

یہ تمام حقیقتیں قدرتی طور پر اس فیصلہ کا اعلان کر رہی ہیں ، کہ اس ملک کے لئے جہاں مختلف مذاہب و ملل کے انسان صدیوں سے وطن کے " شہری " اور " سٹیزن " کے طور پر آباد ہیں " غیر مذہبی جمہوری نظام " سے بہتر کوئی دوسرا نظام ہو ہی نہیں سکتا

ایک ایسے ملک میں اگر کسی خاص مذہب و مزاج کی حکومت قائم ہو تو دوسرے مذاہب کے افراد ہمیشہ اس خطرہ میں رہیں گے کہ ملک کے سیاسی ، سماجی اور اقتصادی حقوق میں وہ مذہبی حکومت صحیح طریق کار اختیار کرتی ہے یا نہیں ۔

نفسیاتی طور پر ایسی غیر مطمئن زندگی ملک کے باشندوں کے درمیان صحیح اتحاد ، رواداری اور یکجہتی کبھی پیدا نہیں کر سکتی ۔

اسی طرح اگر فاسزم کی بنیادوں پر کوئی تسلطائی نظام قائم کیا جائے تب بھی یہ خطرہ بدستور قائم رہتا ہے کہ ڈکٹیٹر شپ ملک کے مختلف مذاہب اور کمیونٹیز کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہ ہونے دے گی

اسی طرح نسل و خاندان کے امتیازات یعنی کاسٹ سسٹم کی بنیادوں پر ، یا ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں میں باہم کسی امتیازی سلوک پر کوئی نظام حکومت قائم کیا جائے تو ظاہر بات ہے کہ ایسا نظام بھی سب کے لئے قابل اطمینان نہ ہوگا ۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وطن کی سچی محبت جو کسی قومی زندگی کی روح ہوتی ہے برقرار نہ رہ سکے گی ۔

اس لئے ایسے ملک میں اکثریت و اقلیت کے لئے اور بالخصوص اقلیت کے لئے وہی نظام قابل اطمینان ، مفید اور موزوں ہو سکتا ہے ۔ جس میں ملک کے سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور دوسرے بنیادی حقوق کا معیار بلا کسی امتیاز و تفریق کے صرف " شہریت " ہو ۔ اور جو تمام باشندگان ملک کے لئے یکساں طور پر فلاح و بہبود کا ضامن ہو ۔

آج کی مروجہ اصطلاح میں ایسے ہی نظام سے وابستہ حکومت کو " سیکولر ڈیموکریٹک اسٹیٹ " یا " عوامی جمہوری ریاست " کہا جاتا ہے ۔ ایسے نظام کے تحت کسی حکومت کے سیکولر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ مذہب کی مخالف یا حریف ہے ، بلکہ مطلب یہ ہے ، کہ حکومت کا کاروبار اور نظم و نسق کسی خاص مذہب کے اصولوں پر قائم نہ ہوگا ۔ اور اس حکومت کے سایہ میں مذہبی ، نسلی اور تمدنی امتیاز کے بغیر ملک کے ہر باشندہ کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے

مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

یقیناً یہ بڑے فخر اور بہت خوشی کی بات ہے، کہ ہم نے اپنے نظام حکومت کے لئے اسی بہترین راہ کو اختیار کیا ہے۔ اور آزاد ہندستان کو "سیکولر ڈیموکریٹک اسٹیٹ" قرار دیا ہے۔

مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ جس منزل تک ہم پہونچے ہیں، وہ ہماری کامیابی کی پہلی اور ابتدائی منزل ہے۔ اور آج ہم سب کے لئے ازبس ضروری اور ملک کے ہر باشندہ کا یہ فرض ہے کہ اپنے وطن کی عزت کو دوبالا کرنے، اور دنیا میں اس کی شان اور وقار کو بلند سے بلند کرنے کے لئے صرف اس بات پر فخر کرکے نہ بیٹھ جائیں۔ کہ ہم نے ایک ایسا بہترین دستور مرتب کیا ہے، جو دنیا کے بڑے بڑے ماہرین دستور کی نظر میں بھی ایک بہترین دستور اور بہترین نظام حکومت شمار کیا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم سب خواہ حکومت کے ارکان و افراد ہوں، یا عوام، دوسرا قدم بھی اٹھائیں اور دنیا کو اپنے کردار و عمل سے یہ دکھلائیں کہ اس ملک کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں، بلکہ ہر ہر کوچہ و بازار عملی طور پر سیکولر اسٹیٹ، یا غیر مذہبی جمہوریت کا ایک نمونہ ہے۔ جہاں ہر فرقہ، ہر مذہب، ہر رنگ اور ہر نسل کے انسان اقلیت و اکثریت کے امتیاز کے بغیر شہری حقوق سے یکساں طور پر بہرہ مند ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے، کہ جس طرح ہم نے ایک غیر مذہبی جمہوری دستور مرتب کرکے اپنی صاف دماغی اور کاوش فکر کا ایک بہترین نتیجہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اور دنیا کے باوقار آزاد ملکوں کی صف میں اپنی جگہ بنائی ہے، اسی طرح آج ہمیں اپنی قومی اور شہری زندگی میں بھی عملاً مساوات، و رواداری کی وہ مثال پیش کرنی ہے جس سے سیکولرزم اور ڈیموکریسی کا صحیح تصور ہماری صبح و شام اور روزمرہ کی زندگی میں بھی چلتا پھرتا نظر آئے اور شہری مساوات و جمہوریت کے نقوش سرزمین ہند کے چپہ چپہ پر ابھرے ہوئے نظر آئیں۔
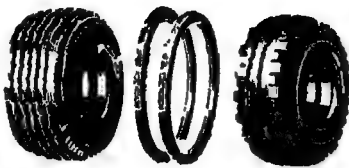
اختر انصاری اکبر آبادی

یہ زندگی ہے تو لطفِ بہار کیا آئے
نظر میں عالمِ برق و شرار کیا آئے

جہاں سے روٹھ کے دامن کشاں سی گذری ہو
اُسی چمن میں پلٹ کر بہار کیا آئے

کیا تباہ تمہارے حسین وعدوں نے
تمہاری بات کا اب اعتبار کیا آئے

ہر انتظار کا انجام ہے فریبِ جدید
تو دل کو لطفِ غمِ انتظار کیا آئے

تری نگاہ کا انداز دیکھتا ہوں میں!
دلِ تباہ کو میرے قرار کیا آئے

لگا کے آگ بہاروں میں تھک چکی بجلی
قریبِ غمکدۂ شاخسار کیا آئے

ابھی تو میں قدِ ساقی پہ ہوں نثار اختر
ابھی زباں پہ مری ذکرِ دار کیا آئے

جناب نصیر احمد ہاشمی ایم۔اے

حیدرآباد کی قدیم اور جدید سواریاں

آج سے ۲۰۰ برس پہلے شہر حیدرآباد موسی ندی کے جنوب میں ایک فصیل کے اندر آباد تھا۔ اس کی وسعت زیادہ نہیں تھی، اور نہ راستے کشادہ تھے، بلکہ عام طور سے چھوٹی چھوٹی گلیاں ہوتی تھیں جن میں سواری کا آمد و رفت بھی دشوار ہوتی، پھر گئی جو آج اپنی کشادگی اور اعلےٰ شان عمارات کے باعث ان شہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج سے پہلے پتھر کے فرش کی تنگ گلی تھی۔ صرف ہاتھی، گھوڑے رتھ یا میانے کی سواریاں نظر آتی تھیں۔ عابد روڈ جو آج شہر کا مرکز ہے، ایک چھوٹا راستہ تھا۔

اگر ہم آج سے ۲۰۰ سال پہلے کی سواریوں پر نظر ڈالیں، تو واضح ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں بھی دو قسم کی سواریاں تھیں، ایک عام اور دوسری خاص، خاص سواریاں امرا، رؤسا اور جاگیرداروں سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ یہ عموماً ہاتھی ہوتے تھے، یا پھر قیمتی گھوڑے، بالوچہ عام سواریوں میں رتھ، پالکی اور میانے کا استعمال کیا جاتا تھا جو محض صرف نام کی صراحت سے کوئی تفصیلی وضاحت نہیں ہو سکتی اس لئے ہم ہر ایک سواری کا حال مختصر سناتے ہیں، تاکہ دلچسپی کا موجب ہو سکے۔

ہاتھی عموماً امیروں اور جاگیرداروں کے پاس ہوتے تھے جس طرح آج کل موٹریں صاحب حیثیت اور دولتمند اصحاب کے شان کے مطابق ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگلے زمانے میں ہاتھی دولت اور امارت کی نشانی ہوتا تھا۔ مگر ہاتھی کے اوپر سواری کے مختلف طریقے تھے۔ یعنی مختلف اشیاء اس کے اوپر باندھے جاتے تھے۔ جس سے سواری کی سہولت ہوتی تھی۔ سب سے قیمتی اور شاندار صورت عماری کی ہوتی تھی۔ یہ صرف وہ امراء اور جاگیردار استعمال کرتے تھے جن کو بادشاہ وقت کی جانب سے عماری کی عطا بلحاظ شان امارت اور اعزاز دی جاتی تھی۔ عماری عموماً سرخ بانات سے منڈھی ہوتی تھی۔ یہ قبہ نما سایہ دار مسند ہوتی تھی، جس میں دو یا چار اشخاص آگے پیچھے بیٹھا کرتے تھے، لکڑی، لوہا، روئی اور بانات وغیرہ سے یہ بنائی جاتی تھی۔ اور ہاتھی کے اوپر مضبوط رسیوں سے کس دی جاتی تھی۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ستون ہوتے تھے جن میں پردے لگائے جاتے تھے، ہاتھی کی سب سواریوں میں یہ آرام دہ اور شاندار ہوتی تھی۔ ہاتھی کے اوپر دوسری چیز ٹاپ کہلاتی تھی جو ایک آرام کرسی نما چمڑے کی ٹاپ کی آرام دہ نشست ہوتی تھی۔ یہ انگریزوں کی ایجاد تھی۔ اکثر انگریز اس قسم کی سواری میں سوار ہوتے تھے۔ ہماری یاد تک لنگر کے موقع پر پندرہ سولہ عماری نشین امیر تھے، اور ٹاپ کی سواری میں کوتوال وقت، اکبر جنگ اور سلطان یار جنگ بیٹھا کرتے تھے، ہاتھی کی تیسری سواری صوفہ نما سیٹ ہوتی تھی۔ جو ہاتھی پر کس دی جاتی تھی۔ اور دونوں طرف صوفہ کرسیوں کی طرح ایک سے زیادہ اشخاص وقت واحد میں سوار ہوتے تھے ہاتھی کی ایک اور سواری ہودہ کہلاتی تھی، یہ بھی لکڑی کا ایک چوکھٹا ہوتا تھا۔ جس میں وقت واحد میں پانچ اشخاص بیٹھ سکتے تھے شادیوں کے جلوس کے موقعہ پر اکثر نوبت نواز اسی سواری میں سوار کئے جاتے تھے، جو نوبت خانے جاتے ہوئے جلوس کے ساتھ

ہوتے تھے۔ ہاتھی کی ایک ادنیٰ سواری، اس کی پیٹھ پر سواری ہوتی تھی، یعنی ایک بڑی جھول ہاتھی پر ڈال دی جاتی تھی۔ اور ایک کے پیچھے ایک چار یا پانچ اشخاص سوار ہوتے تھے، قدیم شادیوں کے جلوس میں براتی اور مہمان اس طرح جاتے تھے، اور طوائفیں کو بھی اس طرح سوار کیا جاتا تھا، غرض کہ ہاتھی کئی طرح سے سواری کے کام آتا تھا اور زیادہ سے زیادہ چھ سات آدمی وقت واحد میں اس پر سوار ہو سکتے تھے، ہاتھی کے ساتھ اونٹ بھی سواری کے کام آتا تھا، مگر یہ سواری عام نہیں ہوتی تھی، بلکہ فوج کے لئے اونٹ اور سانڈنی سوار کا استعمال ہوتا تھا۔

تیسری سواری گھوڑے کی تھی۔ گھوڑوں کو طرح طرح کے زیورات پہنائے جاتے تھے، عموماً "خوگیر" اس پر باندھی جاتی تھی۔ زین کا استعمال بھی انگریزوں کے زمانہ میں ہونے لگا۔ گھوڑا نہ صرف ہر فوجی آدمی کے پاس ہوتا تھا، بلکہ خوش باش اصحاب بھی گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، حتیٰ کہ بعض صاحبان علم اور اصحاب فکر و دانش بھی گھوڑے کی سواری کرتے تھے، ضرورت سے کہیں جانا ہو تو گھوڑا استعمال کیا جاتا تھا۔

ہاتھی گھوڑے کے بعد سواری کے لئے بیلوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جو رتھ میں باندھے جاتے تھے، رتھ کی سواری اس زمانہ میں نہ صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھی، بلکہ بعض مرد بھی رتھ میں سوار ہوتے تھے۔ رتھ تمام تر لکڑی سے بنائی جاتی تھی۔ اور اوپر سایہ کے لئے کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لئے دھوپ میں تو پوری طرح آرام مل جاتا تھا، مگر شدت بارش میں رتھ کام نہیں دیتی تھی، اضلاع اور دیہات میں بنڈی اور کھاچر استعمال کئے جاتے تھے۔ بنڈی کی بہ نسبت کھاچر، جو سایہ دار اور آرام دہ ہوتی تھی، زیادہ کام میں لائی جاتی تھی۔ اب تک بھی بعض دیہات میں کھاچر دستیاب ہو سکتے ہیں کھاچر کے لئے مضبوط بیل استعمال کئے جاتے تھے، قدیم سواریوں میں پالکی میانہ، اور بوچہ کا ذکر بھی ضروری ہے، لہذا سلسلہ وار ہم ہر ایک تعارف کراتے ہیں۔

پالکی کو عموماً چار آدمی اپنے کندھے پر اٹھایا کرتے، اس میں عموماً دو شخص سوار ہوتے۔ چاروں طرف سے یہ کھلی ہوتی، لکڑی اور بانس سے یہ بنائی جاتی۔ نواڑ یا سُتلی، یا بان سے اس کے نیچے کا حصہ، جو بیٹھنے کے لئے ہوتا بنایا جاتا۔ اکثر ہندو دولہا دلہن کے لئے یہ کام میں لائی جاتی ہے۔ اور عام طور سے عورتوں کی سواری کے لئے کام میں آتی تھی۔

میانہ۔ اس کو بھی چار یا چھ بھوئی کندھے پر اٹھایا کرتے تھے۔ پالکی سے زیادہ شان دارا ور امارت کی نشانی ہوتی تھی، اس میں زیادہ تر لکڑی کا استعمال ہوتا۔ چاروں طرف سے لکڑی سے یہ بند کیا جاتا دونوں جانب دروازے ہوتے، جو کھل اور بند ہو سکتے، بیٹھنے کے لئے بید یا نواڑ وغیرہ یا لکڑی کا فرش ہوتا۔ روئی کے گدے نرمی کے لئے بچھائے جاتے تھے۔ اور عمدہ فرش کر دیا جاتا تھا ایک زمانہ دراز تک سرکاری عہدہ دار میانہ کی سواری میں آتے جاتے تھے۔ بعض مرتبہ اعزاز کے طور پر میانہ بھی سرکار کی جانب سے عطا ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں چھ یا آٹھ بھوئیوں کی تنخواہ حکومت کی جانب سے ملتی تھی۔

بوچہ کی سواری میانہ اور پالکی سے زیادہ شاندار اور اہمیت رکھتی تھی، اس کو بھی چھ یا آٹھ بھوئی اپنے کندھے پر اٹھایا کرتے تھے، اس کو بھی چھت ہوتی تھی۔ اور آرام دہ سواری سمجھی جاتی تھی یہ عموماً حکومت کی جانب سے بطور اعزاز ملتی تھی۔ بادشاہ اور امراء بھی اس میں سوار ہوتے تھے، بوچہ کو کرسی نما میانہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن پردہ کا انتظام میانہ میں پوری طرح ہوتا تھا، بوچہ زنانہ سواری کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ اس کے بعد کا زمانہ وہ آتا ہے، جبکہ مختلف قسم کی گاڑیوں کا استعمال ہونے لگا، تاریخ دکن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے، کہ پہلے پہل سنہ ۱۱۹۶ھ میں انگریزی سفیر کی جانب سے حضور کو گاڑی کا تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جب انگریزوں

کی آمد زیادہ ہونے لگی، تو گاڑیوں کی برآمد بھی ہونے لگی، اور پھر وہ زمانہ آیا جب کہ ہندوستان، اور حیدرآباد میں ہر قسم کی گاڑیاں بننے لگیں گاڑیاں مختلف قسم کی مختلف نام کی ہوتی تھیں۔ جن ناموں سے ہم واقف ہیں۔ ان کی یہاں صراحت کی جاتی ہے۔ پالکی، بروہام، ہاف لینڈو، فیٹن۔ لینڈو۔ نیٹن، ڈاک کاٹ، ٹانگہ، جوڑ گراؤ گاڑی وغیرہ۔ ان گاڑیوں میں ایک گھوڑا، دو گھوڑے، اور چار گھوڑے باندھے جاتے تھے۔ اور ٹٹو اور باہو کا بھی استعمال ہوتا تھا یہ گاڑیاں مختلف سائز اور مختلف نہج کی ہوتیں، مثلاً لینڈو کو چمڑا کا ٹاپ ہوتا، جو اتارا جا سکتا تھا۔ پالکی اور بروہام کو لکڑیوں کا چھت ہوتا جو اتارا نہیں جاتا۔ فیٹن، اور ڈاک کاٹ کو یک طرفہ چھت ہوتا ہے ٹانگہ کا چھت لکڑی کا ہوتا اور اتارا نہیں جاتا تھا۔ گاڑیوں کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ جن کا نام اس وقت طوالت کا موجب ہے، حیدرآباد میں گاڑی سواری نہایت کروفر سے استعمال ہوتی رہیں۔ امراء اور رؤسا کی گاڑی کے آگے اور پیچھے سوار ہوتے، جو ان کے اعزاز کو ظاہر کرتے تھے۔ امراء اور رؤسا کی سواری کے ساتھ ان کے حاشیہ نشین اور ملازم دوسری گاڑیوں میں ساتھ ہوتے تھے، لینڈو اور بروہام فیٹن، وغیرہ کرایہ سے ملتے تھے۔ اب صرف نام باقی رہ گیا ہے

جس وقت لینڈو، بروہام، نیٹن، وغیرہ گاڑیوں کا تذکرہ ہو اس کے ساتھ جھٹکہ کا نام نہ لینا سخت غلطی ہوگی۔ جھٹکہ حیدرآباد کی عام اور سستی ارزاں سواری تھی۔ جو عورت اور مرد دونوں کے استعمال میں آتے۔ جھٹکہ اس کا نام اس لئے رکھا گیا تھا۔ کہ اس میں بیٹھنے والوں کو راستے میں دھچکے کھانے پڑتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ عام طور سے جھٹکہ ہی سواری کے لئے دستیاب ہوتا تھا۔ متوسط طبقات کے لئے یہی سواری تھی۔ عورتیں بہت زیادہ تعداد میں سوار ہوتی تھیں ایک ایک جھٹکہ میں جہاں صرف چار مرد کی گنجائش ہوتی وہاں آٹھ آٹھ۔ دس دس عورتیں سوار ہو جاتی تھیں، جھٹکہ کی سواری کے ساتھ شکرام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جو حیدرآباد کی ایک قدیم سواری ہے، اور اب تک باقی ہے۔ عموماً دو بیل اس میں باندھے جاتے، اور لکڑی کی یہ آرام دہ سواری دس دس، بارہ، بارہ، پندرہ، پندرہ سواریوں کو لے کر میلوں مسافت طے کرتی تھی۔

شمالی ہند کے یکے بہلی اور ڈولی کا رواج حیدرآباد میں نہیں ہوا۔ اس کی بجائے جو سواریاں یہاں عام اور خاص تھیں ان کی صراحت ہو چکی ہے۔

حیدرآباد میں موٹر سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۰۵ء میں آئی، جب کہ کنگ جارج پنجم بحیثیت پرنس آف ویلز حیدرآباد آئے تھے، عام اشخاص میں سے سب سے پہلے راجہ صاحب ورہسرتی نے موٹر خریدی تھی، جس کو ڈریان کہتے تھے، اس کے بعد حیدرآباد کے کئی شوقین امراء اور پھر سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں نے موٹر خریدی ۱۹۱۱ء تک بھی جب کوئی موٹر راستہ سے گزرتی، تو پولیس کانسٹبل ایک سیٹی دیا کرتا تھا۔ تاکہ راستہ کے لوگ موٹر سے خبردار ہو جائیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے حیدرآباد میں ۱۹۰۵ء میں موٹر آئی یعنی مہذب ترین سواری کا آغاز ہوا تھا۔ مگر اس کے ساتھ کنگ موصوف کی سواری کا ایک دلچسپ حال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی حیدرآباد میں موصوف نے زیادہ تر موٹر میں سواری کی۔ مگر جب شکار کے لئے ورنگل کے ضلع کو گئے، تو وہاں راستے میں ایک نالہ دوگز کا عریض حائل تھا، اس نالہ سے پار ہونے کے لئے جناب کنگ کو مہذب ترین سواری سے بدل کر انسانی پیٹ پر سوار ہونا پڑا تھا۔ جمعدار مرتضیٰ کی گردن اس سواری کے لئے کام میں لائی گئی تھی، اس موقعہ کا فوٹو سر افسر الملک نے ان کے بادشاہ ہونے کے بعد گنڈیوں میں نصب کر کے تحفتاً ارسال کیا تھا۔

حیدرآباد کی عام سواری جھٹکہ ایک عرصہ تک کارآمد رہا۔ مگر اس کے بعد ٹانگہ نے اس کی جگہ لے لی۔ جھٹکہ والے جو اپنی سوفیانہ کلامی اور سخت گیری سے بدنام تھے، انہوں نے ٹانگہ والوں کی حیثیت

اختیار کرلی۔

موٹر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ گاڑیاں معدوم ہونے لگے، نہ تو لینڈو نظر آتے ہیں، نہ بروہام۔ فیٹن کی صورت نظر آتی ہے، نہ ڈاگ کارٹ کی۔ بہر حال موٹروں نے ہر قسم کی سواری کو معدوم کردیا ہے۔

بعض پرانے نواب موٹر کی سواری کے ساتھ بھی اپنی امتیازی سواری رکھتے تھے۔ نواب شہاب جنگ کا نام اس سلسلہ میں خاص طور پر لیا جائے گا۔

حیدرآباد کی قدیم سواریوں کا حال پیش کرنے کے بعد موجودہ سواریوں کا تذکرہ ضروری ہے، اس وقت ذرائع حمل و نقل اور سواریوں کے لئے ہوائی جہاز بھی ہے، موٹر بھی۔ موٹر بس بھی، تو موٹر لاری بھی غرض یہ کہ ہمہ اقسام کے موٹر آج کل کی سواریوں میں اہم حیثیت رکھتے ہیں ان موٹروں کے ساتھ موٹر سائیکل رکشا بھی حیدرآباد کی سواریوں میں شامل ہے۔ موٹروں کے ساتھ گاڑیاں معدوم تو نہیں ہوئیں، کہیں کہیں بعض گاڑیاں نظر آجاتی ہیں۔ جو پرانی نشانی اور پرانی روایات کی حامل نظر آتی ہیں۔

اس وقت حیدرآباد کی عام پبلک سواری، سائیکل رکشا ہے یا پھر سائیکل، ان کی تعداد کئی ہزار سے اونچی ہے۔ حیدرآباد میں جسقدر سائیکل اور سائیکل رکشا استعمال کی جاتی ہیں شاید دنیا کے کسی اور ملک میں اس قدر تعداد نہ ہو۔

رکشا کے ساتھ کچھ ٹانگے بھی ہیں، جو پرانی وضع پر قائم ہیں۔ ٹانگہ کے ساتھ شکرام بھی پائی جاتی ہے، دوسری سواریاں معدوم ہو چکی ہیں، ان کے نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ یہ واقعہ کہ ایک صاحبزادے جن کے خاندان میں عماری کا امتیاز تھا، انہوں نے اپنے بزرگ خاندان سے دریافت کیا تھا کہ عماری کیسی ہوتی ہے۔

حیدرآباد کی سواریوں کے متعلق یہ مختصر مضمون لکھدیا گیا ہے شاید آج سے بعد ان سواریوں کے جاننے والے بھی معدوم ہو جائیں گے اور کتابوں میں تذکرہ رہ جائیگا

غزل

وامق جونپوری

کہیں ساقی کا فیض عام بھی ہے
کسی شیشے پہ میرا نام بھی ہے

گوارہ تلخ جام زہر احساس
کہ صحت کا یہی اک جام بھی ہے

نوائے چنگ و بربط سننے والو
پس پردہ بڑا کہرام بھی ہے

وہ نغمے جن سے دل ہو جائے مغموم
انہی میں اک شکست جام بھی ہے

نہ ہوں مایوس شام غم کے مارے
کہ ہر آغاز کا انجام بھی ہے

محبت کی سزا ترک محبت
محبت کا یہی انعام بھی ہے

نظام کائنات عشق ہے یہ،
کہ جو ہے نامور ناکام بھی ہے

نگاہ شوق ہے گستاخ لیکن
نگاہ شوق کچھ بدنام بھی ہے

بہت بیزار ہیں وہ ہم سے وامق
مگر ہم سے انہیں کچھ کام بھی ہے

فراق گورکھپوری

رباعیاتِ فراق

(۱)

دنیا ہے فسانہ بحدیثِ دگراں
کہتے آئے ہیں جس کو عنواں عنواں
دنیا کس کی غلط بیانی ہے فراق
ہر جھوٹ میں جس کے صد حقائق پنہاں

(۲)

اے شیخ مآلِ زہد و تقوے معلوم
دنیا ہی نہ ہاتھ آئی تو عقبے معلوم
انکار ہے ماسوائے اللہ سے تجھے
خاموش کہ ماسوائے دنیا معلوم

(۳)

ہر مذہب و تہذیب کے یہ شہپارے
کتنے اچھے ہیں کتنے پیارے پیارے
زندہ ہیں تو زندگی کو بدلیں گے فراق
زندہ درگور زندگی کے مارے

(۴)

رقصِ سیارہ ہائے رخشاں رخشاں
چکر کھاتے ہوئے پلٹنے کا سماں
آواگون اس نظامِ شمسی کو تو دیکھ
اک سلسلۂ زیر و بم بے پایاں

(۵)

دیکھو وہ افق کے تھرتھراتی ہیں بھنویں
لیتی ہیں جماہیاں ستاروں کی لویں
اے زندہ دلانِ عشق جاگو جاگو
پھوٹیں لبِ ناز سے تبسم کی پویں

صالحہ عابد حسین

"حد چاہیے سزا میں ......"

ڈاکٹر کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ دماغ پر کوئی ایسی کاری ضرب لگی تھی جس نے اسے کام کرنے سے معذور کر دیا تھا اور وہ تین دن سے مکمل بے ہوشی کی حالت میں بستر پر پڑی تھی۔

چھوٹی بچی روتے روتے بے حال ہو چکی تھی۔ سندر اور راجی ماں کے ... کمرے کے پاس آتے اور دروازے سے جھانکتے۔ اور ماں کو دیکھتے ہی ان کی ہچکی بندھ جاتی، پکوان اور مٹھائیاں جھک مار رہی تھیں۔ کھلونے بے بسی سے اپنے مالکوں کو تک رہے تھے مگر بچوں کا دل ماں کے اندر اٹکا ہوا تھا۔ جانے ماں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو کبھی لیٹتی نہ تھیں؟ بخار آتا تھا تب بھی کام کرتی رہتی تھیں؟ اب وہ اٹھتی کیوں نہیں؟ بولتی کیوں نہیں؟ بہت سے سوال ان کے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں ابھرتے اور ڈوب جاتے۔

لیلا کی اپاہج ساس دو دن سے بے کھائے پیئے بہو کے پاس بیٹھی رام نام جپ رہی تھیں۔ اگر ان کی لاڈلی بہو کو کچھ ہو گیا ہو؟ اس خیال سے لرز جاتیں، بھلا ان کی بہو جیسی خدمت کون کرے گا؟ بچوں کون پالے گا؟ شیش کا کیا حال ہوگا؟ شیش جس کی جان بیوی کے اندر بستی ہے، نندیں ویسے بھاوج سے کتنا جلتی ہوں مگر آج اسے بیمار دیکھ کر گھر بھر میں بیقرار پھر رہی تھیں اسے ایشور ہماری بھابی کو اچھا کر دے۔۔ اگر ان کو کچھ ہو گیا تو؟

اور یہ "تو" گھر کے ہر فرد کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ بچے، ساس نندیں، پڑوسی اور نوکر سب پریشان تھے کہ لیلا کے بغیر اس گھر کا اس خاندان کا کیا ہوگا؟ وہ اس گھر کی روح رواں تھی، اس کو اور اس کے گھر کو تصور میں بھی ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا "ماں جی، ان کے پتی کو آپ فوراً بلوا لیجیے، ان کی حالت اچھی نہیں ہے" اور یہ سنتے ہی بوڑھی ساس نے اپنے سر پر ایک دو تھپڑ دے مارا "ہے ہے میری بہو" وہ روتے روتے بولیں بیٹا اسے تو تار گیا ہوا ہے، پر وہ تو مدراس میں ہے، ہے ہے میرے بچے کا کیا حال ہوگا اس کے بغیر۔ وہ تو بیوی پر جان دیتا ہے"

ڈاکٹر نے تسلی دینے کی کوشش کی "ماں جی بھگوان پر بھروسہ رکھیے مگر ان کے پتی کو ضرور تار دے دیجیے۔ میری رائے میں آپ ڈاکٹر ترمزی کو ضرور بلوا لیں، ان کی فیس زیادہ ہے مگر وہ بہت تجربہ کار اور ہوشیار ڈاکٹر ہیں...... ممکن ہے وہی کچھ کر سکیں"

ماں جی نے جلدی سے کہا "ارے بیٹا تم فوراً جاؤ اور خود ان کو لے آؤ۔ فیس کی فکر نہ کرو۔ تمہاری ان کی سب فیس شیش آکر ادا کر دے گا اسکی تو جان لیلا میں اٹکی ہے، وہ تو اس کے نام کا دیوانہ ہے وہ سب کچھ اس پر نچھاور کر دے گا۔ ہے ہے بہو کو کچھ ہو گیا تو بس شیش زندہ نہ بچے گا"

ڈاکٹر فوراً ہی باہر کی طرف لپکا اور شانتی نے آگے بڑھ کر ماں کو تسلی دی، ماں اب بھابی ضرور اچھی ہو جائیں گی۔ یہ ڈاکٹر ترمزی تو بھابی کے پتا جی کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ بھابی انہیں چاچا جی کہتی ہیں۔ بڑے اچھے ڈاکٹر ہیں" ماں بولیں۔ بھگوان انہیں کے ہاتھ سے میری بہو کو اچھا کر دے، اور پھر وہ تیزی سے منہ منہ میں دعائیں پڑھنے لگیں۔

ڈاکٹر ترمذی نے بڑی مشکل سے اپنی مدد کرتی ہوئی بوڑھی بیٹھ بیٹھی کی۔ ماتھے پر چمکتے ہوئے پسینے کو رومال سے پونچھا اور آرام کرسی پر گر پڑے۔ سب لوگ آس اور یاس کے ساتھ کئی گھنٹے سے ان کو دیکھ رہے تھے اور ان کی نظریں مریضہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ ان کی آخری کوشش تھی۔ اگر اس دوا نے اثر کیا تو لیلا بچ جائے گی ورنہ — ورنہ ....

بہت آہستہ آہستہ نامعلوم سی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر زندگی کے آثار ابھرے، بے رنگ گالوں پر نامعلوم سی سرخی جھلکی اور لمبی سیاہ پلکوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔

ڈاکٹر نے جھک کر پکارا "لیلا ..... لیلا بیٹی ....." پلکوں کی حرکت تیز ہو گئی۔ "چنی — چنی بٹیا" لیلا نے آنکھیں کھول دیں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں — پر کتنی دہشت تھی ان آنکھوں میں جیسے زخمی ہرنی شکاری سے خائف کہیں جائے پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔ اس نے گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر سر گھمایا، آتشدان پر ستیش کی قد آدم تصویر مسکرا رہی تھی۔ لیلا کی نظریں اس پر رکیں ..... ایک لمحے کے لئے پتلے ہونٹوں میں مسکراہٹ کا دلکش خم پیدا ہوا، آنکھوں میں نرمی کی لہر ابھری مگر پھر فوراً منہ سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور اب وہ پھر بیہوش تھی

ستیش مدراس سے واپس گھر آیا تو چہرے پر بے خوابی اور وحشت کے آثار تھے، وہ بدحواس بیوی کے کمرے میں گھسا اور اس کی حالت دیکھ کر سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا ڈاکٹر سے بولا "چاچا جی! آخر اسے ہوا کیا ہے؟" "میں خود نہیں جانتا بیٹا ..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک کوئی سخت شاک (Shock) اس کے دماغ کو پہنچا ہے وہ سہار نہ سکی" ڈاکٹر نے کہا" لیلا بچ تو جائے گی نا؟" ستیش نے کہا "موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے، بہر حال میں مایوس نہیں ہوں اگر کسی طرح ایک بار پھر اسے ہوش آ جائے اور صدمے کے اثرات کسی طرح کم کئے جائیں تو اس کا بچ جانا ممکن ہے"

"اُف ..... اُف ..... یہ میرے پاپوں کی سزا ہے یہ میرے گناہوں کا دوش ہے جو معصوم لیلا کو بھگتنا پڑ رہا ہے" ستیش پاگلوں کی طرح زور زور سے اپنے بالوں کو نوچ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے سمجھا بجھا کر اسے کمرے سے باہر بھیجا اور خود پھر مریضہ کے پلنگ کے پاس آ کھڑے ہوئے جس کا چہرہ اب پہلے جیسا بے حس نہ تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور میٹھے سُر میں پکارا "چنی .. میری چنی بٹیا —" چنی لیلا کا پیار کا نام تھا جو صرف اس کے پتا جی لیتے تھے، لیلا کتنی چڑتی تھی اس نام سے؟ اور ساتھ ہی اسے کتنا پیارا تھا یہ پیارا نام جس میں باپ کی ساری محبت سموئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

اور شاید اس نام اور لہجے کا جادو تھا کہ لیلا کی آنکھیں دھیرے سے کھلیں، ہونٹوں کی خفیف سی جنبش ہوئی "پتا جی .... پتا جی" ڈاکٹر نے پیار سے اس کا سر سہلایا "چنی بیٹی میں ہوں تمہارا چاچا ...." لیلا کتنی دیر تک غور سے ڈاکٹر کو دیکھتی رہی، جیسے کوئی بھولی بات یاد کر رہی ہو، آنکھوں کی دہشت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ "چاچا جی" "ہاں بیٹی میں ہوں تمہارا چاچا۔ اب تمہارا جی کیسا ہے؟ چاچا جی — پتا جی — پتا جی —" اس کی آواز میں محبت، درد اور فرزندانہ محبت کا ایسا گہرا جذبہ تھا کہ ڈاکٹر کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ لیلا نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ڈاکٹر ترمذی نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اس کا سبب بیہوشی نہیں کمزوری ہے۔

ستیش دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ بے رنگ "لیلا میری جان۔ خدا کے لئے کچھ بولو" لیلا نے آنکھیں کھولیں، ایک منٹ تک وہ بے حس نظروں سے ستیش کے چہرے کو تکتی رہی اور پھر وحشت و نفرت کا ایک سیلاب ان میں موجیں مارنے لگا اس کا پتلا زرد ہاتھ جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور ستیش کے جھکے چہرے کو ہٹا کر بستر پر گر پڑا "جاؤ — جاؤ" ایک گھٹی ہوئی بھیانک آواز غرّاہٹ کے ساتھ اس کے گلے سے نکلی۔ "چلے جاؤ"

ڈاکٹر ترمذی گھبرا کر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور ستیش کو دھکا دیتے ہوئے بولے "جاؤ ستیش خدا کے لئے باہر چلے جاؤ ورنہ اس کا ہارٹ فیل

ہو جائے گا" ستیش دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگا اور ڈاکٹر پورے انہماک سے اپنے مریض کو ہوش میں لانے کی تدبیر میں لگ گئے۔

اب پھر کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد لیلا کو ہوش آیا ہے مگر اس کی آنکھوں میں وہ رنج و غم کا جو اتھاہ ساگر لہریں مار رہا تھا اسے دیکھ کر ڈاکٹر کانپ گیا۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کھلنڈری سی خوش باش خوش دل لڑکی جو زندگی کی ہر چیز سے لطف اٹھانا جانتی تھی جو ہر حال میں زندگی سے سمجھوتہ کرنے کے سنہری اصول پر کاربند رہی تھی۔ جس نے بڑے سے بڑے صدمے اور سخت سے سخت مشکل کو حوصلے کے ساتھ سہارا تھا۔ جسے اپنی ذات پر اور اس عزت و محبت پر اعتماد تھا جو اسے حاصل تھی جو اپنے شوہر کی عاشق زار تھی اور اس محبت پر نازاں جو اس کا شوہر اس سے کرتا تھا، جسے اپنے گھر، بچوں اور اپنی زندگی سے گہرا پریم تھا آج وہ کون سا شدید صدمہ اسے پہنچا ہے جس نے اس کا یہ حال کر دیا؟ جب ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر میں مشغول تھے تو ان کے دماغ میں اس قسم کے ان گنت سوال آ رہے تھے۔

یقین کرنے کے بعد کہ اب لیلا پورے ہوش میں ہے انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "چنی بیٹی۔ تمہارے دل کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے، میں تمہارا معالج ہوں۔ اور تمہارا چاچا بھی۔ تمہارے باپ کا سب سے گہرا اور قریبی دوست۔ کیا مجھ سے اپنے دل کا حال نہ کہو گی؟" وہ جلد سے جلد لیلا کے دل سے صدمے کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔

"آہ چاچا جی میں کیا کہوں کچھ نہیں۔ میرے لئے بس اب موت کے سوا کوئی چارہ نہیں، میں زندہ رہنا نہیں چاہتی" لیلا کے منہ سے جو الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے وہ لفظ نہیں اس کے دل کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے "میری بچی ایسی بات نہ کہو مجھے بتاؤ تو سہی کہ آخر وہ کیا صدمہ ہے کہ جس نے تمہارا یہ حال کر دیا؟"

کچھ دیر تک لیلا ایک کشمکش کے عالم میں ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے اپنے راز سے آگاہ کرے یا نہ کرے پھر اس نے اپنی قمیص کے اندر سے ایک مڑا تڑا پسینے سے بھیگا کاغذ نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دیا۔ "چاچا جی اب۔ اب میری عزت آپ کے ہاتھ ہے"۔ اور اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

ڈاکٹر ترمذی نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور لیلا کو ایک نیند کا انجکشن دے کر اس کا اثر دیکھنے لگے، آخر جب نیند کی دیوی نے لیلا کی آنکھوں پر اپنا افسوں پھونکا اور کچھ دیر کے لئے اس کے دل سے غم کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا اور گھر جانے کے لئے باہر آئے وہ دو دن سے اس طرح لیلا کے کمرے میں بغیر کھائے پیئے نہائے اور آرام کے موت کے فرشتے سے لڑنے میں مصروف تھے۔

لیلا کو ہوش میں آئے پانچ دن ہو چکے۔ اس کے دماغ کی حالت جیسے جیسے بہتر ہو رہی ہے جسم کی طاقت اتنی ہی گھٹتی جا رہی ہے وہ کسی سے نہ بولتی ہے نہ ان کی طرف دیکھتی ہے، چھت پر نظریں جمائے کسی سوچ میں گم رہتی ہے۔ ڈاکٹر ترمذی اگر کچھ پوچھتے ہیں تو اس کا جواب آنکھ یا سر کے اشارے سے دے دیتی، ساس نند، یا نوکر حال پوچھتے تو آنکھیں بند کر لیتی، بچے دو تین آئے، لیلا نے انہیں دیکھا تو آنسوؤں کا ریلا سا نکلا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں باہر جانے کو کہا اور پھر دیر تک اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی رہی ایک بار ڈرتا ڈرتا ستیش کمرے میں داخل ہوا تو لیلا نے فوراً آنکھیں بند کر کے دیوار کی طرف کروٹ لے لی اور نرس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے آئندہ کمرے میں آنے سے منع کر دیا۔

ڈاکٹر ترمذی دن میں دو بار اسے دیکھنے آتے اور حال احوال پوچھ کر چلے جاتے تھے۔ لیلا کے کچے زخم کو چھیڑنے سے ڈرتے تھے۔ مگر ایک دن انہوں نے ستیش سے تنہائی میں ایک گھنٹے تک باتیں کیں جب ڈاکٹر ترمذی اس کے کمرے سے نکلے تو ڈاکٹر کا چہرہ سنجیدہ تھا اور ستیش کا سر جھکا ہوا آنکھیں سرخ اور چہرہ سفید۔

ڈاکٹر ترمزی نے پکارا "چنی بیٹا۔ میں کب سے آیا بیٹھا ہوں اور تم آنکھیں تک نہیں کھولتیں" لیلا نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں اور ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھنے لگی جیسے پوچھتی ہو کیا ہے؟

ڈاکٹر:- چنی تم بولتی کیوں نہیں؟ بیٹا مجھ سے تو بولو، دل کھول کر باتیں کرو، یہ تمہاری صحت کے لئے اشد ضروری ہے۔

لیلا:- (آہستہ سے) میرا بولنے کو جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر:- مگر اس خاموشی کا اثر تمہارے دل اور دماغ پر مضر پڑ رہا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا چاہئے نہیں تو میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہوں۔

لیلا:- میں زندہ رہنا نہیں چاہتی چاچا جی۔

ڈاکٹر:- بیٹی زندگی خدا کی امانت ہے اس کو ٹھکرانا کفران نعمت کرنا ہے، انسان تو وہی ہے جو مشکلوں اور مصیبتوں میں ہمت نہ ہارے اور ان سے مغلوب نہ ہو۔

لیلا:- انسان — انسانیت — کیا ابھی تک اس کا وجود دنیا میں باقی ہے؟

اس کے لہجے میں ایسا طنز، ایسی حقارت، اتنی کاٹ تھی کہ ڈاکٹر تلملا اٹھا۔

ڈاکٹر:- یہ تم کیا کہہ رہی ہو چنی؟

لیلا:- چاچا جی۔ آپ مجھے چنی نہ کہئے، مجھے اس نام سے پتا جی یاد آتے ہیں، وہ آدرش یاد آتے ہیں جو انہوں نے مجھے سکھائے تھے۔ زندگی کی وہ قدریں، اخلاق کی وہ بلندیاں جنہیں وہ انسانیت کی جان اور انسان کی روح کہا کرتے تھے۔ آہ مجھے کیا کیا یاد نہیں آتا۔

ڈاکٹر:- یہ صفات تو انسان کے لئے امرت ہیں ان کو یاد رکھنا ہی چاہئے بیٹی۔

لیلا:- نہیں چاچا جی، اب میں اس دھوکے میں نہیں رہ سکتی میں اس سراب سے نکل جانا چاہتی ہوں — انسانیت — اخلاقی قدریں — انسان اُف — یہ سب دل بہلاوا ہے، جھوٹی تسلیاں۔

انسان اب بھی وحشی ہے۔ درندہ ہے ...... لیلا کی دھیمی آواز چیخوں میں بدل گئی تھی۔

ڈاکٹر:- لیلا یہ باتیں تم کہہ رہی ہو، تم جیسی پڑھی لکھی عقلمند لڑکی جو زندگی کی کسی مشکل میں نہیں گھبرائی اور اب۔ اب ...

لیلا:- اب۔ اب میرا عقیدہ پاش پاش ہو گیا ہے میرا ایمان ڈگمگا گیا ہے، میرا وشواش اٹھ گیا ہے، اس دنیا پر سے، اس انسان پر سے، اور انسان کے خالق پر سے میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔

ڈاکٹر:- تمہیں اپنے بچوں کا بھی خیال نہیں؟

لیلا:- بچے۔ ڈاکٹر تم مجھے کیوں جلاتے ہو؟ یہ میرے بچے نہیں سانپ کے سپنولئے ہیں۔ میں ان کے لئے زندہ رہوں؟ انہیں پالوں پوسوں؟ تاکہ یہ لڑکا کل کو معصوم لڑکیوں پہ ڈاکہ ڈالے! ان بچیوں کو جوان کروں کہ کسی انسان نما درندہ کی حیوانیت کا شکار بنیں۔ نہیں نہیں مجھے مر جانے دو۔ مجھ پر تمہارا سب سے بڑا یہی احسان ہوگا

ہاں شاید اس طرح تم اپنے ہم جنسوں کی بربریت کا کچھ کفارہ کر سکو آہ کاش اب میں اور میرے بچے دنیا میں نہ رہیں۔

اور یہ کہتے کہتے لیلا اس طرح بلک بلک کر روئی جیسے اس کی ساری جان آنسوؤں میں بہہ جائے گی، ڈاکٹر ترمزی جیسا تجربہ کار ڈاکٹر ایک بے بس بچے کی طرح گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ کیا کرے کیسے اس انسان اور انسانیت سے مایوس ہستی کو اس کا کھویا ہوا عقیدہ ٹوٹا ہوا وشواش واپس دلائے، وہ لپک باہر گئے اور لیلا کی سال بھر کی بچی کو لا کر اس کے سینے پر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد سارے غصے اور نفرت کے باوجود وہ لیلا کی بازوؤں کی سخت گرفت میں تھی۔

رفتہ رفتہ لیلا کی سسکیاں دھیمی پڑتی جا رہی تھیں بچی کے گرم و نرم جسم کے لمس اور محبت پاش نظروں نے اس کے ٹیکتے ہوئے پر مرہم کا پھاہا رکھ دیا تھا۔

اور دو دن بعد ڈاکٹر ترمذی پھر لیلا کے کمرے میں بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ لیلا دکھ بھری آواز میں آہستہ آہستہ بول رہی تھی

"چاچا جی! آپ جانتے ہیں میں نے جس دنیا میں آنکھ کھولی، جو تعلیم و تربیت پائی اس میں نیک چلنی اور عفت کے جذبے کو سب سے بلند درجہ دیا جاتا تھا۔ اسے انسانیت کا لازمی جز سمجھا جاتا تھا میں دنیا کا ہر گناہ معاف کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتی تھی سوا اس ایک جرم کے۔ مگر عمر اور تجربہ کے ساتھ میں نے یہ بھی سیکھا کہ دنیا میں سب جیسے نہیں ہوتے۔ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی پھر بعض وقت ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں، کچھ ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ آدمی کا قدم ڈگمگا سکتا ہے۔ ہاں میں نے برے سے نہیں برائی سے نفرت کرنا سیکھ لیا۔ میں نے جانا کہ سچے دل سے پشیمانی ہر گناہ کے دھبے کو مٹا سکتی ہے مگر۔ مگر چاچا جی! برائی کے بھی تو مدارج ہوتے ہیں بدچلنی بری چیز ہے.... مگر شیطانیت۔ اف اس کو کیسے معاف کروں میں جب ایسے واقعات پڑھتی یا سنتی تھی یقین نہ آتا تھا کہ کوئی شریف انسان اس قسم کے جرم کا ارتکاب کر سکتا ہے میں یہ کہہ کر دل کو سمجھاتی تھی کہ اگر اس دنیا میں برے لوگ ہیں تو پھر اونچے اخلاق کے انسان بھی ہیں اور ان اونچے انسانوں میں مجھے سب سے زیادہ شردھا اپنے پتی کی عصمت پروری پر تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ ساری دنیا بگڑ جائے تب بھی ستیش۔ آہ ستیش کا قدم نہ ڈگے گا پھر افسوس میری عقیدت و ایمان کا پہاڑ ایک جھٹکے سے پاش پاش ہو گیا۔ کاغذ کا یہ پرزہ ایٹم بم کی طرح گرا۔ اور میری زندگی کے عقیدوں میں میری خوشیوں کو خاک میں ملا گیا۔ میرے مستقبل کو تاریک کر گیا۔ میں اس کو جھوٹ لیکر اپنے کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں اس کی لکھنے والی کو جانتی ہوں کہ وہ جھوٹی نہیں، اور پھر کون ماں اپنی بچی کے لئے ایسا جھوٹ بول سکتی ہے اور ستیش کے چہرے پر گناہ کی جو سیاہی چھائی ہوئی ہے کیا وہ خود ساری داستان نہیں سنا رہی!

ڈاکٹر ترمذی:۔ مگر ستیش سخت پشیمان ہے اس نے اپنا حال تباہ کر رکھا ہے۔ بیٹی انسان ہی سے تو خطا ہوتی ہے۔ پر سچی پشیمانی کو تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔

لیلا:۔ وہ کسی طوائف کے پاس جاتا، کوئی عورت اس پر عاشق ہو جاتی اور وہ اس سے تعلقات قائم کر لیتا۔ شاید اس وقت میں اسے معاف کر دیتی۔ لیکن ایک نو عمر، کنواری شریف زادی پر حملہ کرنا آہ چاچا جی یہ ایسا گناہ ہے جو ایشور بھی شاید اپنے سارے رحم و کرم کے باوجود نہیں معاف کرے گا۔ اس گناہ کا بس ایک ہی کفارہ ہے اور وہ ہے میری جان۔ آپ ہی کہئے کیا اب میں کبھی کسی کے سامنے سر اٹھا کر چل سکتی ہوں! کبھی وہ فخر اور عزت خود اپنے دل میں محسوس کر سکتی ہوں جو مجھے اپنی ذات اور اپنی قسمت پر تھی نہیں... نہیں ذلت کی اس زندگی سے عزت کی موت لاکھ درجے بہتر ہے میں۔ میں دنیا میں رہنا نہیں چاہتی۔ جب۔ جب ستیش جیسا آدمی اتنا گر سکتا ہے تو پھر میں دنیا میں کس کا اعتبار کروں! نہیں مرد۔ سب مرد ایسے ہی ہیں کسی کا عیب کھل جاتا ہے کسی کا ڈھکا رہتا ہے۔ سب عورت کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس دنیا میں عفت، عصمت۔ وفا بے معنی الفاظ ہیں۔

ڈاکٹر:۔ لیلا تمہارے پتی نے تم سے بے وفائی کی۔ بڑی ذلیل حرکت کا اقدام کیا۔ تم اسے لعنت ملامت کرنے کا حق رکھتی ہو۔ لیکن نہیں اس کا کوئی حق نہیں کہ دنیا کے سب مردوں کی عفت و وفا پر شک کرو اور۔ انسان کی انسانیت سے شرافت اور اخلاقی صفات سے منکر ہو جاؤ، یہ گمراہی کی بدترین شکل ہے، جب انسان کی وشواش انسان اور اس کے خالق پر سے اٹھ جائے وہ دونوں جہاں میں کچھ سکون نہیں پا سکتا یہ گناہ اس گناہ سے بھی زیادہ بڑا ہے!"

لیلا:۔ چاچا جی! چاچا جی..... اس کی آواز میں حیرت، شکایت، غم، اور درد کی پکار تھی۔

ڈاکٹر:۔ تم کہتی ہو میں نے گنہگار کے بجائے گناہ سے نفرت کرنا سیکھا تھا مگر کیا یہ دوسروں ہی کے لئے تھا جب خود تم پر پڑی تو تم نفرت اور مایوسی کا شکار ہو گئیں! کیوں اب بھی تم صرف گناہ سے نفرت نہیں

کرتیں؟ کیوں اپنے بیٹی کو خرید نا ہی سکے گڑھے میں گرنے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ یہ اس کی پہلی غلطی ہے.....

لیلا: (بات کاٹ کر) کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کی پہلی غلطی ہے۔ کیا معلوم وہ اس سے پہلے کیا کچھ نہیں کر چکا۔ اگر یہ اطلاع مجھے نہ ملتی تو میں اب بھی تاریکی میں رہتی اور وہ اپنے منہ پر کالک لگاتا رہتا.....

ڈاکٹر: نہیں۔ لیلا نہیں۔ خواہ مخواہ بدگمانی نہ کر۔ اور پھر اب تو وہ سچے دل سے پشیمان ہے

لیلا: تو پھر وہ خودکشی کیوں نہیں کر لیتا.... کیا اس گناہ کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہا ہے؟

ڈاکٹر: اس کا گناہ اپنی جگہ پر کتنا بڑا سہی مگر نہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ خدا کے لئے اس لڑکی کو بچا لیا اور ستیش سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ اور پھر ایک برائی کا ازالہ دوسری برائی سے نہیں ہوا کرتا۔ وہ یا تم خودکشی کر لوگے تو یہ گناہ کا کفارہ نہیں دوسرا گناہ عظیم ہوگا۔ اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ وہ آئندہ پاک صاف زندگی گزارے اس وقت لوہا گرم ہے اس پر جو چوٹ پڑے گی کارگر ہوگی۔ ورنہ جب لوہا سخت ہوگیا۔ اس کا ضمیر مردہ ہوگیا تو وہ گناہ و تاریکی کے گہرے غار میں گر جائے گا.....

لیلا: اب اس سے زیادہ اور کیا گہرا غار ہوگا۔ اگر وہ نہیں مرنا چاہتا تو مجھے مر جانے دیجئے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔ اب۔

ڈاکٹر: لیلا۔ تم اتنی کج فہم ہو!

لیلا: میں کج فہم سہی مگر اپنے دل سے ان اخلاقی اصولوں کو کیسے کھرچ کر پھینک دوں جو میری روح ہیں میری جان ہیں۔

ڈاکٹر: تم صرف کج فہم ہی نہیں۔ مغرور اور خود پرست ہو۔ ورنہ تم جن اصولوں پر جان دینے کا دعویٰ کرتی ہو وہ تمہیں عفو کے معنی بھی سکھاتے یہ بتاتے کہ برائی کو معاف کر دینا کتنا عالی ظرفی کا کام ہے۔ تمہیں تو اس کا غم ہے کہ تمہارے غرور کا سر نیچا ہو گیا۔ اس لئے کہ پہلے تم ہر اس عورت کو حقارت اور رحم کی نظروں سے دیکھتی تھیں جس کا شوہر باپ یا بھائی بد چلن ہے! تم نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اس میں اس عورت کا کیا دوش ہے۔ آج تم اس ذلت سے بچنے کے لئے مر جانا چاہتی ہو۔ تمہیں نہ اپنے بچوں کی زندگی بگڑ جانے کا غم ہے نہ اپنے گھر کی بربادی کا نہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے صدمے کا احساس باقی ہے۔ تم صرف اپنے غرور کا پالن کرنا جانتی ہو۔

لیلا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر اس کے دل کے ٹپکتے ہوئے پھوڑے کو بے دردی سے نشتر سے چیر رہا ہے۔ اس کے دل میں درد و کرب کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور کلیجہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ترمذی کی یہ آخری کوشش تھی وہ باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بھی کنکھیوں سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ تلخ باتیں امرت بھی بن سکتی ہیں اور زہر بھی اسے مایوسی کے آخری درجے پر پہنچا کر لب گور بھی پہنچا سکتی ہیں اور امید کی کرن بن کر اس کے مایوس دل کو روشن بھی کر سکتی ہیں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھے۔ لیلا میں جا رہا ہوں.... پھر آؤں گا اور قبل اس کے کہ لیلا کچھ کہے۔ وہ جا چکے تھے۔

ساری رات لیلا ایک منٹ نہ سو سکی۔ ڈاکٹر کے نشتر نے پھوڑے کا گندہ مواد خارج کر دیا تھا اور اب درد کی ٹیس میں کمی ہونے پر اس کا دماغ سکون سے سوچنے کے قابل ہوا تھا۔ وہ رات بھر سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ بس سوچتی رہی اور صبح کو باوجود بے خوابی کے اس کے چہرے پر موت کی زردی اور مایوسی کی سیاہی کے بجائے زندگی کی سرخی اور امید کی چمک تھی۔ ڈاکٹر ترمذی نے اسے آکر دیکھا تو جیسے ان کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا اور انہوں نے دوڑ کر لیلا کو گلے لگا لیا۔

ستیش آج کچھ اپنے لئے پریشان تھا اور اس نے کچھ اس انداز سے لیلا سے معافی مانگی کہ اسے اپنا دل صاف کرتے ہی بنا اور اس طرح ستیش تباہ ہونے سے بچ گیا اس کی زندگی سنور گئی اس کا گھر اب سبزہ زار تھا اور لیلا اس کی روح رواں تھی اس کے بچے اعلیٰ تعلیم و تربیت کے

آل انڈیا مسلم کنونشن منعقدہ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۵۱ع کا پہلا اجلاس زیر صدارت سر سلطان احمد۔ جناب طیب بھائی ظریف
صدر استقبالیہ کمیٹی ایڈریس پڑھ رہے ہیں اور ایڈیٹر روزانہ ہند اس کے
جنرل سکریٹری تھے جو سر سلطان احمد کی داہنی طرف بیٹھے ہیں۔

”رومی“ دی سات سو سالہ برسی دی تقریب تے روزنامہ ہند دی طرف تے دتی گئی
ڈنر پارٹی جس دی صدارت [illegible] کر رہے نیں۔

نمونہ تھے، شوہر علمی اور سماجی زندگی میں اونچے درجے حاصل کر رہا تھا ستیش مدت ہوئی ماضی کے اس شرمناک واقعہ کو بھلا چکا تھا اور اپنی پاکبازی، شرافت اور بلند اخلاق پر نازاں تھا۔ اور لیلا بھی مطمئن اور خوش نظر آتی تھی۔ لیکن۔ لیکن۔ اس واقعہ کے بعد کبھی اس کے چہرے پر وہ دلکش مسکراہٹ نہ کھیل سکی جو اس کی شخصیت کا لازمی جز تھی اور اسکی آنکھوں کی گہرائیوں میں غم کی جو ایک لہر ہمیشہ کانپتی رہتی تھی اسے سوا ڈاکٹر ترمزی کے کسی نے نہ پہچانا

ایک شعر

نہ طورِ قلب و نگاہ بدلا نہ سمت لیل و نہار بدلی
یہ ایک گروش کی سلوٹیں ہیں فلک نے جو بار بار بدلی

جگن ناتھ آزاد

کب ہوا ممکن وہ حیوانوں کا حیوانوں کے ساتھ
یہ جو ہے برتاؤ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ

جہل کے طوفان میں دیوانگی کی لہر پر
میں نے دیکھے چند فرزانے بھی دیوانوں کے ساتھ

میں بتاؤں بھی تو میری بات کو پہنچے گا کون
کیا کیا فصلِ بہاراں نے گلستانوں کے ساتھ

جادۂ منزل! اب "اپنوں" سے تعلق کیا اسے
زندگی جس نے بسر کر دی ہو بیگانوں کے ساتھ

دامنِ فرزانگی میں نے نہ چھوڑا ہاتھ سے
میرا نازک وقت گزرا گرچہ دیوانوں کے ساتھ

ساتھ ارمانوں کے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا
دل نے پیمانِ وفا باندھا تھا ارمانوں کے ساتھ

پھر بھی قائم ہے مرا انسانیت پر اعتقاد
کچھ سہی برتاؤ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ

دید کے قابل ہوا کرتا ہے ساحل کا سکوت
جب سفینہ کوئی چل پڑتا ہے طوفانوں کے ساتھ

یہ جو ہیں اشعار میرے داستانیں ہی نہیں
کچھ حقائق بھی ہیں وابستہ ان افسانوں کے ساتھ

بتکدے میں برہمن! آزاد کو آنے نہ دے
ربط اس کافر کا ہے گہرا مسلمانوں کے ساتھ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

۳۶ - برس گزر چکے ۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی بے وقت وفات سے اردو دنیا اب تک سوگوار ہے ، وہ اپنی وفات کے وقت باغ اردو کے ایک گل نیم شگفتہ کی حیثیت رکھتے تھے ان کی نثر و نظم ، ادیبانہ کمال ، شاعرانہ اجتہاد ، تخیل کی بلند پروازیاں ، انسانیت کی غمگساریاں ابھی پوری طرح جلوہ گر نہ ہونے پائی تھیں ۔ خاص خاص لوگ ان خصوصیات سے واقف تھے اور توقع لگائے بیٹھے تھے کہ اردو ادب و شاعری میں ایک نیا ستارہ طلوع ہو رہا ہے اور منتظر تھے کہ کب آب و تاب سے چمکے گا اور اس کی فیض رسانی سے اردو کی دنیا کس کس طرح شگفتہ اور شادکام ہوگی کہ یکایک ۱۹۱۸ء میں اس جوان سال ادیب اور عالم و فلسفی کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا مولوی عبدالرحمٰن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ :-

> " ایسے جوہر قابل کا عین عالم شباب میں اٹھ جانا درحقیقت ایک قومی سانحہ تھا ۔ اس کا دل اور دماغ بہت لطیف اور نازک تھا ۔ وہ ایک نازک پودا تھا جو سموم زمانہ کی تاب نہ لا سکا اور وقت سے پہلے اس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا "

علی گڑھ کے بہترین طالب علموں میں ان کا شمار تھا اور بجنوری میں وہ تمام عمدہ خصوصیات حسن اتفاق سے جمع ہوگئی تھیں جو علیگڑھ کی تعلیم اور قیام سے کسی ایک شخص میں بہت کم جلوہ گر ہو سکی ہیں ۔

یہاں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ یورپ روانہ ہوگئے انگلستان ، فرانس ، جرمنی ، ترکی غرض اس دور کے جملہ اہم تہذیبی ملکوں اور مرکزوں کی سیر و سیاحت کی اور خاص کر جرمنی میں زیادہ زمانہ گزارا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے ۔

بھوپال کے نواب محمد حمید اللہ خاں اس وقت ولیعہد ریاست تھے اور بجنوری کے شفیق دوست اور قدرداں تھے ۔ بھوپال ہی میں مرزا غالب کے کلام کا ایک قدیم نسخہ ان کی نظر پڑا یہ نسخہ مرزا غالب نے بھوپال کے فوجدار خاں کو بطور نذر پیش کیا تھا ۔ اور اس میں ان کا وہ تمام کلام موجود ہے جس میں سے بعد کو بہت کچھ مرزا نے دوستوں کے کہنے سے نظرانداز کر دیا تھا اور یہ منتخب کلام دیوان غالب کے نام سے ان کی زندگی اور بعد کو چھپتا چلا آ رہا تھا لیکن جو اشعار قلم زد کر دیئے گئے تھے وہ بھی نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ مرزا کے خاص انداز بیان اور بلندی تخیل کی وجہ سے اردو شاعری کے شہکار سمجھے جا سکتے ہیں ۔ اسی خیال کے پیش نظر ڈاکٹر بجنوری نے اس اصل نسخے کی طباعت کے لئے بڑے بڑے سامان کئے ۔ اعلیٰ درجہ کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب کیا ۔ طباعت کے لئے بلاکوں کا خاص اہتمام کیا ۔ اشعار کی تشریح کے لئے چابک دست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش کی اور اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے اپنے دوستوں کو بھی شریک کار بنا لیا ۔

غرض اس کی تیاریوں کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ یکایک خود ڈاکٹر بجنوری چل بسے اور نظیر اکبرآبادی کے اس مصرع کو صحیح ثابت

کر گئے کہ

ع سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا۔

سارے کام رک گئے، ہر ایک پر سکتہ سا چھا گیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ان کے شفیق دوست نواب حمید اللہ خاں ہی کو خیال آیا اور انہوں نے مفتی انوار الحق ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال کو اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی مفتی صاحب نے اس کو جوں توں شائع تو کر دیا لیکن بالکل معمولی اردو کتابوں کی طرح جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ اس نسخہ حمیدیہ کے ساتھ مفتی انوار الحق نے جب ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے حالات شائع کرنے کی کوشش کی تو اس میں بھی انہیں بہت بڑی طرح ناکامی ہوئی چنانچہ وہ لکھتے ہیں

"افسوس ہے کہ تعلقات ظاہری کی ناپائیداری اور محبت ابنائے زمان کی بے ثباتی نے مرحوم کے انتقال کے بعد انکے احباب کو ان کی طرف سے اتنا تغافل شعار اور فراموش کار بنا دیا کہ سخت سعی و کوشش اور پیہم تقاضے اور یاد دہانیاں بھی ان کو مرحوم کے حالات قلمبند کرنے کی طرف مائل نہ کر سکیں"

اس سلسلہ میں مفتی صاحب نے ان کے بڑے بڑے دوستوں سے مراسلت بھی کی اور ڈاکٹر بجنوری کا مسودہ مقدمہ، دیوان غالب ان کے مطالعہ کے لئے روانہ بھی کیا اور بقول ان کے ڈاکٹر بجنوری کے یہ رشحات قلم مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک ان کے بعض دلی دوستوں کی میز سنیاں کے زینت افزا رہے لیکن کسی نے بھی ان کے متعلق تو معلومات قلمبند کیں اور نہ مفتی صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ یہاں تک کہ مرحوم کے والد ماجد نے بھی عدیم الفرصتی کے عذر کے ساتھ مفتی صاحب کو ٹال دیا۔

ایسی بے سروسامانی اور کس مپرسی کی حالت میں ڈاکٹر بجنوری کی وفات کے تین سال بعد مرزا غالب کا نسخہ حمیدیہ ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو گیا اور جس کتاب کو وہ شاہانہ طمطراق اور والہانہ اشتیاق کے ساتھ چھپوانا چاہتے تھے بالاخر نہیں کی ایک بے رونق اور سوگوار یادگار کے طور پر شائع ہوئی۔

اس مقدمہ نے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور اردو کے تنقید نگاروں کو ایک نئے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

"غالب کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا ان سے پہلے غالب پر طباطبائی اور حسرت کی شرحیں شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی حیثیت تنقیدی نہیں بلکہ تشریحی اور مکتبی۔ بجنوری مرحوم کے مقالے کا نتیجہ ہے کہ آجکل کے پڑھے لکھوں میں غالب سے شیفتگی پیدا ہوئی اور ارباب ذوق و فکر نے غالب ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے انداز تنقید سے جانچنا شروع کیا۔"

ڈاکٹر بجنوری کا انداز فکر ہی نہیں اسلوب بیان بھی نرالا اور مجتہدانہ تھا۔ وہ کسی چیز کو قوت اور شگفتگی سے بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ وہ محمد حسین آزاد کی طرح ڈرامائی کیفیت پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں بھی آزاد سے زیادہ آزادی اور بے باکی استعمال کرتے تھے۔

ان کے مقدمہ، دیوان غالب کا ابتدائی جملہ اردو ادب میں بے حد مشہور ہوا اور ہر مشہور چیز کی طرح تعریف اور مذمت دونوں کا نشانہ بنا رہا لیکن یہی ایک جملہ ان کے پورے مقدمہ دیوان غالب کا ایک اشاریہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے پورا مقدمہ اسی بے باکانہ اور فلسفیانہ اور والہانہ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ ابتدائی جملہ یہ ہے

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس، وید اور دیوان غالب اوراق سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔"

اس الہامی مقدمہ کی اشاعت کے قریب قریب بیس سال بعد

ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے فرزند محمد فاتح فرخ نے مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے ان کے مضامین نظم و نثر کا ایک مجموعہ باقیات بجنوری کے نام سے مرتب کر کے شائع کرایا ہے جس میں ان کے چند مضمون، خطوط اور نظمیں درج ہیں اس باقیات کا مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص اسلوب میں تحریر کیا ہے اور اس کی دوسری باتوں کو چھوڑ کر یہ بات بالکل ٹھیک لکھی ہے کہ۔

"مرحوم عظمت اللہ خاں بجنوری مرحوم ہی کی نظموں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ عربی فارسی کے متداول بحور و عروض سے آزاد ہو کر اپنے خیالات کو کم جذبات کو زیادہ مترنم بنانے میں دونوں کو لطف آتا تھا۔ لیکن دونوں میں جو بات مابہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ بجنوری روائتی ثقاہت و ثقافت اور متکبرانہ گرانمائیگی سے کبھی علاحدہ نہیں ہوتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کرتے تھے کہ کبھی کبھی رنگین الفاظ اور رقصاں ترکیبوں سے کھیل لیا کرتے تھے عظمت اللہ خاں جذبات کی نمائش یا مظاہرہ کرتے تھے بلکہ ان سے ایک طرح کی لذت یابی کے درپے رہتے تھے"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ خیال بالکل صحیح اور منصفانہ ہے کہ نثر اور نظم کی ان دو جدید تحریکوں کا سرچشمہ بجنوری مرحوم ہی میں ملتا ہے اگر بجنوری مرحوم کی نظمیں منظر عام پر آ جاتیں تو عظمت اللہ خاں کی نظمیں اس رنگ روپ میں شاید ہی ظہور پذیر ہوتیں۔

بجنوری اپنی نظموں کے عنوان اور موضوع بھی نرالے ڈھونڈھتے تھے انہوں نے "صبح بنارس" کے عنوان سے ایک جوگی کی صدا اس طرح منظوم کی ہے۔

یہ ستھری ستھری آنکھیں ؎ یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون ؎ یہ سندر سندر درشن

مایا ہے سب مایا ہے

یہ گورے گورے گال ؎ یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن ؎ یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایا ہے سب مایا ہے

کل جھوٹا ہے سنسار ؎ ایک سچا ہے سرجن ہار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب الفاظ، طرز نگارش اور انداز فکر عظمت اللہ خاں مرحوم کو انہی سوتوں سے حاصل ہوئے ہیں۔

اس جوگی کی صدا کس طرح بجنوری نے اس انداز میں اور بھی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں لیکن ایک نظم اجنبی کے بھی چند شعر سن لیجئے، یہ انداز بعد کو وحید الدین سلیم اور جوش ملیح آبادی کے یہاں ذرا شور و شغب کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر بجنوری کی فلسفیانہ موشگافیاں اور نازک خیالیاں سلیم مرحوم اور جوش ملیح آبادی کیوں کر پیدا کر سکتے تھے۔ البتہ اسلوب اور پیرایۂ بیان انہوں نے ضرور یہیں سے سیکھا۔ اس نظم کا عنوان ہے "اجنبی"

صنم فرنگ قمر جبیں بت سیم رنگ غضب حسیں
وہ عذار نازک و سرمگیں کہ رقیب ساغر آتشیں

وہ ہوائیں کاکل عنبریں کہ چمن شہاب ثاقب سب رواں
وہ دہان غنچہ گلاب گوں وہ لب گداز پر از فسوں
مژہ دراز کج ولنگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبد آسماں
تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسل الم و بلا
تجھے کیا خبر کہ ہوں اب کہاں تجھے کیا خبر گئی کس کی جان

یہ نظم ڈاکٹر بجنوری نے "سٹی آف کلکتہ" نامی جہاز کے عرشہ پر بحر سفید میں ۱۹۱۴ء میں لکھی تھی ان کی اور چند نظمیں بھی اسی انداز اور ایسے ہی تیور میں لکھی گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے طرز بیان میں ریختہ لکھنے کا شوق اور دشواریاں اسد اللہ خاں غالب کو قیامت کی یاد دلاتی تھیں ڈاکٹر بجنوری کو طرز غالب میں لکھنے کا اشتیاق ہفت خواں طے کراتا تھا۔ اور جس طرح غالب نے اپنا نیا ہی رنگ

پیدا کرلیا۔ اگر بجنوری کو بھی زندگی موقع دیتی تو وہ بھی ایک خاص صاحب طرز شاعر ثابت ہوتے یہ بھی کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے معاصروں کو ایک نئے اسلوب کی راہ سمجھادی۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ان اعلیٰ پایہ ادیبوں اور انسانوں میں سے تھے جن کے دل میں وطن کی محبت اور عظمت کا سمندر موجزن رہتا ہے وہ ہندستان اور ہندستانیت کے نشہ میں سرشار تھے ان کے زمانہ میں دو قومی نظریہ کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اور نہ کوئی خیال بھی کرسکتا تھا کہ یہ سرزمین کسی وقت دو حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے، انہوں نے اپنے مضمون خطوں اور نظموں میں جگہ جگہ ہندستان کی محبت یہاں کی فلسفہ و تمدن کی برتری اور یہاں کے لوگوں کی غفلت اور غنودگی کا ذکر کیا ہے ان کو افسوس ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک میں تو ٹیگور کی گیتانجلی کی تعریف ہو رہی ہے اس کے ترجمے چھپ رہے ہیں ٹیگور کے حالات زندگی پر کتابیں لکھی جارہی ہیں اور اس کی تصانیف اور نظموں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا اور پڑھا اور ان کا ترجمہ کیا جارہا ہے لیکن خود ہندستانی اپنے اس ادیب شہیر سے ناواقف اور اس کی تخلیق کی بلندیوں کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے سے نابلد ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جب میں ہندستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوگی اور ٹیگور کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام سے ناآشنا اور خواص کو اس کی خوبیوں کا منکر پایا۔ یہاں کے علمی طبقوں میں یہ حالت دیکھی کہ سخن فہموں کو داد تک دینے میں اغماز تھا۔ خود بنگال میں صدائے مخالفت بلند پائی۔ ہندستان کی منطق یہ ہے کہ ٹیگور اور اقبال ہمارے ملک کے لحاظ سے بڑے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ افکار یورپ سے سحر سے متاثر کرنا اور ان کو مغنیان فرنگ کا ہم پایہ خیال کرنا بالائے رفیع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوئے ادب بلکہ گناہ ہے"

ڈاکٹر بجنوری نے خود گیتانجلی کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا اور ان کا ارادہ تھا کہ غیر مقفیٰ نظم میں اس کا ترجمہ کریں تاکہ جہاں تک ہوسکے کلام کی خوبی قائم رہے لیکن افسوس ہے کہ ان کا یہ ارادہ کبھی پورا نہ ہوسکا دس پندرہ مقامات ہی کا ترجمہ کیا تھا اور کیا تعجب اگر زندگی ان کو موقع دیتی تو وہ بعد کو اپنی پختہ مشقی کے بل بوتے پر اس عظیم کام کے بھی متحمل ہوسکتے۔

انہوں نے جس نظم غیر مقفیٰ میں ترجمہ شروع کیا تھا اس کے دو شعر یہ ہیں ؎

موت جس دم دے گی دستک تیرے دروازے پر آ
کیا تو اضع اپنے مہمان کی بجا لائے گا تو
مرحبا سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے

ہندستان سے متعلق بجنوری کی نظموں میں ایک نظم خود ہندستان کے عنوان سے لکھی گئی ہے جس کی معنویت اور رموزیت قابل داد ہے اس میں وہ کہتے ہیں ؎

فوق البشر لشنہ ہر اک مستی عظیم
مصروف غور کف پہ زنخداں لیے ہوئے
سیو میں اس کے اک زن گلگوں گداز تن
آب حیات سینۂ عریاں لیے ہوئے
مشغول نوش چشمۂ آب بقا ہے یہ
طفلک دہن میں غنچۂ پستاں لیے ہوئے

آخر میں ہندستانی ترانے "بندے ماترم" کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ صرف ایک بند ہے اور اس سے شاعر کی اپنے وطن مالوف سے دلی محبت و شیفتگی کس خوبی سے نمایاں ہوتی ہے۔

اے مادر ہندستاں لو اے قوم علویت نشاں
فرق مبارک کی قسم لو جب تک ہے اپنے دم میں دم
سب جے بندے ماترم

منظر شہاب

حکمِ امتناعی

(۱)

سُنا ہے "ارضِ خداداد" کے صنم خانے
خموش ہیں، درودیوار پر اُداسی ہے
شکستِ ساغر و طاؤس کی منادی ہے
"قہقہہ نو" کارواں حکمِ امتناعی ہے
اسیرِ حلقۂ زنجیر ہیں ہیں مستانے

(۲)

صبا کے پاؤں ہیں زخمی، طیور نالہ کناں
چمن کی بزم سے رخصت ہوا بہار کا ذکر
بہارِ شاہدِ رعنا کے انتظار کا ذکر
اسی حبیب کے الطاف بے شمار کا ذکر
گرفتہ دل ہوئے جاتے ہیں غم سے لالہ رخاں

(۳)

غنیم خوش ہیں کہ رسوا ہوئی وفا کیشی
کلاہ کج کئے پھرتے ہیں، مسکراتے ہیں
وفورِ شوق میں وہ تالیاں بجاتے ہیں
جنابِ حضرتِ مُلا کے گیت گاتے ہیں
کہ جن کے بابِ شریعت میں کفر ہے رندی

(۴)

درست ہوں بھی یہ باتیں تو ان کی کیا پروا
قرار پا نہ سکے گا نظامِ آزادی
ڈھلے گی دھوپ، بتاتی ہے دھوپ کی تیزی
چڑھی ندی ہے کسی روز اتر ہی جائے گی
عصا ہے ہاتھ میں، مصروفِ ضرب ہے موسیٰ

(۵)

زمانہ فرض سے غافل نہیں، مرے ہمدم
خزاں گزیدہ ہیں دشت و دمن۔ تو یہ کبتک؟
چھپے ہیں گھات میں ناوک فگن۔ تو یہ کبتک؟
شکستہ پا ہیں غزالِ ختن۔ تو یہ کبتک؟
ہر ایک زخم کا جہدِ عوام ہے مرہم

پروفیسر علی عباس حسینی

"آج کا قارون"

مادھو کا مکان مہیپور میں سب سے اونچے پر تھا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا کسان اور "بھومی دھر" تھا۔ چار ہل کی کھیتی تھی، اور ہزاروں من کی پیداوار۔ اتنا غلہ اور کھانے والے تین۔ ایک وہ ایک اس کی بیوی تیا اور ایک ان کی محبت یا حماقت، جو سمجھو اس کا تحر لکھو۔ باپ بیٹے کی صورت شکل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مادھو پانچ فٹ کا موٹا، توندیل، چندیا بھی صاف اور داڑھی مونچھ بھی میلا مارکین کا کرتا اور اسی کپڑے کی اونچی دھوتی پہنے ننگے پاؤں، ننگے سر بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے غلاف چڑھا ہوا سال خوردہ جو بیوری طبیل۔

لکھو سترہ برس کا جوان تھا۔ سبزہ آغاز، چھریرا بدن، ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد، متناسب اعضا، کھلتی رنگت، کپڑے تو میلے اس کے بھی ہوتے، اور اکثر پھٹے بھی۔ مگر جوانی خود ایک حسن ہے۔ اسے کون چھپا سکتا ہے، یہ دلکشی اسے باپ کی جگہ ماں سے ملی تھی۔ تیا کسی زمانے میں یقینی صورت شکل کی اچھی سی رہی ہوگی وہ اب بھی ایک مرجھایا ہوا گجا پھول تھی۔ جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں لونچ لچک غائب ہوگئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں "نینوں کے بان" نہ چلاتی تھیں۔ وہ تیر غلافی پلکوں کے کونے کی کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتے تھے ——— مادھو کی کنجوسی نہ کھانے دیتی تھی نہ پہننے — موٹی مارکین کی ساری اسی وقت اترتی جب وہ صافی چکٹ ہو جاتی۔ گہنوں میں صرف ہاتھ پاؤں میں چاندی کڑے جلتی تھی تو سوکھی ہتیوں والی شاخ کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی باتیں کرتی تو معلوم ہوتا کبھی گونگی تھی یا ہکلی۔ ہر جملے کو سوچ سوچ کر، تول تول کر بولنا پڑتا ہے۔ لفظیں مشکل سے ملتی ہیں اور دقت سے منہ سے نکلتی ہیں۔ اسے ہر وقت خیال رہتا کہیں کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے، کہ پتی برا مانے۔ لیکن اس سوکھی گڑھیا میں لکھو کی حمایت کے موقع پر کبھی کبھی تیل کا جزر و مد آجاتا۔ اس وقت وہ گویا چھلک جاتی اور ابل پڑتی اکلوتا بیٹا، جوان، ہاتھ پاؤں سے سجل۔ ناک نقشے کا درست، پھر بے زبان ایسا کہ نہ بچپنے میں ہٹ کی، نہ جوان ہو کر کسی بات پر اڑا۔ جو ماں باپ نے کھلایا کھایا۔ جو پہنایا پہنا۔ دیکھتا تھا کہ گھر پر چار ہل کی کھیتی ہے۔ منوں غلہ پیدا ہوتا ہے۔ ہزاروں ہزار کا فائدہ ہے، مگر نہ گیہوں کھانے کو ملتا ہے، نہ باسمتی چاول۔ بس جو اور چنا" جیسے بھاگ میں لکھ گئے تھے! مگر یہ بھی دیکھتا تھا کہ باپ جو سب کا مالک تھا جس کے سب کچھ اختیار میں تھا۔ وہ خود بھی اسی موٹے جھوٹے کپڑے اور کھانے پر بسر کرتا تھا۔ پھر لکھو کیا کہتا، کیا کرتا؟

مگر تیا ضرور کڑھتی تھی، اب اس طرح گھٹ گھٹ کے بھوکے رہنے کی غرض کیا ہے۔ زندگی کا کوئی مقصد تو ہوتا ہے، وہ یہ نہ سمجھ پاتی تھی، کہ محض روپیہ کمانا، اسے اکٹھا کرنا، اسے جوڑ جوڑ کر رکھنا بھی منزل مقصد حیات بن سکتا ہے۔ اور اس کا پتی مادھو اسی کو سب سے بڑی منزل سمجھتا ہے، اس منزل کا انسانی خواہشوں، منصوبوں اور لالچوں کی طرح کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔ پہلے ایک قریب کی منزل دکھائی دیتی ہے آدمی وہاں پہونچا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے آگے ایک اور دلفریب مقام ہے۔ ٹھوکے ٹھوکر کھاکے گرتا پڑتا جب وہاں رسائی حاصل

کی تو اسے دُور، بہت دور، کچھ چمکتے کلس دکھائی دینے لگے، جب جان کی بازی لگا کر اس سواد میں قدم رکھا تو حرص کے دیو نے ایک اور آگے دین کا محل کھڑا کر دیا۔ غرض یہ راہ ہر منزل پر گھٹنے کی جگہ بڑھتی جاتی ہے! ——

مادھو کے دفینہ کے ساتھ ساتھ اس کا لالچ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اس کا کھتا عمیق در وسیع سے عمیق تر و وسیع تر بنتا وہ اس کے حلقے کو اور بھی بڑھانے کے خواب دیکھنے لگتا۔ اور وہ ان میں اس طرح محو ہو جاتا کھو جاتا کہ نہ اسے بیٹے کی جوانی دکھائی دیتی اور نہ طیا کی فریاد سنائی پڑتی۔ وہ کہتی "آئے دن ہیبزاری" "بیماری لگی رہتی ہے اب بہولے آؤ۔ گھر کا کام سنبھالے۔ لکھو اب جوان ہُوا۔ دیکھتے نہیں اس کا کام میں اب ویسا جی نہیں لگتا۔ صبح شام ادہر کے کھیتوں کا چکر لگاتا۔ سیٹی بجاتا، گنگناتا پھرتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی، تو بیٹھے بٹھائے جگ ہنسائی ہو جائے گی۔"

مادھو اپنی توند پہ ہاتھ مار کر کہتا۔ "تم تو مفت ہلکان ہوتی ہو، اور پریشان کرتی ہو۔ میرے پاس دھرا ہی کیا ہے" کہ ایک چوتھا کھانے والا اس گھر میں لے آؤں۔ پھر لکھو بڑا نیک اور سیدھا ہے —— رہی کبھی کبھی جھانک تاک تو وہ ہم بھی اس کے سن میں کیا کرتے تھے۔ ہی ہی، ہی، ہی، ہی!" ——

اور وہ سوکھی سہمی بیوی کو آنکھ مار کر قہقہہ لگاتا۔ یہ مردانہ وار قہقہہ نہ ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک جذبات کی اتنی فضول خرچی کوئی اچھی چیز نہ تھی۔ اس لئے ہا ہا بدل کر بھی ہی ہی ہو جاتا یعنی کھل کھل خندہ ان کی جگہ دھربھلی کھسلائی گئی!

مگر اب کے اپریل سے مادھو بہت خوش تھا۔ گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سرکار نے کنٹرول بھی اٹھا لیا تھا۔ زبردستی غلہ خریدا نہ جا سکتا تھا۔ اور خواہ مخواہ سستے بھاؤ اسے بیچنا نہ پڑا تھا پارسال تو اس نے صرف پانچ سو من گیہوں کھتے میں چھپایا تھا! اور جب بھاؤ چار سیر کی جگہ ۲½ سیر پہنچا تو اسے بیچا۔ اب کے اس نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو، وہ اپنا تین ہزار من گیہوں اس وقت تک نہ نکالے گا جب تک مہنگے سے مہنگا غلہ نہ بکنے لگے، اس نے گھر کے بڑے صحن کو پندرہ فیٹ گہرا کھدوایا۔ اس کی تہ میں بھونسا بھروایا۔ اور گیہوں کی بڑی بڑی بوریاں اس پر تلے اوپر رکھوا دیں۔ اغل بغل میں اور بھونسا ٹھونس کر اس نے صحن کو مٹی ڈلوا کر برابر کر دیا۔ یہ مٹی اس نے ڈھیلی اور پولی نہ رہنے دی۔ اس نے دو دن چار چار مزدور لگا کر دُرمت سے اسے کنکریٹ والی سڑک کی طرح کٹوایا۔ اور اسے ہر طرح مضبوط بنا دیا۔

اب وہ "بےفکر" بیٹھا تھا۔ بڑے بڑے آڑھتئے ہاپڑ، کانپور، کلکتہ سے آتے، گیہوں خریدنے پر اصرار کرتے، مگر مادھو خزانے کے سانپ کی طرح کھتے پر بیٹھا۔ سب کو پھٹکاریاں مار کر بھگا دیتا وہ کہتا "یہ جب ہی کھلے گا، جب کہیں ضلع بھر میں گیہوں منڈیوں میں نہ بکے گا۔ چھوٹے کسان نو آمد پیداوار بازاروں میں بیچ چکیں گے اور دکانوں اور گوداموں میں بھی کمیابی دکھائی دینے لگے گی۔"

مادھو کے "گول مول" ہونے سے اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے تھے، سمجھتے تھے اس ڈھول میں خول ہی خول ہوگا۔ ایسی صورت شکل سے عقل سے کیا واسطہ۔ مگر وہ بلا کا ہوشیار اور مستقل مزاج تھا آج مہیدپور میں سب سے بڑی کاشتکاری اور سب سے اونچی پکی حویلی اس بات کا ثبوت تھی، باپ مرا تھا تو اس نے دو بیگھے کھیت دو لاغر بیل، اور ایک کچا مکان چھوڑا تھا۔ مادھو نے اپنی محنت اور خِسّت سے، پیسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر گاؤں کا سب سے شاندار مکان بھی بنوایا۔ وہ چار بیل کی کھیتی بھی کرنے لگا، اور پچاس بیگھے زمین کا بھومی دھر بھی بن گیا۔ مکان کی نیو ٹیلے پر بڑی گہری ڈلوائی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ مہیدپور گھاگھرا کے کنارے ہے، اور گودریا اس کے گھر سے دو فرلانگ کے فاصلے پر بہتا ہے لیکن ایسے معاملات میں "آگم کا سوچ" اس کا اصول تھا۔ اسی لئے اب وہ گھر کی طرف سے بے فکر اور کھتے کی طرف سے

معلق ہو کر سیکمنٹ پر بیٹھا زریں گڑگڑاتا۔ اور اس کی آواز میں ایک موسیقی اور اس کے دھوئیں میں ایک رقص کی کیفیت محسوس کرتا اسے معلوم ہوتا جیسے لکشمی دیوی گنگا جل میں غوطہ لگا کر سطح آب سے نکلتے ہوئے اپنے کو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ باریک ساری میں لپٹی جاتی ہیں، اور ناچتی جاتی ہیں، اور ان کے گھنگرو کی جھنکار اتنی ہی سامعہ نواز، اتنی ہی دل فریب، اتنی ہی سریلی، اتنی ہی رسیلی تھی جتنی کہ ٹکسال میں گرتے برستے ہوئے زرد و سپید سکوں کی! — وہ یکبارگی اٹھ کر زریں کو دیوار کے کونے سے لگا دیتا۔ ٹہلنے لگتا، سوچنے لگتا، گنگنانے لگتا۔ اور اس طرح مسکرا پڑتا جیسے بلّی چوہے کو کھا کر مسکراتی ہے، جیسے ڈاکٹر ایک زردار کا آپریشن کر کے مسکراتا ہے، جیسے گدھ میدان جنگ کو لاشوں سے بھرا ہوا دیکھ کر مسکراتا ہے۔ ——

مہینے گذرتے گئے، رُت بدلی، موسم بدلا۔ جون کا مہینہ آیا، گئے ابر نے کچھ دنوں تو آسمان پر چہل قدمی کی۔ پھر قدم ذرا تیز کئے، رواں دواں ہوا، اور آخر میں تھک کر جگہ جگہ پر دم لینے کے لئے ٹھہرنے لگا۔

—— گاؤں والوں نے بھیگی ہوئی چیزوں کو سمیٹنا شروع کیا کھلیانوں میں پڑا ہوا اناج بھوسا، اکھ کی پتیاں، چھلکے، اُپلوں کے "گھروندے"، سوکھی لکڑیوں کے ٹھنٹے کاٹ کر، توڑ کر چھپروں کو کٹھریوں میں رکھنے لگے، جہاں پانی روکنے اور دھان لگانے کے لئے دس بیس کھیتوں کی مینڈیں اونچی کرتے، وہاں پانچ سات گھاگھرا کے بدلتے تیور بھی ضرور دیکھ آتے، مہیسپور بلندی پر ضرور تھا۔ مگر گھاگھرا کا کیا اعتبار۔ کس وقت کون سی کروٹ لے۔ وہ ہمیشہ برسات میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا دریا چھوٹی باندی میں بدل جاتا ہے ادھر اُبلا، اُدھر بڑھا، اس کگارے کو کاٹا، اس بند کو توڑا، اس گاؤں کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس قصبے کو لے ڈوبا، کہتے ہیں "دیوانہ ما ہوئے بس است" اس دریا کے لئے برساتی ہوا کا ایک جھونکا کافی سے زیادہ ہے، اس کی قطع ایک مست ہاتھی کی ہو جاتی ہے اس باغ کے درخت نوچے، اس سبزہ زار کو روندا، فیل خانے کی دیواریں پاش پاش کیں۔ اور مالک کے محل کا پھاٹک سونڈ سے کھینچ کھینچ کر توڑ پھینکا۔ اخبار والے، ریڈیو والے بھی برابر خبردار کر رہے تھے، ابکی برسات ذرا ڈَنی ہے، پچھلے برسوں کی سی جانی پہچانی نہیں ہے، پیسیفک میں گرائے جانے والے بموں، اور سائبیریا میں آزمائے جانے والے حربوں نے فضا میں لامعلوم تبدیلیاں کر دی ہیں پانی کس قیامت کا برسے، ندی نالے کتنا چڑھیں بڑھیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مادھو ایسی سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ اسے یقین تھا اس کا مکان، اس کا کھتا سب دریا سے کئی فرلانگ کے فاصلے پر ہیں، نہ گھبرانے کی کوئی بات، نہ ڈرنے کی کوئی وجہ۔ گیہوں بیچنے کا جب ہی تو موقع ہے جب اس طرح کی آفتیں آئیں۔ ہزاروں اپنا اپنا دبا گڑا غلہ کھو بیٹھیں گے۔ ہزاروں خانماں برباد ہوں گے۔ بھوکوں کے جم غفیر میں قحط کے جب آثار ہوں۔ ایسے ہی سمے میں منہ مانگے دام ملیں گے

موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ ایک ہفتہ تک متواتر رات دن برسا دل کھول کے برسا۔ جی توڑ کے برسا، کڑک کڑک کر برسا۔ گرج گرج کر برسا۔ کچی دیواریں اور چھتیں بیٹھ گئیں۔ چھپروں کی تھونیاں اور کھمبے دھنیوں کے اڑانے ڈھیر ہو گئے، کچھ مویشی دبے اور مرے، کچھ لوگ زخمی ہوئے، مگر بچ کر نکل گئے۔ کچھ بھیگ کر انفلوئنزا اور ملیریا میں گرفتار ہوئے۔ ادھر دریا نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ پہلے تو دونوں کناروں کے کاسے میں بھرا، پھر چھلک کر پھیلا اور بڑھا اور اس ہیبت اس غزیو اور اس طنطنے سے چلا۔ تیز ہوا اور دوڑنے لگا کہ منہ کا کف فرلانگوں اچھل کر جاتا۔ اور گڈھے، وادیاں، پل کے پل میں پُر کرتا اور ٹیلوں کو گراتا، سڑکوں کو پامال کرتا، بندوں کو توڑتا، جنگلوں کو اکھاڑتا، آبادیوں کو ڈبوتا نکل جاتا۔ مہیسپور کی بلندی کو چاٹنا، ٹکریں مارنا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک دن دریا سے قریب والے گھروں میں شور اٹھا۔ "پانی دیواروں میں رخنہ کر رہا ہے"۔...

.... لوگ مویشیوں کو ہنکاتے، بھیگتے، بھاگتے، تھوڑا سا

کندھوں، سروں پر رکھ کر اور بہت کچھ گھروں میں چھوڑ کر نکل بھاگے حکام ضلع کی طرف سے بھی کچھ لوگ آگئے، ان کی رہنمائی اور ان کی ہدایت پر عمل کر کے دوسری شام تک سارا گاؤں دوسرے دیہات میں پناہ لینے چلا گیا۔

گر مادھو اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مثل ہے "جان ہے تو جہان ہے" یہاں تو گھر تا ہی جان تھا، اور گھر ہی جہان۔ اپلی کے پیڑ کی طرح اس نے اپنے گھر میں مضبوط جڑیں گاڑ لی تھیں۔ اس نے اسی دن کا پہلے ہی سے "بندوبست" کر رکھا تھا۔ وہ کیوں جاتا۔ پانی بڑھتا ہے، تو بڑھنے دو' بھوکے بھی تو بڑھیں گے، اسی روز سیاہ میں تو اس کی تقدیر جاگنے والی تھی۔ اسی اندھیرے میں تو اس کی امید کے چراغ جگ مگ' جگ مگ کریں گے!

جب بیوی نے فریاد کی، اور بیٹے نے بھی کم سخن ہوتے ہر واویلا مچائی تو مادھو کڑھ کر بولا۔ "تم دونوں بھی جاؤ۔" اور مویشیوں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔" ملیا نے لاکھ منتیں کیئے گرجی، برسی، تڑپی، مگر وہ عزم کا پہاڑ بنا رہا۔ بات سے ڈھلا اور گھر سے قدم نکالنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ملیا ہار گئی۔ گرجتی ورتا کے ساتھ ماتا بھی تو تھی۔ اس نے لکھو کو سمجھا بجھا کر مویشیوں کو محفوظ جگہ لیجانے کے بہانے دوسرے گاؤں بھیج دیا۔

لکھو کا سارا دن اسی کام میں گذرا۔ جانوروں کے لئے چارہ کا بندوبست کرنے میں رات ہو گئی۔ بارش بھی جیسے دھند لکے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس گرج تڑپ کے ساتھ آئی، کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اور "رام، رام" کرنے لگا۔ کسی میں باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی، لکھو بھی بھیگ کر چوہا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے پناہ گزینوں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسے ایک سوکھی دھوتی دے کر کپڑے بدلوائے۔ اور آگ کے پاس ٹکایا اسے اپنے بھننے چنے میں شریک کیا۔ اور اسے اس کالی ڈراؤنی بھیانک رات میں کسی طرح مہید پور سٹلنے نہ دیا۔ صبح تڑکے ہی

کوؤں کی پہلی ہی کائیں کائیں کے ساتھ وہ اٹھ کر مہید پور کی طرف بھاگا۔ گاؤں سے فرلانگ ادھر ہی سے اس نے دیکھا سارے میں جل تھل ہے۔ صرف مادھو کا گھر جزیرہ بنا بیچ میں کھڑا ہے کنارے ہی سے کھڑے کھڑے، اس نے "پتاجی! پتاجی!" کہہ کر پکارا۔ مادھو نے چھت پر آکر آواز دی۔ "کشتی اور بھاؤڑا لے کر آؤ۔ گھبراؤ نہیں، یہاں سب ٹھیک ہے"!

بوکھلایا ہوا لکھو کشتی ڈھونڈھنے لگا۔ بارے پولیس والے مل گئے داروغہ جی نے کشتی بھی دلوائی۔ بھوڑا بھی دلوایا۔ اور غوث خاں ایک سپاہی کو ساتھ بھی کیا۔ وہ جوان بھی تھا۔ ہمت والا بھی تھا۔ اور پیراکی کا ماہر بھی۔ دونوں کشتی میں چلے، لیکن پانی کے بہاؤ سے زیادہ دو خطرے تھے۔ ایک ڈوبے ہوئے مکانوں کے "ڈینوتیر" دوسرے بہتے ہوئے درختوں کے "ڈینوسر" پھر بھی موجوں سے لڑتے' دھارے کو کاٹتے، نیچے اوپر کی بلاؤں سے بچتے جب دونوں اس کنارے پہنچے تو مادھو اپنے دالان میں کھڑا بے چین ملا۔ اس نے جھپٹ کر کشتی سے بھوڑا اٹھایا اور اندر گھس گیا۔ لکھو "ماتا! ماتا!" پکارتا پیچھے دوڑا۔ زنانخانے کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ جا کر دیکھا تو ماں چھت سے گرے ہوئے ملبے کے نیچے دبی پڑی ہے اور کمزور ہاتھوں سے دھنی اور مٹی ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے، اور مادھو زخمی بیوی کو نکالنے کی جگہ آنگن کی زمین کھود رہا ہے۔

لکھو کے پکارنے پر غوث بھی دالان کے کھمبے میں کشتی باندھ کر اندر آگیا۔ دونوں نے مٹی، گگے اور پلاسٹر، کا ڈھیر ہاتھوں سے ہٹایا اور بے ہوش ملیا کو نکالا۔ لکھو اسے گود میں اٹھا کر کشتی میں لایا، وہاں اپنے زانو پر ماں کا سر رکھ کر اس کے چہرے سے خاک و خون پاک کیا۔ "ماتا، ماتا" پکارا۔ اور جواب نہ پانے پر اس کے سینہ پر منہ رکھ کر رونے لگا۔

دوسرے کنارے سے گاؤں والوں نے شور کیا۔" ارے لکھو جلدی کر، جلدی! خبر آئی ہے تاڑ بھر اونچا پانی بس کوس بھر ادھر

ہے، جلدی سب کو لے آ۔ بھاگ! بھاگ!" ——— غوث خاں نے پکارا۔" مادھو! مادھو! جلدی کرو جی، جلدی!" ۔ اور جواب نہ پانے پر پھر اندر گھسا۔

مٹی کے صحن کو پانی نے جگہ سے کاٹ دیا تھا، کھیتے کا حلقہ صاف اُبھر آیا تھا۔ اور پانی نابدانوں کی جگہ تیزی سے کھیتے میں جا رہا تھا۔ مادھو نے دیوانہ وار آس پاس کی مٹی پھوڑے سے کاٹ کاٹ کر دراڑوں میں بھرنا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے کہاں کی اس میں قوت اور پھرتی آ گئی تھی۔ وہ دوڑتا جاتا تھا۔ اور سوراخوں کو، خالی جگہوں کو بھرتا جاتا تھا۔ پھوڑے سے مٹی رکھ کر دباتا، پاؤں سے کچلتا اور کہتا ——— کھیتے میں گھسے گا، نہیں جانتا مادھو کا ہے! مادھو موجود ہے۔ ہونہہ! دیکھیں اب کیسے آتا ہے!" ———

غوث دور ہی سے چیخا۔" ارے چھوڑ اسے، بھاگ چل! سارا گھر گرنے والا ہے بس........ مادھو نے اسے وہیں ——— حقارت سے دیکھا۔" تو جان بچا اپنی! میں تو جیتے جی اپنا کھیتا برباد نہ ہونے دوں گا ۔" غوث لپکا کہ زبردستی پکڑ لے چلے۔ مادھو پھوڑا ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا ۔" ایک قدم بھی آگے بڑھا یا تو سر توڑ دوں گا!" غوث نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مادھو ہنسنے لگا۔ تجھ کو کس نے یہاں بلایا جا تا کیوں نہیں۔ جا یہاں سے! چل!" اور وہ وار کرنے والے انداز سے سپاہی کی طرف بڑھنے لگا۔ دفعتہً زمین ہلنے لگی، پھر تڑاخ کی آواز ہوئی، ایک بہتے ہوئے شیشم کے درخت نے مادھو کی دیوار کو ٹکر ماری۔ پانی کی چھینٹیں پشت مکان سے اڑ کر چھت پر گریں صحن میں آ کر پاش پاش ہوئیں، مادھو نے قہقہہ لگایا۔ لال لال آنکھیں کر کے غوث کی طرف بڑھا، دفعتہً لڑکھڑایا اور پھوڑا ہاتھ سے پھسل کر غوث کی طرف چلا سپاہی چیخ کر بھاگا کشتی میں اچک کر آ گیا، ساتھ ہی تاڑ سے اونچی موج مادھو کے مکان سے ٹکرائی، موج نے کشتی کو دور پھینک دیا۔ ایک چادرِ آب پھیلی۔ جس میں نہ مکان تھا، نہ کھیتا اور نہ اسے جان سے عزیز رکھنے والا مادھو! غوث پولیس کے غیر ہمدردانہ لب و لہجہ میں بڑبڑایا۔" آج کا تاوان تھا، پاجی!"

وامق جونپوری

غزل

کسی کو تیرے ایسا غیر پر روتے نہیں دیکھا
پرایا درد وامق دل میں یوں ہوتے نہیں دیکھا

وہی دُنیا کو سمجھا اپنا جو سب کچھ لُٹا بیٹھا
وہ کیا سمجھے جسے دُنیا نے کچھ کھوتے نہیں دیکھا

تمہاری ضد ہے ورنہ جبر سے کب دِل بدلتے ہیں
زمینِ شور میں دانہ کبھی ہوتے نہیں دیکھا

بلا کا زہر ہے اے شامِ گیتی تیری زلفوں میں
کہ ہم نے ان کے کاٹے کو کبھی سوتے نہیں دیکھا

وہ خیراتی مدوں سے روک دیں گے انقلابوں کو
سُنا تو ہے مگر یہ معجزہ ہوتے نہیں دیکھا

شکیل الرحمان، ایم اے

تجربہ کی انفرادیت اور فنی شعور

حیات کو تجربہ کہنا چاہیئے ، تجربہ وقت کی رگوں میں لہو کی حیثیت رکھتا ہے ، حسین اور رنگین داستانوں کا سلسلہ وقت کی سرحدوں سے گذرتا ہے ، اور تجربوں کی تخلیق کرتا ہے ، تجربے معمولی بھی ہوتے ہیں ، اور غیر معمولی بھی ۔ بچوں کے تجربے ان کی فطرت کی طرح معصوم ہوتے ہیں ۔ اور ادیبوں اور سائنس دانوں کے تجربے غیر معمولی ہوتے ہیں ، بعض تجربوں کی بنیاد ہوتی ہے ، لیکن ان تجربوں کی کوئی انفرادیت نہیں ہوتی ، اور ان کی کوئی عمارت ہوتی ہے ، ایسے تجربے صرف تجربے ہوتے ہیں ، ان تجربوں کو فن کی بازیابیاں نصیب نہیں ہوتیں بعض تجربوں کی بنیاد بھی ہوتی ہے ، اور ان کی عمارت بھی ہوتی ہے ، ان تجربوں کو فن کے اشاروں کا سہارا حاصل ہے ان سے زندگی کو سنوارنے میں بھی مدد ملتی ہے ، جو تجربے خواب کی طرح دھندلے ہوتے ہیں ، ان کی مثالیں بعض فلسفیوں کے یہاں بھی ملتی ہیں —"

غیر معمولی تجربوں میں بڑی وسعت اور بڑی گہرائی ہوتی ہے ان تجربوں میں عجیب لچک ہوتی ہے ۔ ان کی رعنائی ، برنائی اور صباحت ایک خاص انفرادیت پیدا کرتی ہے ، انہیں تجربوں پر آرٹ کی بنیاد قائم ہوتی ہے ۔ آرٹ تجربوں کے سہارے زندگی پاتا ہے ، تازگی اور پاکیزگی پاتا ہے ، اور حیات کی خوشبو سے نہا لیتا ہے ۔ غیر معمولی تجربہ آرٹ سے علیحدہ رہ کر انتہائی طور پر پیچیدہ بن جاتا ہے ۔ فن کار کا شعور ہی ان تجربوں کو سہارا دیتا ہے آرٹ سے علیحدہ رہ کر تجربہ کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے ، وہ اس طرح ایسا مواد بن جاتا ہے ، جس کا کوئی اسلوب نہیں ہوتا ۔ وہ گیلی مٹی ہوتا ہے ، اس کے لئے کوئی بھی خوبصورت سانچہ فن کار ہی لاتا ہے ۔ آرٹ سے علیحدہ رہ کر تجربہ وحشت کے پہلو میں رہتا ہے دونوں اس وقت تک علیحدہ نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کے درمیان آرٹ اپنی جگہ پیدا نہ کر لے ۔ جب انسان کی کوئی تہذیب نہ تھی اس وقت ، انتہائی طور پر وحشی تھا ۔ تجربہ کے لئے آرٹ تہذیب ہے ، بالکل اسی طرح جس طرح وحشی انسان کے لئے کوئی تہذیب پیدا ہوئی بغیر فن کا سہارا لئے ان تجربوں کو ایک جگہ نہیں کیا جا سکتا ہے ان سے کوئی مصرف بھی نہیں لیا جا سکتا ہے ۔ جمالیاتی اشاروں سے ان تجربوں کو سنوار نہیں سکتے ۔ آرٹ کی ترتیب آمیزی کے بغیر جمالیاتی تجربوں 'AESTHETIC EXPERIENCES' کی تخلیق ممکن نہیں ہے ۔

جس طرح کسی غیر معمولی تجربہ میں ایک قسم کی بے چینی ہوتی ہے ، ایک تڑپ ہوتی ہے ، اسی طرح معمولی تجربوں میں بھی بے چینی ، اور تڑپ ہوتی ہے ، لیکن دونوں میں آسمان اور زمین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے ، غیر معمولی تجربوں کی بے چینی اور آرٹ اور فن کار کے لئے ہے ۔ فن کے شعور کے سانچے میں ڈھل جانے کے لئے یہ بے چینی پیدا ہوتی ہے ، اور یہ تڑپ جنم لیتی ہے ، معمولی تجربوں کی بے چینی آرٹ کے قریب آنے کے لئے نہیں ہوتی ہے یہ تجربے فن کار کے شعور میں سمانا نہیں چاہتے ہیں ، ان تجربوں کو اپنی موت کا انتظار ہوتا ہے ، اور اسی لئے یہ بے چینی رہتی ہے

اور وہ بے قرار رہتے ہیں۔

فن کار تجربوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان تجربوں کو داخلیت میں سمو لیتا ہے۔ داخلی زندگی سے ان تجربوں کو شیرینی اور مٹھاس ملتی ہے، پھر یہ تجربے خارجی زندگی میں آتے ہیں۔ فن کار تجربوں کی دھڑکنوں کو پالیتا ہے، اور ان دھڑکنوں کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے، جب یہ تجربے زندہ حاصل ہو جاتے ہیں یعنی فن کار کا شعور ان کی دھڑکنوں کو پالیتا ہے، تو فن میں یہ دھڑکنیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ فن کار کا بالیدہ شعور ہوتا ہے جو تجربوں کو ان کی اصلی حالت میں پالیتا ہے، بعض فن کاروں کو یہ غیر معمولی تجربے حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان تجربوں میں کوئی جان نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ انہیں زندہ حاصل کرنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ فن کار احساسات کی صباحت اور دلربائی سے تجربوں کو گرفت میں رکھتا ہے، اور یہ احساس کی صباحت اور دلربائی ہی ہوتی ہے، جس سے تجربوں کے اونگھتے ہوئے نقطوں میں بھی ایک خاص قسم کی انفرادیت کے ساتھ زندگی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے، فن کار کا شعور پہلے تجربوں کو ان کی اصلی حالت میں اپنے قریب لاتا ہے۔ پھر انہیں صاف کر کے نکھارتا ہے، اور آخر میں ان تجربوں میں اپنے احساس کی مٹھاس اور شیرینی پیدا کر کے ان کا تجزیہ کرتا ہے، اور اپنی کسمساہٹوں اور اداؤں کو عوام کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ تجربوں کے بعض حاشیے اور زاویئے نہایت ہی خاموش ہوتے ہیں۔ ان میں اونگھنے والی کیفیت تو نہیں ہوتی، اور نہ موت کی خاموشی ان پر طاری ہوتی ہے، ان کی خاموشی غضب کی ہوتی ہے جیسے فلسفی کی خاموشی یا اہرام مصر کی اپنی ساری رعنائیوں اور تابناکیوں کے ساتھ خاموشی ——— ان کا اپنا حسن ہوتا ہے فن کار کا شعور ان کی خاموشی کو نہیں چھیڑتا ہے۔ انہیں ان کی اصل حالت میں اٹھا کر اپنی داخلیت میں اچھی طرح کھنگھال کر سامنے لاتا ہے، ان حاشیوں اور زاویوں کی خاموشی میں چھیڑ فن کی نزاکتوں کو صدمہ پہونچاتا ہے، یہاں بھی احساس کی صباحت اور خوشبو اور جذبات کے شہد اور گیت اپنا کام کرتے ہیں، یعنی ان زاویوں کو راج ہنس کے پروں کی طرح سفید بنا دیتے ہیں۔ تاج محل کی سادگی عطا کرتے ہیں۔ سلومی (SOLOMI) کے رقص کی جھنکار دیتے ہیں۔ نطاشا، روستووا (NATASHA RUSTOVA) ——— کی سانسوں کی مہک دیتے ہیں....

انا کرینینا (ANNA KARINIUNA) اور برونسکی (BRONSLEY) کی محبت کا پہلا بوسہ اور ان کی چھاتیوں کے زیر و بم کی دھمک کا احساس دلاتے ہیں

عظیم تخلیقات کے تجربے ذمہ دار ہوتے ہیں، فن کا شعور ان تجربوں کو ذمہ داری دیتا ہے اور انہیں جذبات کی پاکیزگی عطا کرتا ہے جس تخلیق میں جذبات کی پاکیزگی نہ ہو۔ احساسات میں ایک قسم کی وحشت ہو۔ اس کے تجربے پر کچھ ذمہ داریاں بھی نہ ہوں، تو وہ تخلیق کسی صورت میں عظیم نہیں ہو سکتی۔

عظیم تخلیقات کے تجربے لذتیت پیش نہیں کرتے، ان میں چٹخارے نہیں ہوتے، تھوڑے وقفہ کا سرور اور تھوڑی دیر کی بے پناہ مسرت نہیں ہوتی۔ جذبہ کی آزادی ہوتی ہے، وہ آزادی جس میں بے باکی ہوتی ہے، جس میں ایک خاص قسم کا سرور اور ایک خاص قسم کی سرمستی ہوتی ہے۔ فن کار کے بنیادی خیال، اور جذبہ کی آزادی میں ایک توازن (BALANCE) ہوتا ہے۔ اسی توازن سے پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور وحشت کے پریشان عناصر دور ہوتے ہیں۔ فن میں جو تجربے شامل ہوتے ہیں۔ ان میں احساس کی قوت ہونی چاہئے، فن کار کا شعور اسی احساس کی قوت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہی فن کا بھی مطالبہ ہے۔"

فنی شعور سے تجربہ اور ہیئت (EXPERIENCE & FORM) میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ فن کار یہاں بھی احساس (جذبیت) کی شدت سے کام لیا ہے، اور تجربہ

اور ہیئت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے، اس طرح تجربہ کو وقار ملتا ہے، عزت ملتی ہے۔ اطمینان اور سکون ملتا ہے، نئی معنویت نئے جوش، اور نئے اثر کے ساتھ تجربہ کی فن کارانہ پیش کش اس وقت تک ممکن ہیں، جب تک کہ ماحول سے حاصل کئے ہوئے تجربوں کو نکھری ہوئی ہیئت نہیں مل جائے، اور دونوں میں فن کار ایک قسم کی ہم آہنگی اور توازن پیدا نہ کرلے۔ تجربوں کی شدت ان کی آنچ، اور ان کی آہنگ کا پتہ اسی توازن سے چلتا ہے فن کار جذبہ سے جو رنگینی (COLOUR EFFECT) پیدا کرتا ہے اس کا بھی علم اسی توازن اور ہم آہنگی سے ہوگا۔

تجربہ کی روح سے گہرا تعلق پیدا کرنا ہیئت کا کام ہے، یہ فنی شعور پر ایک فرض ہے۔ فنی شعور کی بالیدگی ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ ہیئت کا کوئی گہرا تعلق تجربہ کی روح سے قائم نہ ہو سکا تو فن کار ملزم ہے، اسی گہرے تعلق کے بعد تجربوں سے ہماری ہمدردی بڑھتی ہے

فراق گورکھپوری

رُباعی

آہٹ سی حیاتِ عشق پا جاتی ہے
کیا چیز سکوتِ غم کو چونکا تی ہے
گو سازِ خموش ہے یہ شامِ ہجراں
کچھ ساز کے پردوں سے صدا آتی ہے

کنہیا لال کپور

"چندا رے!"

ایک تمثیل

کردار:-

پروفیسر راکیش۔

بھولا۔ پروفیسر راکیش کا نوکر۔

چندا۔ فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کی سکرٹری۔

نیلا مبر اور شستری۔ پروفیسر راکیش کے دو بے تکلف دوست۔

مقام:-

پروفیسر راکیش کا ڈرائنگ روم:-

پروفیسر راکیش (ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے) آہا ہا! کتنا دلچسپ مجموعہ ہے! اور پھر نام کتنا پیارا ہے۔ "چندا رے!" لطف یہ کہ سب گیت چندا پر لکھے گئے ہیں۔ ــ چندا رے تو رونا کیوں ہے، چندا رے تو کیوں مسکائے؟ چندا رے کیا صبح نہ ہوگی؟ ــ چندا رے تو کیوں شرمائے؟ اور ــ چندا رے تو کیوں چندا رے؟ یہ فلمی شاعر بھی کمال کرتے ہیں۔ بخدا کیا سوال کیا ہے۔ ــ چندا رے تو کیوں چندا رے؟ اب بھلا بے چارا چندا اس سوال کا کیا جواب دے گا۔ اور پھر یہ گیت ــ چندا رے او ظالم چندا۔

(نوکر کو آواز دیتے ہوئے) بھولا۔ ارے بھولا۔

بھولا:- جی سرکار۔

راکیش:- ذرا ادھر آؤ۔

بھولا:- (قریب آتے ہوئے) جی سرکار۔

راکیش:- بھولا۔ کیا تم جانتے ہو، کہ چندا کیوں ظالم چندا ہے۔

بھولا۔ سرکار اپنے دھندے سے فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ بندہ یہ سوچے، کہ چندا کیوں ظالم چندا ہے۔

راکیش:- تم ایک دم ڈل (Dull) ہو بھولا۔ ایک دم ڈل، فلمی گیت سمجھنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اچھا تم جاؤ۔ ہم سوچتے ہیں۔ آج کالج سے چھٹی ہے . . . . ہاں بازار سے دوڑ کر سگرٹ لے آؤ۔

بھولا:- بہت اچھا سرکار۔ (جاتا ہے)

راکیش:- ہُم۔ چندا رے او ظالم چندا۔ شاید چندا اس لئے ظالم ہے کہ وہ سورج نہیں ہے۔ یا شاید اس لئے کہ وہ شاعر کو ظالم نظر

شری اتولیہ گھوش
صدر مغربی بنگال کانگریس کمیٹی

شری لال بہادر شاستری
وزیر مواصلات حکومت ہند

میجر جنرل مہندر سنگھ چوپڑا

پنڈت کرشن پرشاد کول

ممکن ہے یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ چندا اس لئے ظالم ہے، کہ شاعر کا
کا محبوب اس سے روٹھ گیا ہے۔ اور اُسے اُس کی یاد ستا رہی ہے
ہُم۔ لیکن یہ بات کیا تھی ۔۔۔ چندا رے او ظالم چندا۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

راکیش۔ کون؟
آواز:۔ جی میں ہوں چندا۔
راکیش۔ (حیرانی سے) چندا؟ لیکن تم آسمان سے زمین پر کیسے آ گئے
خیر دروازہ کھلا ہے۔ تشریف لے آئیے۔
چندا:۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) نمستے۔
راکیش:۔ نمستے۔
چندا:۔ "میں فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کی سکرٹری ہوں۔"
راکیش:۔ یہ فائن فائن فائن آرٹس کیا بلا ہے؟
چندا:۔ یہ ایک نئی سوسائٹی ہے۔ اس کا مقصد فائن آرٹس بالخصوص
پینٹنگ کو فروغ دینا ہے۔ اس سوسائٹی کے جتنے ممبر ہیں
وہ پینٹنگ میں عجیب و غریب تجربے کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں
کہ ایسی تصویریں بنائی جائیں، جن کو دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے
ہو جائیں۔
راکیش:۔ خوب۔ بہت خوب! اچھا تو آپ کے پاس ایسی تصاویر ہیں
جنھیں دیکھ کر ......"
چندا:۔ جی ہاں! یہ دیکھئے میرا البم! اس میں میری تازہ ترین تصاویر
ہیں ۔۔۔"
راکیش:۔ دکھائیے ذرا۔
چندا:۔ (البم کھول کر ایک تصویر دکھاتے ہوئے) یہ پہلی تصویر ملاحظہ
فرمائیے۔ اس کا نام ہے۔ "برنداون کی گوپی"
راکیش:۔ (تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے) برنداون کی گوپی! مجھے
تو گوپی ووپی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ایک
بڑے کاشی پھل کے اوپر ایک چھوٹا کاشی پھل رکھ کر اس کے اوپر
کوئلے کے دو ٹکڑے رکھ دیئے ہیں۔
چندا:۔ (ہنستے ہوئے) ہا ہا ہا۔ واہ پروفیسر صاحب۔ آپ
جیسا سمجھدار آدمی بھی دھوکا کھا گیا۔ ابھی جسے آپ بڑا کاشی پھل
سمجھ رہے ہیں، وہ گوپی کا پیٹ ہے۔ اور وہ جو چھوٹا کاشی پھل
ہے وہ اس کا سر ہے، اور یہ کوئلے کے دو ٹکڑے نہیں، گوپی
کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں۔
راکیش:۔ ہُم۔ یہ بات ہے۔ اچھی ذرا دوسری تصویر دیکھیں۔
چندا:۔ ہاں یہ دوسری تصویر ہے۔ بھلا بتائیے یہ کیا ہے۔
راکیش:۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کہ یہ کیا ہے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے، کہ ایک
بندر ہاتھ میں خربوزہ پکڑ کر کوئیں میں اُترنے کی کوشش
کر رہا ہے۔
چندا:۔ واہ پروفیسر صاحب۔ خوب سمجھے۔ ابھی یہ بندر نہیں مستقبل
کا انسان ہے۔ اس کے ہاتھ میں خربوزہ نہیں، ایٹم بم ہے
اور وہ جو کنواں ہے کنواں نہیں۔ تباہی کے غار ہے، سمجھے
آپ؟
راکیش:۔ سمجھا تو نہیں۔ لیکن چونکہ آپ ایسا کہتی ہیں، اس لئے مان
لیتا ہوں۔
چندا:۔ دراصل یہ آپ کا قصور نہیں۔ یہ ہم آرٹسٹوں کا قصور ہے، ہم
آپ کو ایسی تصاویر بہت کم تعداد میں دے رہے ہیں، اس
لئے آپ انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آپ بھی بہت سے اور
لوگوں کی طرح وہی تصاویر پسند کرتے ہیں، جنھیں دیکھ کر
کچھ سوچنا نہ پڑے۔
راکیش:۔ یہ تو آپ بجا فرماتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ یہاں تشریف
کیسے لائیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں ان تصاویر پر ایک آدھ
مضمون لکھوں، تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کو میں سمجھ نہیں

سکتا۔ اس کے متعلق کبھی نہیں لکھتا۔

چندا :- جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں آپ سے اپنی سوسائیٹی کے لئے چندہ لینے آئی ہوں۔

راکیش :- چندہ ؟

چندا :- جی ہاں چندہ۔ دیکھئے ہمارے بہت سے آرٹسٹ بھوکوں مر رہے ہیں۔ ایک کو پچھلے چھ ماہ سے کالی کھانسی کی شکایت ہے ڈاکٹر کا خیال ہے، کہ اُسے بہت جلد دق ہو جائے گی، دوسرے کا دماغ چل گیا ہے۔ اسے پاگل خانے بھجوانا پڑے گا۔ تیسرے کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا ہے، اس کا اپریشن ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپے کی اشد ضرورت ہے۔

راکیش :- اگر روپے کی ضرورت ہے۔ تو آپ اُن آرٹسٹوں کی تصاویر فروخت کر کے روپیہ حاصل کر سکتی ہیں۔

چندا :- وہ تو ٹھیک ہے، لیکن مصیبت یہ ہے، کہ کوئی شخص ان کی تصاویر خریدنا نہیں چاہتا۔

راکیش :- اور خریدے بھی کیوں۔ جب کہ ان تصاویر کا نہ سر ہے نہ پیر

چندا :- یہ بات نہیں پروفیسر صاحب۔ دراصل لوگوں کا مذاق اتنا بگڑ چکا ہے کہ وہ ان تصاویر کی قدر نہیں کر سکتے۔ خیر یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں ..... اچھا تو کہئے کتنے روپے دے رہے ہیں آپ۔

راکیش :- آج مہینے کی ۲۰ ہے۔ اور میرے بٹوے میں صرف بیس روپے ہیں۔

چندا :- (مایوسی سے) یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ میرا خیال تھا، کہ آپ جیسا آرٹ کو سمجھنے والا کم از کم چالیس روپے تو دے گا۔

راکیش :- معاف کیجئے۔ نہ تو میں اس قسم کے آرٹ کو سمجھتا ہوں، اور نہ ہی چالیس روپے دے سکتا ہوں۔

چندا :- اچھا، تو بیس ہی لائیے۔

راکیش :- بیس آپ کو دے دوں، اور میں خود ......"

چندا :- اچھا، پانچ رکھ لیجئے۔ میرا مطلب ہے، سگرٹ پان وغیرہ کے لئے۔ پندرہ دے دیجئے۔

راکیش :- نہیں پندرہ زیادہ ہیں۔

چندا :- اچھا تو چودہ دے دیجئے۔ دیکھئے چودہ سے ایک کم نہ لوں گی۔ نکالئے نکالئے، میں پرچی کاٹتی ہوں۔

راکیش :- (بیدلی سے) ہیں تو یہ بھی زیادہ۔ لیکن خیر، لیجئے۔

(روپے دیتا ہے)

چندا۔ شکریہ۔ بہت، بہت شکریہ۔ فائن۔ فائن فائن آرٹس سوسائٹی آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ اچھا نمستے۔

راکیش :- نمستے۔

(چندا جاتی ہے)

راکیش :- عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے یہ چندا بھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ کہ شاعر نے یہ کیوں کہا۔ کہ چندا رے او ظالم چندا! ادھر۔ فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی۔ کتنا فضول نام رکھا ہے۔

(کوئی پھر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

آواز :- پروفیسر راکیش گھر پر ہیں۔

راکیش :- (آواز پہچانتے ہوئے) کون نیلامبر، آؤ بھئی آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔

(نیلامبر اور ششی اندر آتے ہیں)

نیلامبر :- ہیلو راکیش۔

ششی :- ہیلو پروفیسر۔

راکیش :- آؤ بھئی بیٹھو۔

نیلامبر :- نہیں ہم بیٹھیں گے نہیں۔ بس کھڑے کھڑے بات کریں گے۔

راکیش :- کیوں خیر تو ہے۔

نیلامبر :- ہاں خیر یہی ہے ششی اور ہم نے ایک نئی مہم شروع کی ہے ۔ اس کا نام ہے ۔ "ایٹ مور وٹامن پلیز" ——————
یعنی (EAT MORE VITAMIN PLEASE)
مہربانی کر کے اور وٹامن کھائیے ۔ تم جانتے ہو ۔ آج کل مہموں کا زمانہ ہے ۔ ہم نے سوچا کہ ہم بھی ایک مہم کیوں نہ شروع کر دیں ۔

راکیش :- لیکن اس کی کیا ضرورت تھی ۔ میرا تو خیال ہے ، لوگ پہلے ہی کافی وٹامن کھاتے ہیں ۔ میرا مطلب ہے ، امیر لوگ ۔

ششی :- بالکل غلط ۔ دیکھئے اگر آپ وٹامن "اے" کھاتے ، تو آپ کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا نہ ہوتا ۔

نیلامبر :- اور اگر آپ وٹامن "سی" کھاتے تو آپ کے دانت اتنے کمزور نہ ہوتے ۔

ششی :- اور اگر آپ وٹامن "اے ، بی ، سی" کھاتے ۔ تو آپ کا جسم اکہرا نہ ہوتا ۔

راکیش :- بھئی میرا جسم ، میرا چہرہ ، میرے دانت اچھے خاصے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں کافی وٹامن کھاتا ہوں ۔

نیلامبر :- نہیں نہیں بالکل نہیں ۔ یہی تو آپ کی غلطی ہے ، آپ بھی ہزاروں لوگوں کی طرح سمجھتے ہیں ۔ کہ آپ کافی وٹامن کھا رہے ہیں ۔ حالانکہ آپ بہت کم وٹامن کھاتے ہیں ، اچھا بھلا آپ نے کبھی کیلے کے چھلکے کھائے ہیں ۔

راکیش :- کیلے کے چھلکے ؟ کیلے کے چھلکے کون کھا سکتا ہے ۔

ششی :- اجی پروفیسر صاحب ، کھانے والے سب کھاتے ہیں ۔ اچھا آپ نے کبھی شیشم کے پتے کھائے ہیں ۔

راکیش :- شیشم کے پتے ؟ یہ تو کبھی نہیں کھائے ۔ خدا وہ وقت نہ لائے ۔ کہ یہ کھانا پڑیں ۔

ششی :- اجی دعا کیجئے ۔ کہ خدا آپ کو عقل دے ، اور آپ بہت جلد شیشم کے پتے کھانا شروع کریں ۔ معلوم ہے شیشم کے پتوں میں کتنے وٹامن ہوتے ہیں ۔

راکیش :- ہوتے ہوں گے ، لیکن میں شیشم کے پتے ......

نیلامبر :- اچھا چھوڑیئے ۔ آپ نے کبھی سبز گھاس کھائی ؟

راکیش :- گھاس ؟ کیا تم مجھے جانور سمجھتے ہو ۔

نیلامبر :- اجی نہیں ۔ سبز گھاس وٹامن "اے" اور "بی" کا سب سے بڑا مخزن ہے ۔ دیکھئے گھوڑے ، ہرن ، بیل سب گھاس کھاتے ہیں ۔ اور کتنے طاقتور ہیں وہ ۔

راکیش :- گستاخی معاف ۔ میں گھاس نہیں کھا سکتا ۔

ششی :- اوہ پروفیسر ۔ "یو ڈونٹ نو وٹ یو آر مسنگ" ۔
(You don't know what you are missing)

نیلامبر :- آپ کو کم از کم دو سیر گھاس ضرور کھانا چاہیئے ۔

راکیش :- مجھے تو معاف ہی رکھئے ۔ اچھا یہ بتائیے ، کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے ۔ سگرٹ ، لیمن .... چائے ؟

ششی :- یہ تکلفات رہنے دیجئے ۔ دیکھئے اس مہم کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ہمیں روپے کی ضرورت ہے ، آپ کھلے دل سے چندہ دے کر ہماری مدد کیجئے ۔

راکیش :- چندہ ؟ لیکن آج تو مہینے کی ۲۸ ہے ، اور میرے بٹوے میں صرف چھ روپے رہ گئے ہیں ۔

ششی :- کوئی بات نہیں ، کوئی بات نہیں ۔ ہمیں چھ روپے ہی دے دیجئے ۔

راکیش :- چھ روپے تمہیں دے دوں اور میں کیا کروں ۔

نیلامبر :- آپ وٹامن کھائیے ۔ ہا ہا ہا ۔ سمجھے آپ ۔

راکیش :- اچھا تین روپے لے لیجئے

نیلامبر :- تین روپے ۔ اتنے بڑے پروفیسر سے صرف تین روپے ؟ اتنی ضروری مہم کے لئے تین روپے ۔ دیکھئے چھ سے ایک کم نہ ہوگا ۔

راکیش :- اچھا بھئی ضد نہ کرو ۔ پانچ لے لو ۔

نیلامبر:۔ اچھا لاؤ۔ ایک روپے کا ادھار رہا۔

راکیش:۔ (پانچ روپے کا نوٹ دیتے ہوئے) لیجئے۔

نیلامبر:۔ شکریہ ..... اچھا نمستے

ششی۔ نمستے

(نیلامبر اور ششی جاتے ہیں)

راکیش:۔ مہینے کی ۲۰ ر اور جیب میں صرف ایک روپیہ۔

(دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

راکیش:۔ (اونچی آواز سے) اگر آپ بھی چندہ لینے آئے ہیں، تو سمجھ لیجئے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

(کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز)

راکیش:۔ کون ہے بھئی۔

بھولا:۔ جی میں ہوں۔ بھولا۔ سگرٹ لایا ہوں۔

راکیش:۔ اوہ بھولا۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ بھولا سے، میں سمجھا کہ تم بھی چندہ ہو!

بھولا:۔ چندا ؟ کون چندا ؟ کہیں وہی تو نہیں جس کے متعلق آپ پوچھ رہے تھے

راکیش:۔ نہیں نہیں۔ یہ دوسرا چندہ ہے، اس چندہ نے تو آج کمر توڑ کر رکھ دی ہے

بھولا:۔ کیا مطلب سرکار؟

راکیش:۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ اچھا کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اندر مت آنے دو

بھولا:۔ اسے کیا کہوں سرکار۔

راکیش:۔ اسے کہو کہ جب سے چندا آسمان سے اڑ کر زمین پر آ گیا ہے صاحب چندہ سے گھبرا کر پاتال میں چلے گئے ہیں۔

بھولا:۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔

راکیش:۔ بھولا۔ تم نہیں جانتے۔ چندہ کتنا ظالم ہوتا ہے

بھولا:۔ صاحب میں ایکدم ڈل ہوں، چندا کو سمجھنا میرے بس کا روگ نہیں، اچھا تو ملاقاتیوں سے کیا کہوں؟

راکیش:۔ وہی جو میں نے کہا ہے ..... بھولا:۔ بہت اچھا سرکار، بہت اچھا

دھرم پال گپتا وفا

غزل

مقابل جب کسی کا عارضِ تاباں نہیں رہتا
سیہ خانہ میں اپنے نور کا امکاں نہیں رہتا

وہ کافر جب کسی کے در پہ ایماں نہیں رہتا
حدیثِ عشق کی تفسیر کا امکاں نہیں رہتا

نگاہِ ناز جب اٹھتی ہے اس بت کی سرِ محفل
دل و جاں چیز کیا ہیں خیر سے ایماں نہیں رہتا

بہار آتے ہی پرزے کیوں نہ اڑ جاتے گریباں کے
جنوں میں کچھ خیالِ تنگیٔ داماں نہیں رہتا

نہ ہو سودائے الفت جس میں وہ سر بھی کوئی سر ہے
وہ دل بھی دل نہیں جس میں غمِ جاناں نہیں رہتا

ہر اک انداز سے تخریب کے پہلو نکلتے ہیں
خیالِ امنِ عالم جب کسی عنواں نہیں رہتا

مروت، راستی، اخلاص، الفت اور رواداری
مبرا ان سے رہ کر آدمی انساں نہیں رہتا

وفا کا پاس ہو اور عجز ہو، ذوقِ عقیدت ہو
درِ مولا پہ پھر کوئی تہی داماں نہیں رہتا

گوربچن سنگھ

چھگن جی کا ایک فلیٹ تاپی روڈ پر تھا۔ وہ خود اسی فلیٹ میں رہتے تھے، جو چند کوٹھیاں شہر سے باہر تھیں وہ انہوں نے سرکاری افسروں کو کرایہ پر دے رکھی تھیں کرایہ انہیں سرکار سے وصول ہو جاتا تھا تاپی روڈ والا فلیٹ چار منزلہ تھا۔ اوپر کی منزل کے چند کمروں کو چھوڑ کر باقی کمرے اور نیچے کی منزلوں کے تقریباً سارے کمروں میں انہوں نے چھوٹے موٹے کرایہ دار بسا رکھے تھے، ان کرایہ داروں میں دفتروں کے کلرکوں سے لے کر فرموں کے بڑے افسر تک شامل تھے، چھگن جی نے انہیں فلیٹ کرایہ پر دے کر ان پر ایک بہت بڑا احسان کیا تھا شہروں میں گھروں کی خاص تنگی تھی۔ لوگ ان کے پاس اس غرض سے ملنے آتے ہی رہتے تھے اور انہیں ان کی مجبوریوں کو دھیان میں رکھنا ہی پڑتا تھا۔ فلیٹ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان کے دوستوں کی خاص فرمائش سے وہاں رکھ لئے گئے تھے چھگن جی ان سب لوگوں میں اپنی اس ہمدردی اور عنایت کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، کئی اور وجہیں ایسی بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ سب انہیں آدرش کا ایک نمونہ تصور کرتے تھے، ایک وہ تھے اور ایک ان کی دس برس کی لڑکی اور گھر کی ایک آیا۔ آیا نے اس گھر میں اپنی زندگی بتائی تھی۔ چھگن جی کا اس آیا سے اپنوں کا سا برتاؤ تھا اور اسے گھر کا ایک فرد ہی تصور کرتے تھے، اس طرح کل ملا کر ان کے گھر صرف تین ہی افراد تھے۔ یوں تو کوٹھی یا فلیٹ کو دنیا میں رہنے والے ہر چھوٹے بڑے کو وہ اپنا ہی سمجھتے تھے، فلیٹ بہت بڑا تھا۔ اور اس فلیٹ میں رہنے والے سب لوگ گویا ایک ہی گھر کے افراد تھے۔

پانچ سال پہلے جب ان کی اہلیہ محترمہ جہان فانی سے رخصت ہوئی تھیں۔ تب سے وہ بہت خاموش طبیعت کے آدمی ہو گئے تھے لوگوں سے ملتے کم تھے اور سبھا سوسائٹی میں شاذ و نادر ہی شرکت فرماتے تھے۔ لیکن رئیس ہونے کے باوجود چھوٹے بڑے کا فرق نہیں مانتے تھے کئی مرتبہ فلیٹ کے لوگوں کو ان سے گراں قدر خیالات سننے کا موقعہ ملا تھا۔ اکثر وہ کہتے سنے جاتے۔ خدا کی بنائی بنائی ہوئی اس دنیا میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ کوئی انسان حقیر اور ادنیٰ بن کر اس دنیا میں نہیں آتا۔ اور نہ ہی کوئی روپے پیسے اور سرمایہ سے اور نہ کوئی جھوٹی واہ واہ ہی سے بڑا بن کر اس دنیا سے جاتا ہے انسان اپنے عمل ہی سے عظیم بنتا ہے، انسان کو پر خلوص، ہمدرد اور رحمدل بننا چاہئے۔ لوگوں کی ضرورت کا خیال اور احساس ہونا چاہئے!..... وغیرہ وغیرہ۔ شاید یہی زریں خیالات ان کی اپنی زندگی کا بھی جزو بن چکے تھے، اس لئے وہ سب کو برابر اور ایک سا سمجھتے تھے، اور شاید یہی وجہ تھی جو وہ سب کو چاہے وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہو یا بڑا بھائی کہہ کر پکارتے تھے، اکثر وہ فلیٹ میں رہائش رکھنے والوں سے اس طرح اپنا خلوص جتاتے ہی رہتے تھے، وہ انہیں بھی محبت اور پریم سے رہنے کا اُپدیش دیتے۔

فلیٹ کے بچوں سے تو انہیں بے حد محبت تھی، اکثر وہ اپنی بچی کے ساتھ ان سارے بچوں کو لے کر قریب ہی ایک چلڈرنس پارک گھومنے نکل جاتے تھے، بچے ان سے بہت گھل مل گئے تھے، وہ انہیں باپو..... کہہ کر پکارتے تھے، بچوں کے ساتھ پارک میں گھومنا ان کا روزمرہ کا کام تھا، کیوں کہ انہیں بچوں سے خاص محبت تھی، شاید اسی لئے کچھ بچوں کی ماؤں کو بھی ان سے خاص عقیدت تھی۔ بچوں میں

اکثر وہ بسکٹ اور لیمن جوس بانٹا کرتے تھے۔

چھگن جی کی چند عادتیں عام رئیسوں سے بالکل مختلف تھیں انہیں خبریں وغیرہ سننے کا بہت شوق تھا، اس لئے وہ وقت پر ریڈیو ضرور سنتے تھے، لیکن اخبار میں شائع شدہ خبروں کو وہ ریڈیو کی خبروں پر ترجیح دیتے تھے، پھر اخبار پڑھنے میں انہیں کچھ دقت بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اخبار کسی سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ جب وہ مختلف ممالک کے لڑائی جھگڑے کی خبریں سنتے اور اخباروں میں اجڑے نگر، گاؤں اور قصبوں کی تصویریں وغیرہ دیکھتے اور یتیم بچوں اور تباہ حال لوگوں کے فوٹو وغیرہ دیکھتے تو رحم و التفات سے ان کا دل بھر آتا وہ دیا پریم اور اہنسا پر ایک چھوٹا سا لیکچر جھاڑ دیتے۔ آخر میں کہتے، اس گھور کلجگ میں انسان میں دیا اور پریم تو نام کو بھی نہیں، انسان انسانیت سو کوس دور ہے، ہر انسان، ہر قوم، ہر ملک خودغرضی میں مبتلا ہے، سب ایک دوسرے کو ہڑپ لینا چاہتے ہیں۔ دیا اور پریم ہی تو انسان کی زندگی ہے اس کے بغیر یہ زندگی ویران اور خوفناک ہے، اور جس دنیا میں یہ زندگی ہے وہ دوزخ سے کیا کم ہے؟

چونکہ چھگن جی کی زندگی کا اصول دیا اور پریم تھا اس لئے، انہیں یہ سب کچھ برا لگتا تھا۔ وہ چور بازار والوں کے خلاف بولتے سنے جاتے تھے اسی جذبۂ رحم کے تحت دان پن یعنی خیرات وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے اسی دیا بھاؤ کی وجہ سے انہوں نے مکان کرایہ دینے سے پہلے کرایہ داروں سے پگڑی لینی بند کر دی تھی، وہ تو اپنے کرایہ داروں سے کرایہ کا تقاضا بھی نہیں کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں اصول کے پورے پکے تھے، چاہے دیر ہی سے ملے کرایہ کی ایک پائی بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

کچھ دنوں سے ان کے فلیٹ میں ایک نیا کرایہ دار آیا تھا۔ نام تھا اس کا ہربنس لال، وہ مقامی بینک میں کلرک تھا ایک غریب پیٹی کلرک کی اوقات کیا۔ ایک ڈیڑھ سو روپے کی آمدنی میں گھر کا خرچ چلانا اور اس مہنگائی کے زمانہ میں ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس میں اس کی ایک بوڑھی ماں اور بیوہ بہن تھیں ناری کی حیثیت سے مشکل سے دن کاٹ رہے تھے، انہیں بھی تھوڑا بہت خرچ بھیجنا پڑتا تھا۔ بڑی تنگدستی کی حالت میں تھا۔ بیچارہ .. یوں سیدھا سادھا اور بڑا ہی پرخلوص طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کی بیوی سرلا حسین، خوش گو نیک اور سلیقہ مند عورت تھی، جتنی وہ دیکھنے میں حسین تھی دل بھی اتنا ہی حسین تھا۔

چھگن جی نے اس خوش قسمت جوڑے پر خوش ہو کر انہیں فلیٹ کی اوپر کی منزل میں اپنے کمروں کے قریب دو کمرے الاٹ کر دیئے تھے، انہوں نے ہربنس لال کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اکثر وہ اس سے اخبار وغیرہ پڑھوا کر سنتے اور سیاست و سماجی مسئلوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ ہربنس لال جیسا پڑھا لکھا آدمی خاموش رہ کر ان کی ساری باتیں سن لیتا تھا اور بحث کے موڈ میں نہیں آتا تھا۔ انہیں یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوتی تھی کہ سرلا نہ تو دیگر عورتوں کی طرح ان سے شرماتی تھی اور نہ گھبراتی تھی، بلکہ خاموش رہ کر ان کی باتیں سنتی تھی جب کبھی سندھیا ڈھل چکنے کے بعد چھگن جی ہربنس لال کے پاس جا کر بیٹھتے وہ انہیں چائے کی ایک گرم گرم پیالی پیش کرتی۔ انہیں سرلا دیوی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے بہت پسند تھی، کئی بار اس کی تعریف کر چکے تھے، آئندہ چل کر ان کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ وہ ہربنس لال کے قریب بیٹھے بیٹھے آدھے سے زیادہ وقت سرلا دیوی کی تعریف میں بتا دیتے تھے، کبھی وہ اس کے ہاتھوں کے کڑھے میز پوش کی تعریف کرتے تو کبھی کھڑکیوں سے لٹکتے ہوئے پردوں کی۔ اور پھر اس کی ہر عادت اور گھر کی صفائی سے لے کر اس کے پہناوے تک کی تعریف کر جاتے، ہربنس لال جیسا سیدھا سادا آدمی چھگن جی جیسے بزرگ صورت آدمی کی باتیں سن کر ہنس دیتا تھا۔

ہربنس لال کو پیٹ کی ایک بہت خراب بیماری تھی، اسے کبھی کبھی بھوک بالکل نہیں لگتی تھی، کبھی کھائی ہوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی، پیٹ پھولا رہتا تھا اور ریاح کا شکار رہتا تھا۔ ادھر سردیوں میں یہ شکایتیں شدت اختیار کر گئی تھیں اور وہ بڑی تکلیف بھگت رہا تھا۔ کئی دنوں سے پیٹ کے درد کی وجہ سے کام پر بھی نہیں گیا تھا

جان بڑی عذاب میں تھی۔ دیا وان جھگن جی سے اس کا یہ دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ہمدردی کے ناتے وہ اسے کئی بار ہسپتال میں داخل ہو جانے کی رائے دے چکے تھے۔ لیکن ہربنس لال مالی مجبوریوں کی وجہ سے اسپتال میں داخل نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے وہاں کتنے دن لگتے اور کیسا علاج ہوتا۔ اور پھر کتنا خرچ بیٹھتا۔ جھگن جی جن سے کہ ان کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ایک دن ان کے رحم و کرم کا ساگر جوش میں آیا اور انہوں نے اسے اپنی ذمہ داری پر اسے شہر کے ایک خاص ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ ہربنس لال تو پہلے ہی ان کے احسانوں سے دبا پڑا تھا۔ لیکن اس مہربانی سے تو انہوں نے اسے اپنا غلام ہی بنا لیا اسے وہ الفاظ نہیں ملتے تھے جن سے کہ وہ ان کا شکریہ ادا کرے...

جس دن ہربنس لال گھر سے ایمبولنس میں اسپتال لے جایا جا رہا تھا اس نے سرلا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اس لئے اس کا من بھر آیا۔ کتنی مجبور ہے سرلا بیچاری، وہ دل میں یہ بھی سوچ رہا تھا

اس دن اسپتال میں داخل ہو چکنے کے بعد اس نے جھگن جی سے دبے لہجے میں کہا تھا، بابو آپ تو جانتے ہی ہیں اتنے بڑے نگر میں ہمارا اپنا کون ہے، ہمارے سب کچھ آپ ہی ہیں، سرلا بیچاری اب اکیلی رہ گئی ہے، میں نے اسے روتے دیکھا تھا اسے اور زیادہ رونے نہ دیجئے گا، اور دیکھئے چھوٹی بچی کو بھی میری غیر موجودگی کا احساس نہ ہو۔

دیوتا سروپ جھگن جی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا۔ بھیا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں، میں سرلا کو سمجھاؤں گا اور بچی کو اپنے پاس رکھوں گا۔ جس چیز کی ضرورت ہوگی خود لا کر دوں گا۔ بھیا تم بیمار ہو اتنا زیادہ نہ سوچو....

ہربنس لال تب آہستہ سے بولا تھا۔ بابو بڑا احسان ہے آپ کا۔ بڑے مہربان ہیں آپ۔ آپ تو ہمیں اپنوں جیسا ہی جانتے ہیں۔ بڑی مہربانی ہے آپ کی.....

اس دن کے بعد جھگن جی کی سرلا اور اس کی بچی پر خاص عنایت ہونے لگی تھی۔ وہ ان پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے، وہ چھوٹی بچی کو کئی گھنٹے اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ بازار سے طرح طرح کے کھلونے اور اچھی اچھی چیزیں لا کر دیتے فلیٹ کے اور بچوں کی طرف ان کا دھیان کچھ کم ہو گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ سرلا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیتے۔ رات کے وقت اس کے کمرہ میں بیٹھتے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہتے۔ چونکہ عورتوں کے ساتھ وہ دیا اور پریم کی باتیں کرنے میں کچھ زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے، اس لئے ان کی گفتگو کا سلسلہ جلدی ختم ہونے پر نہیں آتا تھا۔ انہیں بڑے بڑے مہان پرستوں اور بزرگوں کے حالات زندگی کو سننے اور سنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے باتیں طول ہوتی جاتیں کسی زمانہ میں شاید وہ بھی کوئی مہان پرش یا بزرگ بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے، لیکن برا ہو اس کلجگ کا جس نے یہ مراد پوری نہ ہونے دی۔

وہ اکثر سرلا دیوی کو اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر اسپتال لے جاتے تھے اور پھر اسے بارونق بازاروں سے گھماتے اور سیر کراتے ہوئے بالکل اندھیرا چھا جانے پر گھر واپس لوٹا لاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے شاید اس طرح سرلا کی طبیعت بہل جاتی ہوگی، لیکن سرلا کو بازاروں کی سیر پسند نہیں تھی اس کے دل پر ہمیشہ افسردگی سی چھائی رہتی اور کبھی خوف سے وہ سہمی سہمی سی رہتی۔ وہ کئی بار جھگن جی سے اسپتال سے سیدھے گھر چلنے کو کہہ چکی تھی۔ لیکن جھگن جی اس کی بات ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ کہتے "اری پگلی" اتنے بڑے نگر میں، اور یہ فلیٹ کے ایک کمرہ میں بند رہ کر آدمی طاعون زدہ چوہے کی طرح مر جاتا ہے، اور پھر تم ایک دبلی پتلی نازک مزاج عورت، تمہیں سیر کرنے کے لئے گھر سے باہر ضرور نکلنا چاہیئے اس سے طبیعت بہل جاتی ہے، ہر وقت اداس رہنا اچھا نہیں۔"

سرلا یہ سب سن کر خاموش رہ جاتی! ہاں جس دن سے ہربنس لال اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ وہ گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا سارا دن گھر میں تنہا بیٹھی چنتاؤں میں کھوئی رہتی، اس کا کسی کام کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ ایک خوف

ایک پریشانی اور ایک بیزاری ہمیشہ اس کے دل پر چھائی رہتی جب وہ زیادہ پریشانی محسوس کرتی تو چھوٹی بچی کو گلے لگا کر اس سے لاڈ پیار کی باتیں کرنے لگتی۔ اس سے بھی دل نہ بھرتا تو چارپائی پر پڑی منہ ڈھانپے آنسو بہاتی رہتی۔ بعد اچانک اسی وقت چھگن جی کہیں سے آ جاتے۔ اسے صبر کی تلقین کرتے۔ تب سرلا دیوی اپنے آپ کو سمیٹتی ہوئی سی اٹھ بیٹھتی۔ شرم سے اس کی آنکھیں جھکی رہتیں۔

ہر شام کو جب وہ ہربنس لال کو دیکھنے جاتی اس سے کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھتی "تم گھر کب واپس چلو گے۔ اب تنہا مجھ سے اس میں بالکل نہیں رہا جاتا۔ نہ جانے کیوں ہر وقت طبیعت گھبرائی رہتی ہے کیسے کیسے منحوس شک مجھے پریشان کئے رہتے ہیں۔ ایک مایوسی میرا سینہ کریدتی رہتی ہے مجھے وہاں کوئی ڈر بھی لگتا ہے۔ وہاں مجھے سب سے ڈر لگتا ہے جلدی چلیں۔ تم اپنا علاج وہیں کرانا۔ وہاں میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ یہاں مجھ سے تنہا نہیں رہا جاتا۔

ہربنس لال کہتا۔ "پگلی ہو تم تو۔ اب میں اسپتال میں داخل ہو چکا ہوں۔ علاج ہو ہی رہا ہے۔ ابھی تو درد کم ہوا ہے، بیماری گئی کہاں ہے کچھ چنگا ہو لوں تو فوراً گھر آ جاؤں گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا بھی تو یہاں جی نہیں لگتا۔ مریضوں کی اس دنیا میں ہمیشہ موت کا سایہ ڈولتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی میں بھی حد سے زیادہ پریشان ہو اٹھتا ہوں۔ کیا کروں مجبوری ہے۔ ابھی بہت کمزور ہوں چل پھر سکتا نہیں دلی کیسے جاؤں گا اور علاج کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔

ہربنس لال کا جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتی۔ ان مجبوریوں کو وہ خود بھی سمجھتی تھی۔ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے ہربنس لال کے پیر دبانے لگتی اور اس طرح اپنا دکھ اور پریشانی بھلا دینے کی کوشش کرتی۔

ہربنس کہتا۔ اس کی توجہ ننھی بچی کی طرف مبذول کرتا ہوا کہتا۔ "اس کی صحت گر رہی ہے تم نہ اس کا خیال رکھتی ہو اور نہ اپنا۔ اتنی زیادہ پریشان نہ رہا کرو۔ میں بہت جلد صحت یاب ہو کر گھر جاؤں گا"

وہ خاموش رہتی۔ ہربنس لال دیکھتا وہ جتنی دیر بھی وہاں بیٹھی رہتی نہ ہنستی نہ مسکراتی، بس ایک اداسی سی اس کے چہرے پر چھائی رہتی۔ یہ نادان عورت نہ جانے گھر میں کتنی اداس رہتی ہوگی .... ! یہ سوچ کر وہ گہری فکروں میں کھو جاتا۔ جب سرلا اس سے رخصت ہونے لگتی تو اس کا من بھر آتا۔ اور جب چھگن جی اس سے خیر خیریت پوچھنے لگتے تو وہ ان سے سرلا کو سمجھانے اور اسے اداس نہ رہنے دینے کی عرض کرتا چھگن جی اسے ہمیشہ کی طرح بے فکر رہنے کی تلقین کرتے۔

ہربنس لال اکثر سرلا سے چھگن جی کی چرچا کرتے ہوئے کہتا۔ "دیکھو سرلا چھگن جی تمہیں پریشان دیکھ کر بہت پریشان رہتے ہیں۔ وہ تمہاری بہت فکر کرتے ہیں آخر تم کچھ تو خیال کرو۔ اگر تم بیمار پڑ گئی تو کیا حالت ہوگی گھر کی ..... !

ایک دن سرلا ہربنس لال کے منہ سے کچھ اس قسم کی باتیں سن کر خاموش نہ رہ سکی۔ وہ کہنے لگی۔ تم میرے لئے چھگن جی کو بیکار پریشان کرتے رہتے ہو۔ میں کوئی نادان بچی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں۔ ہاں کبھی میں اداس ہو جاتی ہوں۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے ایسا سب تنہائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو میرا دم گھونٹ دینا چاہتی ہے مجھے کچا ہی نگل جانا چاہتی ہے، میں گھبرا جاتی ہوں .... لیکن چھگن جی سے تم میری چرچا کیوں کرتے ہو .... چھگن جی، چھگن جی .... لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے .... !

ہربنس لال بولا "جانے دو دنیا کی زبان کو کس نے روکا ہے ہر آدمی کے بارے میں اچھی باتیں نہیں کرتے۔ جو بولتا ہے اسے بولنے دو۔ تمہیں ان باتوں سے کیا..."

مجھے یہ سب سن کر اچھا نہیں لگتا۔" سرلا بولی" کیسی مصیبت میں جان ہے جی چاہتا ہے آج کہیں چلی جاؤں۔ اس گھر میں میرا بالکل دل نہیں لگتا۔

گھبراؤ نہیں۔ ہربنس لال اسے تسلی دیتے ہوئے بولا میں جلدی ہی اچھا ہو جاؤں گا میرا بھی دل دماغ ٹھکانے نہیں رہتا۔"

اُس نے پوچھا۔ تمہارا آپریشن کب ہوگا ....؟

آپریشن! ہربنس لال نے کچھ بناوٹی تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا کیسا آپریشن؟ "تمہارے پیٹ کا!" وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرے پیٹ کا آپریشن ....!" پھر اس سے کوئی بات چھپانہ رکھی۔ ہاں سرلا"

"آپریشن .... جھگن جی نے تمہیں بتایا ہوگا ...... مجھے آپریشن کروانا ہوگا .... لیکن آپریشن کوئی اتنا خطرناک نہیں ....!"

"کتنے روپے لگیں گے ......؟"

"تھوڑے ہی لگیں گے .... مجھے اسپشل وارڈ میں داخل ہونا پڑے گا ....."

"میں روپے کا انتظام کر رہی ہوں ...." وہ بولی۔ میں بھائی کو تار بھیج کر روپے منگا دوں گی"۔ "وہ بیچارہ غریب کیا بھیجے گا" ہربنس لال نے کہا" جھگن جی اس کا انتظام کریں گے۔ میں نے ان سے کہا ہے میں ان کے جواب کا منتظر ہوں"

"لیکن جھگن جی" سرلا کی نظریں نیچے جھک گئیں .... کیا وہ روپے دیں گے ....؟" کیوں انہوں نے خود ہی کہا تھا ...."

سرلا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ..." کیا ہوگا" وہ آہستہ سے بولی۔ لیکن یہ روپے کچھ مہنگے پڑیں گے ...."

"کیسے ......؟" ہربنس لال نے اس سے پوچھا اور تعجب سے اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ چند آنسو کے قطرے اس کی پلکوں سے جھڑ کر اس کی گورے گورے گالوں پر ڈھلک پڑے ....! وہ نرس جو کچھ دیر سے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جب اس نے اسے روتے دیکھا تو دلاسا دیتے ہوئے اسے وارڈ سے باہر برآمدے میں لے آئی۔ اس سے آنسو روکے نہیں رکتے تھے۔ جھگن جی جو برآمدے میں کھڑے تھے اسے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے کار تک لے چلے۔

جب کار اسپتال کی حدود سے باہر نکل کر کھلی سڑک پہ دوڑ رہی تھی، جھگن جی نے سرلا سے پوچھا کیا ارادہ ہے تمہارا سرلا۔ ہربنس لال کا آپریشن کروا دیا جائے؟"

"سرلا آہستہ سے بولی۔ جی .....!"

جھگن جی مسکرا دیئے۔ سرلا نے پوچھا۔ جھگن جی کیا آپریشن کا زخم اچھا ہو جائے گا۔ کہیں ناسور تو نہیں بن جائے گا۔

"بالکل نہیں .... سرلا دیوی بالکل نہیں"۔ انہوں نے للچائی ہوئی نظروں سے سرلا کی طرف دیکھا اور پھر کار کا رخ گھر کی بجائے دور باغ والی کوٹھی کی طرف موڑ دیا جو کل ہی خالی ہوئی تھی .....!

اثر

غزل

ہجوم رنج و بلا میں بھی مسکرائے جا
نیاز عشق کی رنگینیاں بڑھائے جا

ہر ایک ذرہ ہو صد آفتاب در آغوش
نقاب روئے حقیقت سے یوں اٹھائے جا

تجلیوں کی ہو بارش جدھر نظر اٹھے
ضمیر عشق میں وہ بجلیاں چھپائے جا

سنبھل سنبھل کو بہک اور بہک بہک کے سنبھل
ہوائے شوق میں سرمستیاں ملائے جا

وہ راستہ کہ ہے خنجر سے تیز جس کی دھار
اسی پر آپ چل اوروں کو بھی لگائے جا

خدا کے واسطے اے خضر راہ بیتابی
نشان منزل گم گشتگاں بتائے جا

وہی ہے تو جو تری آرزو کا مرکز ہے
بس اتنا دھیان رہے ماسوا بھلائے جا

ابھی ہے دور محبت کی محرمی، یعنی
متاع ہوش رہ شوق میں لٹائے جا

اضافہ اور حجابوں پہ کر حجابوں کا
مری نگاہ کی وسعت کو آزمائے جا

صلاح کار کجا دمن خراب کجا
بقدر ہوش سراسیمگی بڑھائے جا

تمام حسن کی دنیا ہو عشق کی دنیا
حریم دل کو اثر اس طرح سجائے جا

پنڈت سندر لال

ہندی — اور اس کی قومی حیثیت

ہندستانی پارلیمنٹ میں ہندی زبان پر جو مباحث ہوئے تھے اس کے نتیجے میں ہندی کا مسئلہ ایک بار پھر توجہ طلب بن گیا ہے، اس سلسلے میں بہت سارے نظریئے پیش کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک نظریہ بھی صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ ہندی کے وہ خیر خواہ جو اس زبان کو پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مسئلہ کو غیر متعصبانہ اور سائنٹفک طریقے سے حل کریں۔ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ غیر رواداری اور تعصب نے اس زبان کی نشو و نما کو کافی سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ اور اس کے بہت سارے مخالف بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ حالانکہ پچھلے چند برسوں تک ایسی کوئی بات بھی نہ تھی۔

اس بات پر دلیلیں پیش کرنا کہ شمالی ہند کے بیشتر علاقوں میں ہندی بولی جاتی ہے، یا ہندستانی ـــــ لاحاصل ہے۔ ہندی اور ہندستانی یہ دونوں نام غیر ملکیوں نے رکھے ہیں۔ عربوں نے اس زبان کو ہندی کہا۔ اور اہلِ یورپ اور ایرانیوں نے ہندستانی نام رکھا۔ گاندھی جی نے ہندستانی ہی کو ترجیح دی۔

یہ کہنا درست نہیں ہے، کہ ہندی لکھاوٹ کی زبان ہے‘ اور ہندستانی بول چال کی۔ زبان کو دو حصوں میں یعنی لکھاوٹ اور بول چال میں بانٹ دینا خود زبان کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ صرف وہی زبان زندہ رہ سکتی ہے، جو عوام سے زیادہ قریب ہوگی۔ اگر ہندی نے عوام سے اپنا رشتہ نہ جوڑا تو پھر اسے نہ تو قومی زبان کہلانے کا حق ہے اور نہ اس کے پہنچنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

اس ضمن میں چین کی مثال ہمارے سامنے ہے، چین کے ہر صوبہ کی ایک الگ زبان ہے۔ بہت سال پیشتر ڈاکٹر سن یات سین نے اعلیٰ دماغوں کی ایک نشست بلائی تھی۔ اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ پے کنگ کی زبان کی بنیاد پر قومی زبان کی تشکیل کریں۔ کیونکہ وہی زبان اعلیٰ تسلیم کی جاتی تھی۔ اعلیٰ دماغوں نے دن رات کی محنت اور کاوش کے بعد بڑی بڑی ڈکشنریاں مرتب کیں اور قواعد بنائے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے اس زبان کو اپنانے سے انکار کر دیا ڈکشنریاں لائبریریوں کی زینت بن کر رہ گئیں۔ اور قواعد دکانوں میں رہ گئے۔

ایک نسل اسی طرح گذر گئی۔ اور جب چین میں جدید حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اس نے پرانے طریقے کو منسوخ کر کے مختلف صوبائی زبانوں کی ایک وسیع بنیاد پر قومی زبان کا ڈھانچہ تیار کیا۔ اس کشادہ دلی اور وسیع العقلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج چین کی قومی زبان ملک کے تمام حصوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی زبان میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں چھاپی اور پڑھی جاتی ہیں۔

غیر ملکی الفاظ کا اخراج :-

بعض حلقوں میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ جو غیر ملکی الفاظ اور استعارات ہندی میں داخل ہو گئے ہیں، وہ اس زبان سے خارج کر دیئے جائیں۔ دنیا میں ایک زبان بھی

ایسی نہیں ہے، جو غیر ملکی الفاظ سے مالامال نہ ہو۔ اس سلسلے میں انگریزی کی مثال کافی ہے۔ انگریزی زبان نے دوسری زبانوں کے جو الفاظ اپنے اندر داخل کئے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی زبان ہوگی جس کے الفاظ انگریزی زبان میں نہ ہوں۔ اور اس نے ان الفاظ کو اپنے اندر جذب نہ کر لیا ہو۔ صرف ہندستان کے سینکڑوں الفاظ اس زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ انگریزی کے وہ انشا پرداز جنھوں نے کبھی ہندستان کا دورہ نہیں کیا۔ اور جو ہندستان کی کسی زبان سے بھی واقف نہیں ہیں انہوں نے بھی یہاں کے الفاظ استعمال کئے ہیں "MANGO" اور "JACK FRUIT" انگریزی کے یہ دو الفاظ قطعی ہندستانی ہیں۔ یہ دونوں الفاظ "منگا" اور "جیک پازہم" ملائیم میں مستعمل ہیں۔ وہ انگریز جنھوں نے اول اول ہندستان میں یہ پھل کھائے تھے، انہوں نے ان پھلوں کے لئے کوئی نئے الفاظ استعمال نہیں کئے بلکہ ہندستانی نام ہی جوں کے توں لے لئے۔

ہماری یہ کوشش بھی لاحاصل اور بے سود ہوگی، اگر ہم ریل، ٹکٹ، انجن، سائیکل، موٹر، انار، سیب، حلوہ، ساردا، گلاب اور بہت سے دیگر الفاظ جو انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی، عربی، فارسی، ترکی، چینی اور دوسری زبانوں کے آ گئے ہیں، ان کی جگہ نئے الفاظ ایجاد کریں۔ یہ الفاظ ہندی زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ اگر ان الفاظ کو منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم زبان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینک رہے ہیں۔"

سنسکرت کے الفاظ

بعض لوگوں کا یہ غلط عقیدہ ہے، کہ اگر ہندی میں سنسکرت کے ثقیل اور مشکل الفاظ داخل کئے جائیں، تو زبان کی اظہاری صلاحیت دوبالا ہو جائے گی۔ ان احباب کا کہنا ہے کہ ایسے الفاظ کی امداد لئے بغیر ہندی زبان جدید خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس رویہ کی غیر منطقانہ صداقت سے قطع نظر ہمارے ان احباب نے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انگریزی زبان کے نفاذ سے قبل تک ہندی زبان کے اندر انسانی ذہن کے تمام خیالات ادا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اب ہندی آخر اس قدر پیچھے کیوں ہو گئی۔ اس کا ایک سبب ہے، اور وہ سبب یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی زبان ہی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے

بلاشبہ سنسکرت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس زبان میں اخلاق، روحانی، اور فلسفیاتی خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا بھر کے علما و فضلا اس خزانہ سے مالامال ہوتے رہیں گے، لیکن ہندی کو سنسکرت کے زرق برق لباس سے مزین کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اس کے قدرتی نشو ونما سے الگ کیا جا رہا ہے۔ اس کی اظہاری صلاحیت محدود کی جا رہی ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکا جا رہا ہے

اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ سنسکرت کا ہندی زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ سنسکرت کے بیشتر الفاظ مثلاً پاپ، آکاش، سندر، مندر، جال اور میز وغیرہ ہندی میں مستعمل ہیں۔ جدید خیالات کے اظہار کے لئے ضرورت کے موقعہ پر ہندی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی طرف رجوع ہوتی رہے گی۔ لیکن دیگر زبانوں کے الفاظ جب ہندی میں داخل کئے جائیں تو ان کی اشکال کو ہندی کے قواعد کی رو سے بدل دینا چاہئے۔ سنسکرت قواعد کی امداد لینا دانشمندی نہیں ہوگی۔ یہاں بھی انگریزی زبان کی مثال دی جا سکتی ہے اس زبان نے لاطینی اور یونانی الفاظ اپنائے ہیں۔ لیکن زیادہ تر حالات میں ان الفاظ کو اپنے قالب میں ڈھال لیا گیا ہے۔

قدیم الفاظ کا استعمال

ایک اور بھی خطرہ ہے۔ جس سے ہمیں ہوشیار رہنا ہے یہاں

ایسے بھی لوگ ہیں، جو ہندی میں مروجہ الفاظ کو قدیم الفاظ میں بدل دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً "دودھ" اور "اتوار" کے قدیمی ہندی الفاظ "دودھا" اور "ادت یا در" ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مروجہ الفاظ کی جگہ یہ قدیم الفاظ لے لیں۔ لیکن ان کو نہیں معلوم کہ اگر ان کی کوششیں جاری رہیں تو پھر وہی آوازیں باقی رہ جائیں گی۔ اول کتے کی بھونک اور دوم بندر کی بات چیت۔

لیکن جب ہم جدید زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں قدیم الفاظ کے خلاف ایک جدوجہد جاری ہے، یہ زبانیں قدیم الفاظ کو ترک کر دی ہیں۔ یورپ کے اندر نشاۃ ثانیہ کے دور ہی سے اور اب ایشیا کے اندر بھی اس بات کا حیرت انگیز رجحان پایا جا رہا ہے، کہ مردہ اور بھاری بھرکم الفاظ کے خلاف منظم تحریک شروع ہو چکی ہے، انگریزی اس دور سے سولھویں صدی ہی میں گذر چکی ہے بنگالی اور تامل زبانیں اس دور سے گذر رہی ہیں۔ ترکی اور ایران میں بھی حکومت کی حمایت میں یہ تحریک چلائی جا چکی ہے، اگر ہندی میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنے کی کوشش جاری رہی تو گھڑی کی سوئیوں کو پیچھے گھما دینا ہوگا۔

سنسکرت کی حمایت میں ایک اور بھی دلیل دی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر ہندی میں سنسکرت کے الفاظ رائج ہو جائیں تو جنوبی ہند کی زبانیں خاص طور پر اس سے بہت قریب آ جائیں گی۔ اس دلیل میں نصف صداقت ہے۔ مثال کے طور پر تامل اور تیلگو زبانوں میں سنسکرت سے زیادہ پراکرت کے الفاظ رائج ہیں۔ اچاریہ اچاری یا چاری بن گیا۔ سوامی کی شکل سامی میں تبدیل ہو گئی شری راجگوپال اچاری کبھی پسند نہیں کریں گے کہ انہیں راجگوپال اچاریہ کہا جائے۔

مشترک الفاظ:-

ان زبانوں میں بھی دیگر ذرائع سے بہت سارے الفاظ آگئے ہیں۔ ایسے الفاظ کی کمی نہیں ہے، جو ہندی اور جنوبی ہند کی زبانوں میں مشترک نہ ہوں۔ اس دلیل کی صداقت میں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ جو جنوبی ہند کی چار خاص زبانوں میں تھوڑی بہت ردو بدل کے ساتھ مستعمل۔ مثلاً عرض، اصل۔ اکبری، الماری، آسامی انعام، عطر، استری، اقرار، کچہری، بندوبست اور تکرار۔ اس فہرست میں اور بھی ان گنت الفاظ شامل کئے جا سکتے ہیں علاوہ بریں وہ الفاظ جو ہندی اور جنوبی ہند کی چار زبانوں میں مشترک نہیں ہیں، لیکن ہندی اور جنوبی ہند کی ایک یا اس سے زیادہ زبانوں میں مشترک ہیں۔ اس کی تعداد ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ چونکہ ہندی کو قومی امتیاز دینا ہے اس لئے ہندی میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جائیں۔ میں نے جنوبی ہند کا دورہ کیا ہے۔ اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس خطے میں ہندی یا ہندستانی جس میں نام نہاد "غیر ملکی" الفاظ شامل ہیں۔ بڑی آسانی سے سمجھی جاتی ہے، اور لوگ بڑی خوشی سے ان الفاظ کو اپناتے ہیں۔ لیکن نئی اور غیر مانوس زبان جس کو ہمارے احباب زبردستی رائج کرنا چاہتے ہیں، سمجھی ہی نہیں جاتی۔

ہندی کے قدرتی خزانۂ الفاظ کو اگر بھاری بھرکم اور نامانوس الفاظ سے تبدیل کر دیا گیا تو اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلے گا۔ یعنی زبان بامحاورہ نہیں رہے گی اور ناقابل فہم ہوتی جائے گی۔ اگر ہمارے اسکالرنے اس لائن کو اختیار کیا اور "پراروپ" (ڈرافٹ) اور "سلویہ کرت یا ستقبیتی پرواوھان" (ایمرجنسی پروویژن) جیسے ناقابل فہم الفاظ استعمال کئے گئے تو سنسکرت کے پنڈت بھی سمجھنے سے قاصر رہیں گے کیونکہ مذکورہ دونوں الفاظ نہ تو ہندی ہی ہیں اور نہ سنسکرت۔ اس قسم کی مثالوں کا قحط نہیں ہے۔

اُردو کا مقام

چلتے چلتے اردو کے سلسلے میں بھی کچھ کہہ دیا جائے، یہ بحث بہت

نعروں پر چل رہی ہے، کہ اردو کیا مقام حاصل کرے گی۔ حال ہی میں پارلیمنٹ کے اندر بھی اس پر گرما گرم بحث ہو چکی ہے۔ ہندی اور اردو کو گاندھی جی نے کبھی جداگانہ حیثیت نہیں دی۔ اور وہ اپنے اس نظریہ میں ٹھیک بھی تھے۔ لسانیاتی اور تاریخی لحاظ سے ہندی اور اردو ایک ہی زبان کی دو اسٹائلیں ہیں۔ ایک زمانہ تک اردو کا نام کسی نے سنا بھی نہ تھا۔ انیسویں صدی میں غالب نے اپنی زبان کو ہندی کہا۔ پھر کیوں نہ ہم اردو اور ہندی کو ایک ہی حیثیت دیں بالکل اسی طرح جیسے گنگا اور جمنا کی لہریں سنگم میں مل جاتی ہیں گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے۔

اردو نے نہ صرف ہندی کو الفاظ کے ذخیرہ سے مالامال کیا بلکہ اس کے اسٹائل اور اس کے محاورات میں بھی حیرت انگیز طور پر اضافہ کیا ہے۔ اپنے زمانہ میں اس نے کھڑی بول کو ادبی حیثیت دینے میں مدد دی۔ ایسی صورت میں کیا یہ دانشمندانہ فعل ہوگا کہ قوم اس ورثہ کو جو سراسر ہندستانی ہے ٹھکرا دے؟

ہندی اور اردو کو مشترک کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ پورے اردو ادب کو ہندی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے، اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی نصاب میں اس ادب کو داخل کیا جائے، اور اردو کی طرز تحریر کو ہندی کی طرز تحریر کی طرح تسلیم کیا جائے۔

ہندی اور اردو کے مباحثہ کے دوران میں ایک نمایاں حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے —— اور وہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کے بکثرت الفاظ ایک ہی ہیں۔ مثلاً کاشی ناگری پراچارنی سبھا نے جو لغت مرتب کی ہے اس میں تقریباً وہ تمام الفاظ موجود ہیں جو فرہنگ آصفیہ میں ہیں

فرہنگ آصفیہ میں ۵۶ ہزار الفاظ ہیں۔ جن میں عربی اور فارسی کے تیرہ ہزار سے زائد الفاظ نہیں ہیں۔ ترکی اور یورپی زبان کے ایک ہزار اور بقیہ ۴۰ ہزار سے زائد الفاظ خالصاً ہندی زبان کے ہیں۔ واضح رہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک اردو ادب میں ہندی کے الفاظ اور اس کی اظہاری حیثیت چھائی ہوئی تھی اردو کے بیشتر شعراء ہندی زبان کے عالم ہوا کرتے تھے، اور وہ ہندی میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کے دور میں بھی بہتر سے اچھے شعراء کو ہندی پر عبور حاصل تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اردو شعراء کی وہی تخلیقات زیادہ سراہی گئیں جن میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار نہیں ہے۔ میر، سودا، غالب اور حالی کے کلام کا جن لوگوں نے بھی اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت کو ضرور تسلیم کریں گے۔ ان اردو شعرا کا کلام جب دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا گیا تو ہندی بولنے والے عوام میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان ساری باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندی اور اردو کا تنازعہ قطعی غیر فطری ہے، جسے محض جہالت اور تعصب نے ہوا دے کر بھڑکا دیا ہے حق تو یہ ہے کہ اردو زبان میں جتنے الفاظ ہیں وہ ہندی بولنے والے عوام کی زبان اور ادب میں داخل ہیں۔ اردو کی طرح ہندی کے بھی وہی شعراء اور ادبا مقبول ہیں جنکو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے اس سلسلے میں بھارتیندو ہریش چندر، بالمکند گپتا، مہابیر پرشاد، پریم چند اور پدما سنگھ شرما کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

تاریخی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو یہ رجحان کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔ ہمارا کلچر ہمیشہ جذب پذیری رہا ہے۔ ہم نے دوسروں سے بہت کچھ لیا ہے اور بہت کچھ سیکھا ہے، سیاسی تمدنی اور لسانی چشمے از منۂ قدیم سے ہندستان میں پھوٹتے رہے ہیں۔ ہم نے ان چشموں سے اپنی پیاس بجھائی ہے اور انہیں اپنایا ہے۔

جب یہ بات ہے تو پھر ہم فارسی اور عربی کے چند ہزار الفاظ کو کیوں نہیں اپنا لیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں؟ ہندی بڑی آسانی سے ایسا کر سکتی ہے ہماری بہت ساری موجودہ مشکلات کا حل ہماری کشادہ دلی اور وسیع النظری میں مضمر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا ملک صحیح نقطۂ نظر تک پہونچے گا۔ کیونکہ نہیں مستقبل کی امید ہے۔

میکش اکبرآبادی

دیپک راگ

چپ رہنے کا وقت نہیں ہے چھیڑیں دیپک راگ
اس پاپی سنسار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

اس گلشن میں چور چھپے ہیں ان کنجوں میں ناگ
ان کلیوں میں خون بھرا ہے ان پھولوں میں آگ
ان نہروں میں زہر ملا ہے ان پیڑوں میں ناگ
ہے ہر گلزار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

زور آور کو دیں جو سہارا کمزوروں کو مار
ظالم کی تائید کریں اور مظلوموں پر وار
یکساں قانون اور مذہب یہ کیسا کردار
ایسے ہر کردار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

جو انساں سے بیر بنائے خود اس سے منھ موڑ
جو دنیا میں کام نہ آئے اس مذہب کو چھوڑ
دین دھرم مندر مسجد اک دل کے سوا سب توڑ
بیچ و زنار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

محنت کر کے بھوک ملے بے محنت موہن بھوگ
سیٹھوں کو امرت ساگر اور مزدوروں کو روگ
دوکانوں میں مال بھرا ہے اور گھروں میں سوگ
ایسے ہر بیوپار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

بے خبروں کی سو خبریں ہیں یہ کیسے اخبار
ہر فقرہ ایٹم بم ہے اور ہر سرخی بمبار
پربت بے رائی کے بنائیں بے دلنے انبار
ایسے ہر اخبار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

★

چپ رہنے کا وقت نہیں ہے چھیڑیں دیپک راگ
اس پاپی سنسار میں ساتھی آگ لگا دیں آگ

زکی انور

دعوتِ شیراز

ایک ہفتے تک مسلسل، دن میں تین تین چار چار بار وزیر خوراک کے محل پر جبیں سائی کرنے کے بعد اکتیسویں بار روشنی محل کے پھاٹک پر پہنچی تو اسے سنتریوں سے معلوم ہوا کہ ان اب وزیر خوراک صاحب محل ہی میں تشریف فرما ہیں۔

یہ سن کر روشنی کو ایسا لگا جیسے اسے علاء الدین کا چراغ نہیں تو کم سے کم کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا۔ اس نے ایک طویل ٹھنڈی اور مطمئن سانس لی اور ایک سنتری کے اشارہ کرنے پر پھاٹک کے کنارے پڑی ہوئی ایک آہنی بنچ پر بیٹھ گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ مرتے ہوئے کھیتوں میں جان نہیں ڈال سکتی، سوکھے پودوں کو ہرا بھرا نہیں کر سکتی اور پانی نہیں برسا سکتی تو کم سے کم اتنا ضرور ہوگا کہ وزیر خوراک صاحب پانچوں قحط زدہ گاؤں کے مرتے ہوئے بچوں کے لئے خوراک کا انتظام کر دیں گے، ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ آ جائے گا اور بلکتے بچوں کے لبوں پر ہنسی، اور یہ سب سوچ سوچ کر روشنی مسکرانے لگی۔

پانچ بڑے چوڑے گاؤں بری طرح قحط کے شکار ہو گئے تھے، پانی ایک بوند بھی نہیں برسا تھا اور کھیت سوکھ گئے تھے، پودے مر گئے تھے اور فصل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے تو سارا کا سارا شمشان دلیش بنا ہوا تھا بزدل گاؤں کا پوچھنا ہی کیا۔ لوگ حاکموں کے سامنے جانے سے بھی تھر تھر کانپتے تھے۔ پھر جانے کہ وہ ان سے خوراک مانگتے اور دکھڑا روتے۔

ان پانچ گاؤں میں ملیڈا ایک گاؤں تھا جہاں کی روشنی تھی۔

روشنی کوئی پڑھی لکھی لڑکی نہیں تھی، مگر وہ دور دور مشہور تھی اپنی شہرت کا سبب اس کی بے پناہ شرارت تھی۔ ملیڈا تو ملیڈا۔ دور کے گاؤں کے لڑکے اس سے پناہ مانگتے تھے، دور سے روشنی کو دیکھ کر کترا جاتے، گلیوں میں گھس جاتے یا گھنے کھیتوں کھو جاتے، بوڑھے، بچے، عورت، مرد سب ہی روشنی کی شرارتوں سے عاجز تھے۔ روشنی کی شرارتیں محفلوں میں اور چوپالوں پر لطیفے کے طور پر مزے لے لے کر بیان کی جاتی تھیں۔

مثلاً ایک بار ملیڈا کی پنچایت نے فیصلہ کیا کہ روشنی کو گاؤں سے نکال دیا جائے۔ اس کے والدین نے پنچایت کے سامنے لاکھ ہاتھ پاؤں جوڑے اور آرزو منت کی مگر روشنی گاؤں سے نکال دی گئی۔ جاتے وقت روشنی نے گاؤں کے سردار سے کہا۔ مجھے گاؤں سے باہر نکال کر تم سب کے سب پانی کے لئے ترس گے ــــ اور یہی ہوا۔

روشنی گاؤں سے نکل کر سیدھے شہر پہنچی۔ اپنے پاؤں کے موٹے موٹے چاندی کے کڑے بیچ کر اس نے بہت سارا کونین خریدا اور رات کو چپکے گاؤں آ کر اس نے گاؤں کے کوئیں میں ڈال دیا!

دوسرے ہی دن لوگ روشنی کو ڈھونڈھ کر گاؤں لے آئے۔

گاؤں کے کسی لونڈے نے روشنی کو چھیڑا تھا۔ روشنی نے اس کا ایک کان کاٹ لیا تھا۔

ایسے ہی کتنے قصے تھے جو ملیڈا کے علاوہ دوسرے نواحی گاؤں میں مشہور تھے۔

قحط کے سلسلے میں حکومت سے مدد مانگنے کے لئے ہر ایک گاؤں

علامہ آرزو مرحوم

نرب دہلوی

پروفیسر ہیرا لال چوپڑا ایم۔ اے

پنڈت رتستہ پرشاد ”فدا“

نریش کمار ”شاد“

دیوندر اِسر ایم۔ اے

گوربچن سنگھ

شکیل الرحمٰن

زکی انور

میں پنچایت ہوئی۔ مگر کسی بھی گاؤں کا کوئی بھی ماں کا لال وزیر خوراک کے پاس جانے کی ہمت نہ کرسکا۔

ملیڈا کی پنچایت میں بھی جب وزیر خوراک کے پاس جانے کا سوال اٹھا تو سب کے سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اسی وقت روشنی نے بڑے غصے سے اپنے ہاتھ کی چوڑیاں نکال کر بیچ پنچایت میں پھینک دی تھیں اور کہا تھا۔

"تم لوگ چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھو میں وزیر خوراک کے پاس جاؤنگی۔"

نشستان دلیش کی حکومت کے ظلم و ستم کے اتنے قصے مشہور تھے کہ روشنی کا یہ ارادہ سن کر اس کے والدین نے چھاتی پیٹ لی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ روشنی کو گرفتار کرلے گا اور جیل میں ٹھونس دے گا۔ سردار نے روشنی کو سمجھایا کہ "بیٹی یہ کام لڑکیوں کا نہیں۔" روشنی نے جواب دیا۔ "کیا یہاں کے لڑکے بزدل ہیں؟"۔ سردار نے کہا۔ "اچھا میری ماں لڑکے بزدل ہیں مگر تو بہادری نہ دکھلا۔ روشنی نے جواب دیا۔" میرے باپ تم فکر مت کرو۔" سردار نے حکم دیا۔" روشنی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں۔" روشنی نے چلا کر کہا۔" میری فکر میں پھرا ہے۔ ائے کون آتا ہے۔"

سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

اور۔ روشنی تیر کی طرح نکل بھاگی۔ سیدھے شہر پہنچی، وزیر خوراک کے محل کے پاس پہنچی، اور پھاٹک پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وزیر خوراک صاحب شہر کے کسی کالج کے کنارے کے برگد کا درخت کاٹنے کی رسم ادا کرنے گئے ہیں۔

روشنی واپس آگئی

پھر گئی تو معلوم ہوا کہ وزیر خوراک صاحب لڑکیوں کی کسی انجمن میں عمدہ سبزی پکانا سکھانے کے کلاس کا افتتاح کرنے گئے ہیں۔ روشنی پھر واپس ہوگئی۔

پھر گئی تو پتا لگا کہ وزیر خوراک صاحب سائنس دانوں کی ایک کانفرنس کی صدارت کرنے گئے ہیں۔ جہاں پالا سے روٹی پکانے کی اسکیم پر غور کیا جانے والا ہے، روشنی کی امیدوں پہ پانی پھر گیا۔

لیکن وہ ہمت نہ ہاری۔ پھر گئی تو معلوم ہوا کہ وزیر خوراک صاحب حلوائیوں کی ایک کانفرنس میں گئے ہیں جہاں کاغذ سے پیڑے تیار کرنے اور اس کی بالائی نکالنے کے بارے میں غور کیا جانے والا ہے۔ روشنی کی امیدوں پہ اوس پڑگئی۔

پھر بھی وہ ہمت نہ ہاری، اور پھر گئی، تو پتا چلا کہ وہ جھک مار رہے ہیں اور سات گھنٹوں تک جھک ماریں گے، اور اتنی دیر تک وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔ روشنی نے حساب لگایا تو ایک بجے رات کو وزیر خوراک صاحب کو جھک مارنے سے فراغت نصیب ہوگی پھر اتنی رات تک وہ کہاں جھک مارے گی۔ بیچاری پھر واپس ہوگئی۔

اب وہ بہت نراش ہوتی جارہی تھی لیکن دوسرے دن وہ پھر آئی۔ اور تب اسے پتہ چلا کہ وزیر خوراک صاحب کے چچیرے بھائی کے پوتے کے سالے کا چچا کسی مڈل اسکول کا ٹیچر تھا اور کسی وجہ سے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ اس مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا سر نیچا کرنے کے لئے اپنے اس چچیرے بھائی کے پوتے کے سالے کے چچا کے خاندان کے سارے لوگ بچے عورت، مرد، بوڑھے بچے، سب کو نشستان دلیش کی مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بنانے کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے

اس طرح "بیس" بار وزیر صحت کے محل کے پھاٹک سے ناکام لوٹنے کے بعد اکیسویں بار روشنی نے یہ روح افزا خبر سنی تھی کہ وزیر خوراک صاحب محل ہی میں ہیں اور جھک بھی نہیں مار رہے ہیں۔ چنانچہ ملاقات ہوسکتی ہے۔ اور روشنی اب بڑے اطمینان سے محل کے پھاٹک کے کنارے کی بینچ پہ بیٹھی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی، وہ کتنی غریب ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے کس قدر نفسی نفسی ہیں، مگر پھر بھی اس کا گاؤں اس کا اپنا گاؤں ہے جس گاؤں کے لوگ اس کے اپنے لوگ ہیں۔ گاؤں کے بچے اس کے اپنے بچے ہیں۔ اور اپنے گاؤں۔ اور اپنے لوگ، اپنے بچوں سے اسے کتنا پیار ہے! بھولے بھالے بچے، جن کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھن گئی ہے جن کی ماؤں کی چھاتیوں کا دودھ سوکھ گیا ہے۔

اور اس وقت کبھی کبھی کی طرح روشنی اپنے بچوں کے بارے میں

سوچنے لگی۔ مجھے شادی کر لینی چاہیے، اگر میں شادی کر لوں تو ماں کتنا خوش ہوگی، باپ ڈھول بجائے گا۔ برآنی ناچے گی روتی ناچے گی، تیو بلی گائے گی۔ سب کی سب مل جل کر مجھے دلہن بنائیں گی اور میں شرماؤں گی سچ مچ کتنی شرم کی بات ہے کسی کی بیوی بن جانا۔ اور پھر بچے جننا۔ ارے توبہ میں تو لاکھ شریر سہی مگر مجھ سے تو پیٹ لئے پنگھٹ پر جانا پار نہیں لگے گا۔ چھی۔ کلتی تو کمال کرتی ہے آخر آخر مہینے تک ڈگر ڈگر ڈول ڈال۔ ہنہ۔ مگر بچے قسم پیدا کرنے والے کی۔ بچے تو زیور ہوتے ہیں مینا اپنے چاند سے بچے کو گود میں چھپائے ایسی لگتی ہے جیسے کم بخت پری ہو۔ نگوڑی کا حسن نکھر جاتا ہے۔ مگر اس کا بچہ۔ اُف وہ سوکھ کر کلیا کا کانٹا ہو گیا ہے....."

سنتری جی!" یک لخت اس کا خیال بھنگ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ایک سنتری سے پوچھا "وزیر خوراک صاحب سے کب اور کیسے ملاقات ہوگی؟"

"وزیر نہیں، منتری کہو، منتری" سنتری نے ٹوکا۔

"کیا وہ وزیر نہیں منتری ہیں؟" روشنی نے معصومیت سے پوچھا۔

"وہاں ان کا نام منتری ہے" سنتری نے دھونس جمایا۔

"کیا وہ تمہارے بھائی ہیں؟" روشنی اس کی طرف حیرت سے تکنے لگی۔

"نہیں بیوقوف!" سنتری ہنسا "یہ تجھے کس نے کہا گنوار لڑکی؟"

"واہ!" روشنی ہنسی "سنتری کا بھائی منتری"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں" سنتری ہنسنے لگا۔

"تو پھر منتری کیوں؟" روشنی نے پوچھا "کیا وہ منتر پڑھنا جانتے ہیں؟"

"نہیں نہیں نہیں" سنتری کھسیا گیا۔

"اچھا بابا — وزیر نہ سہی، منتری۔ منتری کچھ بھی سہی مگر ان سے ملاقات کب ہوگی؟" روشنی نے پوچھا۔

"اپنا نام، باپ کا نام، ماں کا نام، بھائیوں کے نام، بہنوں کے نام، سب کی عمریں۔ گاؤں کا نام، گاؤں کی چودھری۔ گاؤں کا رقبہ......"

سنتری ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ مگر روشنی نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ذرا چھوٹی چھوٹی باتیں بولا کرو" روشنی کہنے لگی "تمہارا منہ چھوٹا ہے تم اتنی لمبی بات مت بولو"

"مگر تجھے وہ سب کچھ لکھ کر منتری جی کے پاس بھیجنا ہوگا" سنتری نے کہا "بلکہ ابھی بہت سی چیزوں کے بارے میں تو نے تو مجھے بتایا ہی نہیں"

"دل کی حسرت پوری کر لو" روشنی نے کہا "بتاؤ اور مجھے کیا کیا لکھنا ہوگا؟"

"گاؤں کا رقبہ" سنتری کہنے لگا "گاؤں کے کنوئیں کی تعداد۔ ان کی گہرائی۔ ان میں ڈوب کر مرنے والوں کی تعداد۔ ان کی عمریں، وہ کیسے ڈوبے، کیوں ڈوبے، ڈوبے تو بھیگے یا نہیں، بھیگے تو پھر سوکھ پائے نہیں سوکھے تو پھر مرے یا نہیں، مرے تو پھر کہاں گئے—؟ اور آخر میں لکھو کہ تم کس لئے منتری جی سے ملنا چاہتی ہو، کتنی دیر وقت لوگی، کتنی باتیں کروگی کتنی باتیں سچی ہوں گی اور کتنی جھوٹی—"

"بس یا اور؟" روشنی نے پوچھا۔

"بس یا اور؟" دوسرے سنتری نے تیسرے سنتری سے پوچھا۔

"بس یا اور؟" تیسرے سنتری نے چوتھے سنتری سے پوچھا۔

"بس یا اور؟" چوتھے سنتری نے پانچویں سنتری سے پوچھا۔

"بس یا اور؟" پانچویں سنتری نے چھٹے سنتری سے پوچھا اور چھٹا سنتری یک لخت بگڑ اٹھا۔

"سالے تم سب سرکار کا مفت کا پیسہ کھاتے ہو، یہ بھی نہیں جانتے کہ ملنے والوں کو کیا کچھ لکھنا پڑتا ہے"۔ پھر وہ روشنی کی طرف سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "لکھو بیٹی....."

"بیٹا! میں لکھنا نہیں جانتی" روشنی بڑی بے تکلفی سے بولی۔

"ہائیں تو نے مجھے بیٹا کہا!" چھٹا سنتری منہ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ماں! تو نے مجھے بیٹی کہا؟" روشنی ناک سکیڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا تو نے مجھے جنم دیا ہے کم بخت؟" چھٹا سنتری دانت پیسنے لگا۔

"کیا تو نے مجھے پیدا کیا ہے بدبخت؟" روشنی زبان نکال کر اسکا منہ چڑانے لگی۔

"اچھا میری ماں سن" چھٹا سنتری لاجواب ہو گیا۔

"اچھا میرے باپ سنا" روشنی مسکرانے لگی۔ اور چھٹا سنتری کہنے لگا۔

"یہ لکھ کر، تیری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ ہوئی ہے تو بیوی کی عمر کیا ہے۔ بیوی کا نام . . . ."

"بیوی؟ — یعنی کہ میری بیوی؟ —" روشنی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں ہاں۔" چھٹا سنتری کہنے لگا "مجھے سب کچھ زبانی یاد ہے بیوی کا نام کیا ہے۔ بیوی کے باپ کا نام کیا ہے۔ بیوی کے باپ کی بیوی . . . . ."

"مگر بیوی؟ — سنتری جی — میں عورت ہوں" روشنی بدستور ہنستی رہی۔

"وہ میں دیکھ رہا ہوں میری ماں" سنتری اکتا کر بولا "مگر میں کیا کروں مجھے ملاقات کرنے کی درخواست کے سارے کام زبانی یاد ہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں اس میں بیوی ہی کے نام وغیرہ پوچھے گئے ہیں۔"

"تو وہ درخواست مردوں کے لئے ہوں گے" روشنی نے کہا "میں تو عورت ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا ہے۔"

"تو پھر منتری جی سے ملنا محال ہے" چھٹے سنتری نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" روشنی نے کہا۔

"یہی ہو گا" سنتری نے کہا۔

"میں منتری جی سے ضرور ملوں گی" روشنی بولی۔

"جنتری نہیں منتری" سنتری نے ٹوکا۔

"وہی مگر میں ضرور ملوں گی" روشنی بولی۔

"نہیں ہو سکتا" سنتری گرجا۔

"ہو سکتا ہے" روشنی چلائی۔

"واپس جاؤ" سنتری چیخا۔

"میں ملوں گی" روشنی چیخی

اور اس گرجا گرجی میں وزیر خوراک صاحب محل کے بالاخانے کے چھجے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کچھ دیر تک کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے بڑی شان سے پکارا۔

"فریادی کو اندر آنے دو"

"مگر یہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی اور اس نے ملاقات کی درخواست"

"کوئی بات نہیں" وزیر خوراک صاحب نے پکارا "آنے دو"

سارے سنتری ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، روشنی نے سبھوں کو زبان نکال کر منہ چڑایا۔ ایک کی ناک پکڑ لی۔ دوسرے کی چٹکی لی اور دوڑ کر بھاگی اور محل کے اندر گھس گئی

"فریادی کو اندر لایا جائے" وزیر خوراک صاحب نے پھر چلا کر کہا اور ایک آدمی روشنی کو ساتھ لے کر اندر آیا۔

روشنی وزیر خوراک کے دفتر میں لائی گئی جو محل کے اندرونی حصے میں تھا جلدی ہی وزیر خوراک مسکراتے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

"وہ سنتری لوگ تمہیں دق کر رہے تھے!؟"

"جی نہیں منتری جی!" وہ کہنے لگی۔ "مجھے تو دق کوئی بھی نہیں کر سکتا، سنتری یا منتری چاہے جنتری ہی کیوں نہ ہو!"

"تم بڑی دلچسپ لڑکی ہو" وزیر خوراک نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود صوفے پر لیٹتے ہوئے بولے۔ "کہو کس لئے آئی ہو؟"

"میرا گاؤں بیلڈا اور آس پاس کے چار اور گاؤں بری طرح قحط کے شکار ہیں۔" روشنی کہنے لگی "اسی لئے میں جلد سے جلد آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن آپ برابر مشغول رہے۔ آج معلوم ہوا کہ آپ محل میں ہیں بھی

تو کمبخت سنتری لوگ میری بیوی کی عمر اور نام پوچھنے لگے۔ بغیر یہ سب کچھ لکھے آنے ہی نہیں دیتے تھے!"

"ہاں۔ وہ بیچارے قانونی ضابطے سے مجبور تھے۔" وزیر خوراک نے سنجیدگی سے کہا۔

"خیر جانے دیجئے۔" روشنی بولی۔ اب یہ سوال ہے کہ آپ جلد سے جلد میرے گاؤں اور چار دوسرے گاؤں کے لوگوں کو قحط سے بچانے کی صورت نکالئے۔ معصوم بچے بلک بلک کر مر رہے ہیں۔ ان کی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ سوکھ گیا ہے۔ عورت، مرد، جوان، بوڑھے...."

وزیر خوراک صاحب زور سے ہنسے اور روشنی بات پوری نہ کر سکی

وزیر خوراک صاحب نے پوچھا۔

"کیا تم سچ مچ جاہل لڑکی ہو یا محض شرارت سے کہہ رہی تھیں؟"

"جی میں باضابطہ طور پر جاہل ہوں؟" روشنی نے جواب دیا۔ اور وزیر خوراک صاحب کہنے لگے:

"پھر تو تعجب ہے کہ تم قحط کی تفصیل بالکل انہیں الفاظ میں کیسے بیان کر رہی ہو۔ جن الفاظ میں کمیونسٹ لوگ بیان کیا کرتے ہیں۔"

"ایسی بات ہے تو مجھے بھی حیرت ہے۔" روشنی بولی۔

"اور جانتی ہو؟" وزیر خوراک صاحب کہنے لگے "کمیونسٹوں کے الفاظ میں کچھ بیان کرنا سرکاری گناہ ہے۔ مگر میں نے تمہیں معاف کیا۔"

"شکریہ!" روشنی مسکرائی۔ اب بتائیے حضور قحط زدہ گاؤں کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟"

"سنو۔" وزیر خوراک صاحب کہنے لگے۔ "تم مجھے ان پانچوں گاؤں کے نام لکھوا دو میں ملک کے بڑے بڑے اخباروں میں ان پانچوں گاؤں کے متعلق ایک بڑا لمبا چوڑا ہمدردانہ بیان دے دیتا ہوں"

"مگر حضور،" روشنی بولی "وہاں کے لوگ جو بھوک کے مر رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" وزیر خوراک صاحب بولے۔ "میں یہ سب کچھ بیان میں لکھوں گا۔"

"مگر صرف بیان دینے سے کیا حضور،" روشنی نے کہا۔

"تو پھر اور میں کیا کرسکتا ہوں۔ میرے پاس علاء الدین کا چراغ تو ہے نہیں۔" وزیر خوراک صاحب نے کہا۔

"وہ تو نہیں ہوگا سرکار۔" روشنی بولی "مگر منتری جی خزانہ تو ہے اس سے کافی مدد ہو سکتی ہے۔"

"خزانہ عوام ہی کا ہے۔" وزیر خوراک کہنے لگے۔ "مگر ہم لوگ اسے صحیح طریقے پر استعمال کرنا جانتے ہیں۔ یوں قارون کا خزانہ تو نہیں کہ ہم حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے پھریں، ابھی ہمیں سینکڑوں اسکیموں پر اربوں روپے خرچ کرنا ہے، تم کیا جانو۔ ہم شبنم سے بالائی نکالنے کی فکر میں ہیں پانی سے روٹی تیار کرنے کی فکر میں ہیں اور ردی کاغذ سے پیڑا بنائیں گے۔"

"جی ہاں وہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔" روشنی کہنے لگی۔ "بلکہ حضور افسوس یہ ہے کہ میری نانی مرگئی ورنہ وہ ضرور کوئی وزیر ہوتی۔ اسے ہوا کا حلوا پکانا آتا تھا۔ مگر ہم لوگوں کو تو صرف ہوا کے قلعے بنانا آتے ہیں۔"

"کیا تم سچ مچ جاہل ہو؟" وزیر خوراک نے پھر پوچھا۔

"جی سرکار۔" روشنی نے جواب دیا "حضور کو یقین کیوں نہیں ہوتا؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم جاہل ہو۔" وزیر خوراک نے کہا۔ "تم درختوں پودوں اور پتوں کے فائدے سے قطعی ناواقف ہوگی۔"

"جی ہاں۔" روشنی نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر کسی دن منتری جی درختوں اور پودوں کے پتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے پھر حاضر ہوں گی۔ سردست تو قحط زدہ...."

"ہاں ہاں۔" وزیر خوراک صاحب بولے "قحط زدہ گاؤں کو بچانے ہی کے سلسلے میں میں درختوں اور پودوں کے پتوں کے فائدے بیان کر رہا ہوں، پتے بڑے مفید ہوتے ہیں۔ چاول اور گیہوں سے کہیں زیادہ مفید۔ تم دیکھتیں نہیں بکریاں صرف اور صرف پتے کھاتی ہیں اور انہیں کبھی کوئی مرض نہیں ہوتا۔ پتوں میں طرح طرح کی بیماریوں کے جراثیم کو مارنے کی طاقت ہے، جب ہی تو بکریوں کو نہ ٹی بی ہوتی ہے نہ لیکوریا، نہ کوڑھ، نہ کالرا، نہ دمہ، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور کیسی موٹی تازی رہتی ہیں بکریاں۔ گھوڑوں کو دیکھو، گدھے کی مثال بھی کافی ہے، گائے بھینس

کو ہی لے لو۔ الغرض درختوں اور پودوں کے پتے بڑے مفید ہوتے ہیں"
حضور کی باتیں میں سمجھ گئی"۔ روشنی بولی۔ "اور میں نے مان لیا کہ بیشک پتے بڑے مفید ہوتے ہیں مگر قحط زدہ ....."

"ہے ہے ہے"۔ وزیر خوراک صاحب اکتا سے۔ "کبھی لوگوں کو پتے کھانے کی عادت سکھلاؤ غلہ نہیں پیدا ہوا تو کیا ہوا؟ ہمارے ملک میں جنگل کی کمی نہیں۔ پتے افراط ہیں۔ جاؤ انہیں پتے کھلا کر زندہ رکھو۔"

اس کے بعد بھی وزیر خوراک صاحب کافی دیر تک روشنی کو مختلف درختوں کے پتوں کے مختلف فائدے بتاتے رہے اور وہ خاموشی سے ان کا منہ تکتی رہی اور دو گھنٹوں تک پتوں کے بارے میں تفصیلی طور پر معلوم کرنے کے بعد اس نے وزیر خوراک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رات بیستی ہوئی یا دپشکی ہوئی محل سے واپس ہو گئی۔

روشنی نے گاؤں کو قحط سے بچانے کا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔ اس لئے پہلے تو کئی دنوں تک بڑے اطمینان سے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شہر میں اپنا جسم بیچتی رہی۔ اور بعد میں اسے اپنے ایک ڈاکو گاہک سے واسطہ پڑا۔ اور وہ ڈاکے ڈالنے لگی اور جب گاؤں میں نفسی نفسی کا عالم ختم ہو گیا لوگوں کو کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو ایک دن روشنی نے وزیر خوراک صاحب کی دعوت کا پروگرام بنایا۔

اب کے گیارہ بار وزیر خوراک کے محل کی جبیں سائی کرنے کے بعد روشنی وزیر خوراک سے ملنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے وزیر خوراک کو دعوت کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے معذوری ظاہر کی کیوں کہ ادھر انہیں ایک خوراکی ہفتہ منانے کے سلسلے میں بہت مشغولیت تھی۔ جس خوراکی ہفتے میں طرح طرح کی گھاس پھوس سے خوراک تیار کرنے کی اسکیموں پر غور کیا جانے والا تھا لیکن روشنی نے وزیر خوراک صاحب کا ایک پاؤں پکڑ لیا اور بتایا کہ وہ اس وقت تک ان کا پاؤں نہیں چھوڑ سکتی جب تک وہ دعوت میں شرکت کا پورا پورا وعدہ نہیں کر لیتے۔ آخر وزیر خوراک صاحب نے وعدہ کر لیا۔ اور دعوت کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

وزیر خوراک صاحب کی دعوت کے دن ایک بہت بڑے پبلک جلسے کی تیاری کی گئی۔ وزیر خوراک صاحب دیئے ہوئے وقت سے چار گھنٹے بعد تشریف لائے۔ اور انہوں نے اپنی تقریر میں سب سے پہلے اپنی تاخیر کی وجہ ہی بتائی۔ اور کہا کہ ہم منتری لوگ کہیں بھی کبھی بھی جلسے میں ٹھیک مقررہ وقت پر نہیں پہونچتے یہ خاص رسم ہے'

اس کے بعد وزیر خوراک صاحب نے اپنی تقریر شروع کی اور وہ دو گھنٹوں تک اپنی تقریر میں درخت اور پودوں کے پتوں کی خوبیاں بیان کرتے رہے اور لوگوں کو نصیحت کرتے رہے کہ اگر انہیں تندرستی عزیز ہے اور وہ بکریوں، گھوڑے، گدھے اور دوسرے چرند جانوروں کی طرح تندرست اور صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو پتے کھایا کریں۔

تقریر ختم ہوئی تو وزیر خوراک صاحب کو دعوت کے کمرے میں لے جایا جانے لگا اور گاؤں والوں کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں وہ حد سے زیادہ خوف زدہ نظر آنے لگے مگر روشنی بڑے اطمینان سے مسکرا رہی تھی، اتنے میں روشنی کی ماں نے اشارے سے روشنی کو ایک طرف بلایا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگی۔

"بیٹی۔ اب بھی تو اپنے ارادے سے باز آجا۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ شرارت کرنے کی سزا تجھے ضرور ملے گی، باز آجا بیٹی"
مگر روشنی زور سے ہنسی اور کچھ بھی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اور وزیر خوراک صاحب کو ساتھ لے کر دعوت کی طرف جانے لگی، اب صرف وہ تھی اور وزیر خوراک صاحب، گاؤں کے سارے لوگ ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، بلکہ ان میں سے بہت سارے روشنی کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

وزیر خوراک صاحب دعوت کے کمرے میں پہنچے تو میز پر سجی ہوئی خوراکیں دیکھ کر چونک پڑے!

ایک لمبی چوڑی میز پر صاف شفاف خوبصورت چادر بچھی ہوئی تھی، اور اس پر بہت ساری خوبصورت چینی کی پلیٹوں میں طرح طرح کے خوبصورت، بدصورت پتے، بڑی خوبصورتی سے سجے تھے وزیر خوراک صاحب نے روشنی کی طرف بڑی خشمگیں نظروں سے دیکھا

اور روشنی عجیب دلفریب انداز میں مسکرا اٹھی پھر کہنے لگی۔

"آگے بڑھئے حضور" اس نے وزیر خوراک صاحب کا ہاتھ پکڑ کر میز کے سامنے ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھا دیا۔ "شوق فرمائیے منتری جی، وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ یہ ہے نیم کے پتے، کھانے میں پہلے ہی تلخ ہوں مگر سندرتا اور رگوں میں مت پوچھئے۔ اس کے کھانے سے منتری جی فقیر میں گزشتہ سات پشتوں سے پھوڑے پھنسی اچھے ہو جاتے اور آنے والی چودہ پشتوں کو خارش تک نہیں ہوتی۔ اور یہ رہے آم کے پتے، آم کے پتوں میں بلا کی غذائیت بھر دی ہے مالک نے، ٹھیک اتنی ہی جتنی آموں میں۔ پھر خواہ مخواہ آم کوئی کیوں کھائے آم کے آم گٹھلیوں کے دام کی مثل ڈھوئے پھرے! اور منتری جی یہ رہے امرود کے پتے، دانتوں کے لئے اکسیر! اور یہ ہیں مولی کے پتے حضور کیا کہنے ہیں اس کے، سارے پتوں کے بعد آدھ پاؤ مولی کے پتے کھا لیجئے اور منوں پتے ہضم۔"

"اے لڑکی!" وزیر خوراک صاحب چیخے "تو میرا مذاق اڑاتی ہو؟"

"جی نہیں سرکار"۔ روشنی نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "کس کی شامت آئی ہے جو شریمان کا مذاق اڑائے۔ کھائیے نا حضور۔ اب ہم لوگ تو سرکار بس پتے ہی کھاتے ہیں، ایک طرف سے پتے کھاتے جاتے ہیں دوسری طرف درخت لگاتے پھرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم گھوڑے، بکری اور خرگوش کی بولیاں بھی سیکھتے جا رہے ہیں —— سناؤں سرکار —— میں میں ...."

"اے لڑکی!" وزیر خوراک صاحب کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے

"جی سرکار" روشنی نے پھر ہاتھ جوڑے: "ہم لوگ سرکار کا احسان کبھی بھول سکتے کہ سرکار نے ہم لوگوں کو پتے کھانا سکھلایا۔ آپ بھی شوق فرمائیے نا سرکار حضور یہ املی کے پتے تو کھا لیجئے رام کسم، پرانی سے پرانی پیچش اگر ٹھیک نہ ہو جائے سرکار تو جو سزا چور کی سو میری۔ اور میں نے سنا ہے سرکار کہ سارے منتری لوگ پیچش کے شکار رہتے ہیں۔"

"خاموش!" وزیر خوراک صاحب زور سے چیخے اور یک لخت کمرے سے باہر نکل گئے، اور سیدھے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئے اور سکار بھاگ گئی۔

پتہ نہیں اس دن کے بعد پھر وزیر خوراک صاحب نے اپنی تقریروں میں لوگوں کو درختوں اور پودوں کے پتے کھانے کی ترغیب دی یا نہیں؟ لیکن روشنی کی شرارتیں ایک غیر متعین مدت کے لئے ضرور ختم ہو گئیں کیوں کہ دوسرے ہی دن اسے ایک نئے قانون پبلک سیفٹی ریزرو ایکٹ کے ماتحت گرفتار کر کے ایک نامعلوم مدت کے لئے قید کر دیا گیا۔

رُباعیات

نغمات کے پردوں کی لو میں اکسا دے
اشعار میں صد شعلۂ گل بھڑکا دے
اے جانِ چمن ترے تصدق، میرے
افکار کی رگ رگ میں لہو دوڑا دے

دنیا پہ ترسمگی کی یہ چھاؤں گھنی
میخانۂ شب میں نوش و پیمانہ زنی
چھلکی چھلکی صبوحی موجِ نسیم
فطرت کی وہ پچھلی رات اعضاء شکنی

(فراق گورکھپوری)

پنڈت دلستہ پرشاد فدا

لِدر کی ندی اور شاعر

ہمارے محترم دوست جناب فدا آن گرمیوں میں پہلگام تشریف لے گئے تھے صحت افزا مقام کشمیر میں لدر نامی ندی کی وادی میں واقع ہے
اس ندی سے فدا صاحب کی جو بات چیت ہوئی اسے نظم کر کے انہوں نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ناظرین اسکے مطالعہ سے استفادہ کریں۔ ایڈیٹر

کنارے پر لدر کے بیٹھ کر اک دن کہا میں نے ۔ نہایت دلنشیں ہیں اے ندی جولانیاں تیری

پگھل آیا ترا کس بستہ دل کس کی محبت سے ۔ تجھے لے جارہی ہیں اب کہاں بے تابیاں تیری

سوالوں پر مرے سورج کی کرنیں مسکرا اٹھیں ۔ تبسّم اس ندی سے بھی لگا اٹھکیلیاں کرنے

سرودِ مستقل سے ہر صدائیں برملا اٹھیں ۔ لگا وہ محرمِ نادیدہ بن کر دم مرا بھرنے

کہا اس نے فدا انداز پر تیرے فدا ہوں میں ۔ کہ پہلی مرتبہ تو نے مرے دل کو ٹٹولا ہے

ہزاروں قافلے ہر سال اس وادی میں آتے ہیں ۔ کسی نے آج تک میرے لئے یوں لب نہ کھولا ہے

سُن اپنے دل کا تجھکو راز سربستہ سناتی ہوں ۔ برابر بہہ رہی ہوں ابتدائے آفرینش سے

پہاڑی گیت بھی بہتے ہوئے میں گائے جاتی ہوں ۔ یہ دستور العمل مخفی نہیں اربابِ دانش سے

سمندر کی کبھی گہرائیوں میں میرا مسکن تھا ۔ ہیں صبر و شکر سے مانوس تھی ان بستیوں ہی سے

مقدر نے کیا اتنا ہی میرا مرتبہ اونچا ۔ پہاڑوں پر مجھے تختِ سلیماں میں بٹھا لائے

لگن مجھکو ہے لیکن دھرتیاں سیراب کرنیکی
مجھے اس سربلندی سے ہی عجز و انکسار اچھا!

نشیبوں کی طرف میں روپ میں اپنے اتر آئی
نہیں بیٹھا گیا مجھ سے کلیجہ کر کے پتھر کا

سکھایا ہے مجھے فطرت نے سرگرم فنا ہونا
پہاڑوں کی مجھے جھوٹی بقا ہرگز نہیں بھائی

سکھایا ہے مجھے ایثار نے آبِ بقا ہونا
اچھلتی کودتی میں اصل کی جانب چلی آئی

مجھے لے جا رہا ہے رات دن عزم جواں میرا
پہاڑی گیت بھی ایثار کے وہ گن گناتا ہے

تھا بدتر موت سے میرے لئے وہ منجمد جینا
نہیں مرتا کبھی جو دوسروں کے کام آتا ہے

مدد اس عزم میں خورشید سے مجھکو ہوئی حاصل
ارادوں کو مرے تکمیل دی اسکے تبسم نے

ہزاروں ندیوں کا راگ ہے اس عزم میں شامل
ہمیں یکجاں بنایا ہے اسی شانِ ترنم نے

میں اپنے آپ کو پیوست کرتی ہوں وتستہ[1] میں
ہوا مجھ سے ہے جو محبوب تر اپنی روانی میں

میں کھو دیتی ہوں اپنا آپ کو آبِ خجستہ میں
جواب اس کے ترنم کا نہیں جادو بیانی میں

نظر تجھ میں بھی آتی ہے جھلک مجھ کو وتستہ کی
یقیناً اس کی ہمنامی کی تو نے لاج رکھ لی ہے

جبھی تجھ کو سنائی ہے کہانی عمر رفتہ کی
سعادت حق نے تجھکو بھی فدا ہونیکی بخشی ہے

[1] دریائے جہلم کو کشمیر میں وتستہ کہتے ہیں

ل۔ احمد۔ اکبر آبادی

خونِ ناحق

"ان دنوں " امریکن طرزِ زندگی " کا ایک ایسا شہرہ ہے کہ آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ اور اس " طرز " کو دنیا میں مقبول کرانے کی قیمت اربوں ڈالروں دی جا رہی ہے ؟

میں نے امریکن اور غیر امریکن ادب میں سے " امریکن طرزِ زندگی " پر ایک مجموعہ تیار کیا ہے ، تاکہ اہلِ وطن اس زندگی کے حسن و قبح خود دیکھ سکیں۔ یہ افسانہ ایلیا اہرنبرگ ، مشہورِ عام روسی ادیب و نقاد کے نئے ناول " نویں موج " سے مرتب کیا ہے۔ یہ ناول اپنی جگہ ایک وسیع بساط نقوش ہے جس میں ایک حبشی کا کردار بھی بیان ہوا ہے۔ میں نے اس کردار کے متعلق جو واقعات بیان ہوئے ہیں ، ان کو ایک مختصر افسانے کی صورت دے دی ہے ۔"

ل احمد

(۱)

ایک صبح کو میسی سی پی اسٹیٹ (جنوبی امریکہ) کے اخباروں میں موٹی سرخیوں سے یہ خبر چھپی کہ ایک حبشی نے مسز میری یتویل پر حملہ کیا۔ خبر میں اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا کہ " اس نوعیت کے حملے کرنا ویسے تو رنگ دار قوموں کا خاصہ ہے ، لیکن اس خونی حبشی کا مقصد سیاسی بھی تھا۔" پھر اس پہلو کو نمایاں کیا گیا کہ " اس ذلیل کلوٹے نے اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے لئے ہمارے محترم سینیٹ ممبر مسٹر تو ( ) کو چھانٹا ، جو دکھنی امریکہ میں جیفرسن کی روایات زندہ کئے ہوئے ہیں۔ مسز یتویل سینیٹر تو کی صاحب زادی ہیں ۔"

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خبر کا سیاسی پہلو اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ " میجر اسمیڈل کی باخبری اور بردباری کی بدولت یہ کالا خونی موقعہ واردات پر گرفتار ہو سکا ۔"

میری یتویل اپنے باپ کی تنہا اولاد تھی۔ سینیٹر تو ضدی مزاج اور اس اعتبار سے بیٹی باپ پر پڑی تھی ، وہ جذباتی عورت تھی ، اس لئے ہر نئی بات اس کو بآسانی متاثر کر دیتی تھی ، کوئی نیا ڈرامہ ، نیا فلم ، نئی کتاب ، یا نئی تحریک میری پر جادو کر دینے کے لئے کافی تھی۔ میری پیدا ہوئی تو ماں زیادہ دن نہ جی سکی۔ اور اس لئے اس کی دیکھ ریکھ باپ نے کی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ میری کو اگر واقعی کسی سے محبت تھی تو اپنے باپ سے تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ وہ باپ سے حجت و بحث کبھی نہ کرتی تھی۔ باپ کی کوئی بات اسے ناپسند بھی ہوتی تو نظر انداز کر دیتی تھی۔ دوسروں کے ساتھ میری کا برتاؤ بالکل اس کے الٹ ہوتا تھا۔ چنانچہ اپنی نسوانی فروگزاشتوں کے سوا ، میری باپ سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی۔

سینیٹر تو ایک بہت بڑی کاشت (PLANTATION) کا مالک تھا۔ جہاں سینکڑوں حبشی مزدور کام کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ کثیر دولت جمع کر چکا تھا ، اس لئے بیٹی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا

اس نے بیٹی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجا، جہاں وہ گیارہ سال رہی۔ یورپ کے اس طویل قیام میں میری امریکن معاشرت کی بہت خصوصیات کو بھول گئی۔ لیکن یورپین کلچر کی نفاست اور خوش ذوقی حاصل نہ کر سکی۔ تعلیم نے اس کے اندر ادراک کی صلاحیت پیدا نہیں کی۔ اس لئے وہ ایک سادہ لوح جذباتی عورت بن کر رہ گئی، جو باتیں اس کے آس پاس ہر وقت ہوا کرتی تھیں، جیسے رقص و سرور، تھیٹر و سینما، دعوتیں اور پارٹیاں، انھیں باتوں کو سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ عوامی اور رائج خیالات اور رائیں جوں کی توں اپنا لی تھیں۔ فکر و خیال کے تخالف و تضاد کو وہ اگر جانتی تھی، تو بس اس طرح جیسے اس دوربین سے کھیلتے ہیں۔ جس کے اندر رنگ برنگے کانچ کے کرچے بھرے ہوتے ہیں۔ اور اس کو گھمانے سے رنگوں کا نیرنگی نظر آتی ہے۔ الحاصل، یورپ نے میری کو امریکہ کے خلاف تو کر دیا مگر اپنا کوئی نصب العین نہیں سکھا سکا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ پیرس سے سوئٹزرلینڈ چلی گئی، اور وہاں ایک اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے قیام میں اس کی ملاقات ایک نوجوان فرانسیسی شاعر سے ہو گئی جو جرمنوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی پیرس ہی میں رہا۔ مگر بعد میں کسی سبب سے اسے فرانس چھوڑنا پڑ گیا۔ میری نے اس کو ایک جینیس شاعر باور کر لیا۔ اور اس سے بے تحاشا محبت کرنے لگی۔ وہ اس کو بیش قیمت تحفے دے کر خوش ہوتی تھی، کہ باپ کی دولت ایک جینیس شاعر کو بے مثال تخلیقی کارناموں کا اہل بنا رہی ہے!

اس شاعر کا نام نیویل تھا، اور اس نے اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق میری کو کسی بات کا علم نہیں ہونے دیا۔ بجز اس کے کہ وہ جرمن غاصبوں سے نباہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میری کی سادہ لوحی نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور مزید حالات جاننے کی جستجو بھی نہیں کی۔ اور پھر ان کی شادی ہو گئی۔

سنیٹر تو فرانس والوں کے متعلق اچھی رائے تو نہ رکھتا تھا، مگر اس کی ایک اسکیم تھی جس کے لئے اس کو ایک قابل اعتماد فرانسیسی کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ اس لئے جب میری نے باپ کو لکھا تو نیویل کو دامادی میں لینے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اور رضامندی دے دی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد یہ میاں بیوی امریکہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، کہ میری کی نظر ایک پرانے فرانسیسی اخبار پر پڑ گئی۔ اور اس میں اس نے ایک مضمون پڑھا۔ جو نیویل سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں لکھا تھا کہ "نیویل جرمن غاصبوں سے تعاون کیا۔ ان کا رفیق بن گیا اور جرمن پولیس کے محکمے سے تنخواہ پانے لگا۔ اور اس تنخواہ کو حلال کرنے میں اس نے بہت سے وطن پرستوں کا مخبری کر کے انہیں پھانسی پر لٹکوا دیا۔"

جرمن قوم کے متعلق اس وقت میری کے جذبات وہی تھے جو جنگ کے زمانے میں عام طور سے اس وقت رائج تھے۔ اس لئے اس مضمون کو پڑھ کر میری کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر خود کچھ کہنے کے بدلے اس نے وہ اخبار ہی شوہر کے سامنے رکھ دیا۔

"سراسر جھوٹ! گندہ سیاست!! کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے کون نہیں جانتا!" اخبار پڑھ کر نیویل نے کہا تھا۔

میری کی سادہ لوحی نے مان تو لیا کہ ایسا ہی ہوگا، لیکن اس کے آبگینۂ دل میں بال ضرور پڑ گیا۔ یہ خیال محض کہ وہ بہت سے محبان وطن کے قتل کا موجب بنا، میری کے لئے نہایت پر اذیت خیال تھا

(۲)

امریکہ پہنچے تو میری سائے کی طرح شوہر کے ساتھ لگی رہی، گویا وطن میں اس کا کوئی دوست اور رفیق تھا ہی نہیں۔ اور یہ غلط بھی نہ تھا، کیونکہ بچپن میں ہی یورپ بھیجدی گئی تھی۔ اسے واقعی وطن میں اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن زیادہ مدت اس طرح نہیں گذری تھی۔ کہ نیویل گھر سے غائب ہو جانے اور حیلے بہانے تراشنے لگا۔ میری کے اندر رشک و رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے، اور وہ شوہر سے بہت برہم رہنے لگی۔ اس کی بے وفائی کا احساس کر کے اکثر رو دیا کرتی تھی۔

اپنے طرزِ عمل کے جواز میں ینوئیں اس سے کہتا کہ وہ خالی شوہر نہیں۔ شاعر بھی ہے، اور اسے شعری الہام کی ضرورت ہے، جس کے بغیر وہ کوئی تخلیقی صناعت وجود میں نہیں لا سکتا! یہ حیلہ چند روز تک تو کارگر ثابت ہوا۔ لیکن بالآخر اس کا اعتبار اٹھ گیا۔

امریکہ پہونچے ہوئے ان کو تیسرا سال تھا۔ کہ ایک دن اس وجہ سے ان میں تکرار ہو پڑی، اور میری نے انتہائی غم اور غصے کی حالت میں اس سے کہہ ہی دیا۔

"آج مجھے کامل یقین ہے، کہ اس اخبار نے جو کچھ لکھا تھا
حرف بحرف صحیح تھا! تم اونچے خیالات بگھار تو سکتے ہو لیکن
شرافت چھو نہیں گئی ہے۔"

میری کے غیظ و غضب نے اس کو طلاق لے لینے کی سجھائی۔ لیکن امریکن سماج میں اس سے زیادہ بری بات کوئی ہے نہیں۔ باپ کی آزردگی ہوگی، یہ میری کو منظور نہ تھا! شوہر کے انتخاب میں باپ کی رائے کو جب دخل نہ تھا، تو وہ اس کا خمیازہ کیوں اٹھائے؟ چنانچہ میری جیسے کو تیسا جواب دینے پر تل گئی۔

ایک مرتبہ پیرس میں اس کی ملاقات ایک امریکن نقاش سے ہوئی تھی۔ اس وقت اسے وہ نقاش یاد آیا۔ میری سیدھی اس صناع کے نگارخانے جا پہنچی۔ اور وہ اس کے اس طرح آ جانے پر متحیر بھی بہت ہوا۔"

اس صناع نے میری کو اپنے بنائے ہوئے نقوش دکھائے اور اس کی "تحسین ناشناس" کو بھی برداشت کیا۔ پھر شراب کے دَور چلے اور چلتے رہے۔ باتوں کا میگزین ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس صناع نے دیکھا کہ وہ تو جانے کا نام نہیں لیتی ہے تو خود ہی دھیان دلانے کی بدتمیزی کا مرتکب ہوا۔

"معاف کیجئے۔ مگر وقت زیادہ ہو گیا ہے، گھر آپ کا انتظار ہوتا ہوگا؟"

یہ سن کر میری نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کپڑے اتارنا شروع کر دیئے۔ اور پھر صبح ہوتے گھر گئی۔

میری کی طبع و مزاج کے لئے یہ جاننا دشوار تھا۔ کہ کسی بات یا کام کرنے میں مبالغہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آغاز کے بعد میری کی زندگی وہ ہو گئی، جسے انگریزی میں FAST کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسی زندگی گذارنے میں اس کو محسوس ہوا کہ امریکہ میں کھل کھیلنے کے موقعے مشکل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ باپ کی عزت و آبرو کا خیال دامن پکڑنے لگتا ہے۔ مےخواری بھی اس کے جذبۂ انتقام کا علاج ثابت نہ ہوئی۔ وہ سخت علیل ہو گئی۔ بیماری کی زمانے میں شوہر اس کے پاس رہا۔ اس وقت وہ شہر جیکسن میں تھی، جہاں اس کے باپ کی کاشت کا علاقہ تھا۔ بیماری کا ڈیڑھ برس بہت کٹھن گذرا۔ تندرست ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ ینوئیں کو کسی ضرورت سے پیرس بھیج رہا ہے۔ اور شوہر کے ساتھ وہ بھی جائے گی۔ پیرس وہ مقام ہے، جہاں کے ذرا بگے کارے نیا شد پرعمل ہوتا ہے۔ سب خوش و خرم رہنا چاہتے ہیں، اس لئے دوسروں کو بھی خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خبر سے میری خوش تھی۔ جیکسن آخر ایک چھوٹا شہر تھا اور باپ کی آبرو کا خیال اسے ینوئیں کو قرار واقعی سزا دے کر انتقام کی آگ بجھانے میں حائل رہا۔

(۳)

نکمے بیٹھے رہنے سے گھبرا کر میری رفاہی اور خیراتی کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ پلانٹیشن کے مزدوروں کی بستی میں جاتی اور بچوں کو مٹھائی اور وٹامن کی دوائی تقسیم کرتی، یا اسکول کا معائنہ کرتی، تو کتابیں اور پنسلیں بانٹتی۔ ایک دن وہ حبشی سے پلاور کے گھر گئی، تو وہاں ایک نوجوان حبشی کو دیکھا کہ بیٹھا نقش بنا رہا ہے، میری نے اسے تصویر بناتے دیکھا۔ تو یقین کر لیا کہ وہ ایک اعلیٰ صناع بن سکتا ہے اس خیال نے میری کو اس حبشی پر مہربان کر دیا، جس کا نام ڈیوڈ ہیرسن تھا۔ دوسرے اتوار کو وہ ہیرسن کے لئے نقاشی کے رنگ، برش و بساط وغیرہ تحفۃً لے گئی۔ اور پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔ ابھی وہ وہاں گیا

اس کا شوہر جیکسن آیا۔ اور میری کا نیا مشغلہ اسے معلوم ہوا تو اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

میری، غرض اس حبشی نقاش سے ملتی رہی۔ مشہور نقاشوں کے البم اور تصانیف وغیرہ منگا منگا کر دیتی رہی۔ حبشی ہیرسن پلانٹیشن کا جرشی تھا۔ اور نقاشی کی مشق کے لئے اسے صرف اتوار کا دن ملتا تھا لیکن میری کی نظر میں اس کا فن ترقی کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اور اسے خیال سے کہ اس نے ایک جینیس ڈھونڈھ نکالا ہے، وہ بے حد خوش تھی ایک ملاقات میں میری نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نیویارک جا کر تحصیل فن کرے۔

"وہاں تم کو مددگار مل جائیں گے، اور قدر دان بھی، میں خود جا کر تمہارے نقوش کی نمائش کا انتظام کراؤنگی۔"

"بہت بہت شکریہ، میڈم، پر میں کہیں جانا نہیں چاہتا۔" اس نے جواب میں کہا۔ اور جب کبھی میری نے اپنا مشورہ دوہرایا اس نے یہی جواب دیا۔

ایک دن میری اس کے پاس سے پلٹ رہی تھی، کہ کچھ سوچ کر خود ہی ہنس پڑی۔

"اس کلوٹے سے تو سچ مچ مجھے محبت ہو گئی ہے!"

جب اس نے اپنے آپ سے یہ اعتراف کر لیا تو قدرتی طور پر اس کا ذہن اس طرف جاتا تھا کہ تخلیے کی ملاقات کی صورت نکلے۔ ابھی تک اس سے حبشی پلاور کے گھر میں ملی تھی۔ اور وہ پلاور ہی کے ساتھ رہتا بھی تھا کبھی میری کو بڑی سڑک تک پہونچانے چلا جاتا تھا۔

میری جب کسی بات کا خیال کر لیتی، تو پھر اس میں منزل کوئی نہ ہوتی تھی۔ ڈیوڈ کی محبت اس تیزی سے عروج کو پہونچ گئی، کہ میری کی نیندیں اڑ گئیں۔ خواب آور دواؤں کا اثر زائل ہو گیا۔ ہر وقت اسی کا تصور رہتا تھا۔ ڈیوڈ کی خوابناک آنکھوں کے اندر اداس نگاہیں میری کی ہستی پر چھا گئی تھیں۔ اور اب وہ اس مقام پر جا پہونچی تھی کہ جس دن ڈیوڈ نے چپکا کر اس کا پیار لے لیا۔ اسی دن ساری احتیاطوں اور باپ کی عزت کے خیال کو طاق میں رکھ دے گی!

ایک دن رخصت ہوتے ہاتھ ملایا تو اس نے ڈیوڈ کے ہاتھ کو زیادہ دبا کر چپکے سے کہا۔

"میں شاید پاگل ہوتی جا رہی ہوں!" مگر یہ سن کر بھی ڈیوڈ حسب معمول خوش اور مؤدب بنا رہا، لیکن میری نے ایک ٹھنڈی سانس سن لی، یا اور محسوس کیا کہ وہ اپنے ضبط کے بوجھ سے پسا جا رہا ہے

"آج شام کو میرے گھر آ جانا!" میری نے اس سے کہا۔

"آپ کے مکان پر؟ یہ کیسے ممکن ہے، میڈم؟" ڈیوڈ نے کمال حیران ہو کر کہا۔

"کیوں نہیں؟ پھاٹک پر میں خود مل جاؤں گی، خادمہ کو چھٹی دے دوں گی۔ ماں کا سامنا ہو گا نہیں، اور ہوا تو کہہ دوں گی کہ تم میری میز کی مرمت کرنے آئے ہو!"

"نہیں میڈم، میں معذور ہوں!"

میری کو طیش آ گیا اور کہنے لگی۔

"میری بات نہ مانو گے تو میں بہت خطرناک بھی ہو سکتی ہوں!"

ڈیوڈ خوفزدہ ہو گیا۔ اور مجبور ہو کر وعدہ کر لیا۔ شام کے وقت وہاں پہونچا تو میری نے اسے اپنا البم ذخیرہ نقوش دکھایا اس میں بعض کلاسکی تصویریں بھی تھیں۔ ڈیوڈ بڑے انہماک سے ان تصویروں کا مطالعہ کرنے لگا۔ اب اس کا ڈر ہوا ہو گیا تھا، وہ بے تکلفی سے صناعت کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا۔

اس وقت اچانک میری پر یہ راز کھلا کہ وہ جس چیز سے محبت کر رہی ہے، وہ ڈیوڈ کی برنائی نہیں، بلکہ اس کا شوق صناعت ہے اس خیال نے میری کے خیالات کو بالکل بدل دیا۔ "تسکین جذبات کے لئے پیرس میں بے شمار موقعے ملیں گے!" اس کی صناعت کو میری سرپرستی کی ضرورت ہے۔ پوچھنے لگی۔

"کیا عمر ہے، تمہاری؟"

"پچیس سال، میڈم!"

ویسے تو میری نے اپنی عمر ہمیشہ گھٹا کر بتائی۔ مگر اس موقع پر بڑھا کر بتانا پڑی۔

"میری عمر چالیس سال کی ہے، اور تمہاری ماں کی جگہ لے سکتی ہوں تم نیویارک جانے پر راضی کیوں نہیں ہو؟ روپئے پیسے کا خیال ہے تو تم اس کی فکر نہ کرو۔ جیکسن میں رہو گے تو تمہارا فن ٹھٹھر کے رہ جائیگا"

موٹر کا ہارن بجا۔ میری نے کھڑکی میں سے نظر ڈالی اور "اسمڈل" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

ڈیوڈ نے اسمڈل کا نام سنا تو بدحواس ہو گیا، کھڑکی میں سے کود کر پائپ کے سہارے اترنے لگا۔ کیونکہ یہ دونوں اوپر کی منزل میں تھے۔

(۴)

میجر اسمڈل درمیانی عمر کا آدمی اور سنیٹر تو کا معتمد و مددگار تھا۔ تو کو سینیٹ کا ممبر چنوا دینے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ الیکشن میں کھڑے ہونے کی تجویز پہلے اسی کے دماغ میں آئی تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ تو نے اپنے سارے معاملات اسمڈل کو سونپ دیئے۔ اسمڈل جب لڑائی پر سے پلٹا تھا تو سینے پر دو تمغے لٹکائے پلٹا تھا۔ اور اوپر سے سنیٹر تو کا معتمد بن جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اسمڈل شہر جیکسن میں چوٹی کا آدمی شمار ہوتا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد امریکہ میں لال رنگ سے ڈرنا سچا امریکن اور شریف آدمی بننے کے لئے لازمی ہو گیا تھا، اور اسمڈل اس معاملے میں سب سے آگے تھا۔

مسٹر کلارگ شہر جیکسن میں ایک نامی بیرسٹر تھا۔ اور اپنی آزاد خیالی و انصاف پرستی کی وجہ سے بدنام بھی۔ حبشی ملزموں کی طرف سے قانونی پیروی کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔ اور اس بنا پر اسمڈل نے اس کا نام لال ڈیل رکھ چھوڑا تھا۔ کسی گفتگو میں کلارگ نے کہا تھا کہ اسمڈل کو کلکس کلین[1] (KU-KLUX-KLAN) کا ممبر ہے، تو اس کے جواب میں اسمڈل نے کہا تھا کہ:-

"میں ایک سچا امریکن ہوں، اس لئے قانون کا احترام کرتا ہوں اور اس لئے کلان کا ممبر تو نہیں بن سکتا، مگر اس کے اکثر ممبروں سے میری گہری دوستی ہے، اور میں کلان کے مقصد کو درست مانتا ہوں!"

اسمڈل کے اور بھی اوصاف بہت سے تھے، لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی اسٹیٹ میں شراب بندی کی حمایت اس لئے کرتا ہے کہ سرحد پر ملحقہ ریاست کے اندر جہاں شراب بندی نہیں ہے، وہاں جو شراب خانہ ہے وہ اس میں حصہ دار ہے، یہاں شراب بندی ہو جائے تو پہلے کی طرح اس کی آمدنی بہت بڑھ جائے گی، ایک اشتہاری ملزم گرفتار ہوا تو اسمڈل نے اس کو چھڑانے کی کوشش کی تھی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بدمعاش اسمڈل کے شراب خانے کو ناجائز کشید کی ہوئی شراب سپلائی کرتا ہے۔ ایک حبشن لڑکی کالج کی چھٹیوں میں جیکسن آئی تھی۔ اس نے اسمڈل پر عصمت دری کا الزام لگایا تھا۔ لوگوں کے خیال میں وہ الزام غلط نہ تھا جیکسن کے باشندوں میں یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی۔ کہ اسمڈل نے ایک دولت مند بیوہ سے شادی ٹھہرائی، مگر شادی سے پہلے اس عورت نے اپنی جائداد اپنے بھائی کے نام کر دی تو اسمڈل عین شادی کے دن روپوش ہو گیا' اور اس سے شادی نہیں کی۔ اسمڈل کے پاس ایک جڑاؤ مالا تھی جسے وہ اپنے ملنے والوں کو دکھایا کرتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مالا اس جرمن عورت کی چرالایا ہے جس کو دھوکہ دے کر اسمڈل نے اپنے دوران قیام میں داشتہ بنا کر رکھا تھا۔

اسمڈل کے متعلق لوگوں کے خیال جب ایسے ہوں تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس کی جتنی عزت و آبرو تھی وہ سنیٹر تو کی دوستی کی وجہ سے تھی۔ اور سنیٹر تو چونکہ اپنا بیٹی سے بہت مانوس تھا اس لئے میری بنویں کی خاطر خوشامد کرنا اسمڈل کی تجارتی ضرورت

[1] یہ ایک خفیہ سوسائٹی ہے۔ اور جنوبی امریکہ میں حبشیوں کو برابری سے محروم کرنا اس کا مقصد ہے۔ لیکن عملاً ان پر جبر و تشدد کرتی رہتی ہے۔ اور امریکن قانون اس کے سامنے مغلوب ہے۔

تھی، اور یہی وجہ تھی کہ وہ میری کی صاف گوئی اور تلون کو برداشت کر لیتا تھا اور یہی مصلحت ینویل بنائے رکھنے میں بھی تھی، ورنہ دوسرے امریکیوں کی طرح وہ بھی فرانس والوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا اور مقابلتہً جرمن قوم کو بہتر سمجھتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ ..... " وہ دشمن ان دوستوں کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہیں " جرمن قوم کی صفائی ستھرائی کا تقابل فرانس والوں کی گندگی سے کرتا تھا۔

ینویل کمیونسٹ دشمنی میں کسی امریکن سے کم نہیں تھا اور فرانس پر جرمن قبضے کے زمانے میں جرمنوں سے تعاون کرنے کا ذکر فخر کے ساتھ کرتا تھا، لیکن اسٹڈل نے اس کو کمیونسٹ نہیں تو ان کا ہمدرد ہمیشہ سمجھا اسٹڈل یہ البتہ طے نہیں کر سکا کہ میری کے اندر جو تغیر آیا وہ یورپ کے قیام کا نتیجہ ہے، یا ینویل کی محبت کا اثر۔

" سُرخ خطرے " کی جب بات چلتی، تو میری میجر اسٹڈل کی ہر بات کو کاٹ دیتی۔ اور اس کی کمیونسٹ دشمنی کا خوب خاکہ اڑاتی تھی' جان جان کر اس کو چڑھانا، میری کا مذاق بن گیا تھا۔

" ملک میں اگر نزاع اور بدنظمی پھیل جائے تو ایسی کیا قیامت آجائے گی ؟ اور وہائٹ ہاؤس میں چند SURREALISTS آبیٹھیں طلاق کی آزادی ہو جائے، ہر مو تعہ و محل پر خدا کا نام لینا جرم قرار دے دیا جائے، تو میں پوچھتی ہوں آخر حرج کیا ہو گا ؟ "

اسٹڈل جانتا تھا کہ یہ اس کو چڑھانے کے لئے کہا جا رہا ہے لیکن اس کو اس خیال سے صدمہ ہوتا تھا۔ کہ ایسے بڑے سنیٹر کی بیٹی اور ایسی سفید پھٹ۔ کمیونسٹوں کے متعلق تو شاید وہ اسکی باتوں کو برداشت بھی کر لیتا، مگر وہ تو کھلم کھلا حبشیوں کی طرفداری کرتی ہے، وہ امریکن سماج کے اٹل قانون کی تحقیر اور مخالفت کرنے میں اور دلیر ہوتی جا رہی ہے !"

امریکی طرز زندگی سے جتنی میری بیزار تھی، ینویل بھی کم بیزار نہ تھا لیکن مصلحت کی بنا پر کھل کے تنقید نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنی بیزاری یہ کہہ کر نکال لیتا تھا کہ ـ" امریکہ کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئی ہیں "۔ جب وہ میری کو یہ کہتے سنتا کہ " حبشی مصنفوں کی ہنرمندی مستند ماہرین فن سے خراج تحسین وصول کرتی ہے !" یا یہ کہ " حبشیوں کی جسمانی ساخت و توانائی شاندار ہوتی ہے !" تو ینویل کی ایک طرح تسکین ہو جاتی تھی۔ حبشیوں کی جسمانی ساخت کی تعریف میری کی زبان سے سن کر اسٹڈل ضبط نہ کر سکا تو کہنے لگا :-

" مسز ینویل، آپ کی بیٹی ہوتی، اور وہ کسی حبشی کو شوہر بنا لیتی تو اسے آپ پسند کرتیں ؟"

" مجھے اپنی بیٹی پر رشک ہوتا۔ حبشی یقیناً بہتر شوہر ثابت ہوتے ہیں !" میری نے ہنس کر جواب دیا۔

میجر اسٹڈل جب روسیوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا تو یہ واقعہ ضرور بیان کرتا کہ جب جرمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے، اور روسی و امریکن فوجیں ملیں، تو روسی افسر لپک کر بڑھا اور ہمارے حبشی ٹرک ڈرائیور سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا تھا ۔"

" خیال تو کیجئے، یہ روسی افسر ایک کرنیل تھا اور سینے پر دو تمغے لٹکا رہے تھے۔ وہ آپ سے' مجھ سے اس حبشی کو زیادہ معزز سمجھتا تھا۔ آپ سمجھے اس چال کو ؟ یہ روسی ان حبشیوں کو ہمارے اوپر مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ سوویٹ فوجیں جب خلیج میکسیکو میں اتریں گی تو وہ سارے عہدے اور اختیارات حبشیوں کو سپرد کر دیں گی ۔"

(۵)

جس روز جیکسن میں یہ پوری اسٹیٹ کو ہلا دینے والا واقعہ رونما ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے اسٹڈل کو سنیٹر تو کا خط ملا تھا کہ " ٹرانسوک " کے معاملات کو سر براہ کرنے میں ینویل بے حد مصروف ہے۔ اور میری جیکسن میں بیوہ کی سی زندگی گزار رہی ہے، اس لئے اسٹڈل کو اس کا بڑا خیال رکھنا چاہئے، خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی تھی " ٹرانسوک " کے کام کی تکمیل میں ابھی تین ہفتے اور لگیں گے، اس وقت میری واشنگٹن آ کر ینویل کے ہمراہ پیرس چلی جائیگی۔"

حبشی ڈیوڈ کی کہانی میں سینیٹر تو کی "ٹرانسوک" کی اسکیم کا بیان ایک جملہ معترضہ بے شک ہوگا۔ لیکن "امریکن طرزِ زندگی" کا ایک خاص پہلو بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد روسی طاقت کو دیکھ کر ایسے امریکنوں کو جو اس صدی کو امریکن صدی کہتے تھے یہ خطرہ نظر آیا کہ روس امریکہ پر حملہ کرکے امریکن طرزِ زندگی کو فنا کر دے گا۔ اور سینیٹر تو ایسے ہی امریکنوں میں سے ایک تھا، بلکہ کچھ زیادہ۔ تو کو روس کے خلاف امریکن حکومت کی پالیسی سے پورا پورا اتفاق تھا۔ مگر وہ حکومت کے انتظامات کو ناکافی سمجھ کر اپنی بہت بڑی دولت کا صحیح مصرف روس کے خلاف کارروائیوں میں خرچ کر دینا سمجھتا تھا۔ تو کے جذبۂ وطن پرستی کا تقاضا تھا، کہ اس عظیم خطرے کی موجودگی میں ہر امریکن شہری کو بجائے خود بھی ممکن تحفظ کرنا چاہئے۔ اس لئے اس نے "ٹرانسوک" کے نام سے ایک اسکیم بنائی تھی۔ جو تجارتی کمپنی کی صورت میں یورپ کے بڑے شہروں میں شاخیں قائم کرکے سوویت روس اور مشرقی یورپ کے ملکوں میں پانچواں کالم منظم کرے گی۔ تاکہ اسٹالین کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں کرائی جائیں۔ اس اسکیم کا صدر مقام پیرس کو بنایا گیا تھا۔ اور نیویل اس کا مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر ہوا تھا۔

تو کے اندازے میں روسیوں کے نزدیک فرانس اتنا شدید مخالف نہ تھا، جتنے دوسرے یورپین ملک یا امریکہ۔ اس لئے پیرس میں ہیڈ آفس اور نیویل کی ڈائرکٹری کم مشکوک چیز اور اس لئے تو کے لئے قابل قبول تھی۔ (اور یہ سازش مصنف کے خیال آرائی ہی نہ تھی ۱۹۵۳ء میں ان کے ملکوں کے اندر ایسی سازشیں پکڑی بھی گئیں)

غرض اس خط کی تعمیل میں میجر اسمڈل میری کی خیر و عافیت معلوم کرنے آیا۔ ابھی موٹر سے اتر ہی رہا تھا کہ کھڑکی میں سے ایک موٹے تازے حبشی کو کودتے دیکھا تو "کون ہے!" کی ڈانٹ بتائی۔ اس کی اس ڈانٹ سے حبشی کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ کود کر بھاگنے لگا۔ مگر کودنے میں چوٹ آ گئی تھی، اس لئے بھاگ نہ سکا اور شوفر نے دوڑ کر اس کو آ لیا۔ جس کے ہاتھ میں مالی کی قینچی پڑ گئی تھی۔ یہ قینچی سر پر پڑی تو وہ حبشی چکرا کر گر گیا۔

ہول زدہ اسمڈل مکان کے اندر پہونچا تو جاپانی کمینو میں لپٹی ہوئی میری یہ کہتی نکلی۔

"وہ چور نہیں ہے، اس نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

"اس پر غور کرنا تو جج کا کام ہے۔ مجھے تو آپ کی اور سینیٹر تو کی ملکیت کا تحفظ کرنا ہے!" حواس کچھ برجا ہونے کے بعد اسمڈل نے کہا۔ اور پھر نوکروں کو تاکید کی کہ اس حبشی کو اصطبل میں بند کرکے پولیس کے آنے کا انتظار کریں۔

(۶)

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اور چاند کا پیلا گردہ اونچا اٹھتا جا رہا تھا۔ اسمڈل کے حواس پوری طرح بجا نہیں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"میری ایک نرم دل عورت ہے، مگر بھیجے کی جگہ روئی رکھی ہے! سینیٹر تو کی بیٹی اور گندے حبشی کی طرف داری! ذلت کی حد ہے!"

وہاں سے وہ سیدھا جج گگور کے ہاں پہونچا۔ جن سے اس کی دوستی بھی تھی۔ جج نے وہسکی سوڈا پیش کیا۔ مگر اسمڈل نے انکار کرکے حبشی کا سارا واقعہ سنایا۔ گگور نے اعتراف کیا۔

"ہولناک واقعہ! نہایت ہولناک!! مسز نیویل پر ناروا حملے کے علاوہ اس کی نیت کیا ہو سکتی ہے؟"

اسمڈل خاموش رہا۔ اور اس کی نظر میں میری کے کمینو پر زرد دھبے چکر کھانے لگے۔ جج کہتا رہا۔

"میری کی باورچن ہے تو کالی لڑکی۔ لیکن عاجزی کی پتلی ہے اور کھانا پکانے میں تو لاثانی ہے۔"

اخبار کے ضمیمے میں یہ خبر چھپی، کہ اس حبشی کا نام ڈیوڈ بیرسن ہے اور اس کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا۔

ڈیوڈ بیرسن جنگ کے خاتمے پر جب فوج سے بری ہوا تو اس نے سینیٹر تو کے پلانٹیشن پر بڑھئی کی نوکری کر لی تھی، وہ بیچارہ دُنیا سے اکیلا تھا۔ اس لئے حبشی بٹلر کے مکان میں ہی رہتا تھا

پولیس کی تفتیش میں ڈیوڈ نے بتایا، کہ وہ وہاں بلایا ہوا گیا تھا جب پوچھا گیا، کہ پھر کھڑکی سے کود کر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اس نے کہا کہ باہر کی آواز سُن کر وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

صبح کو جج گھور بھی میری کی مزاج پرسی کے لئے گیا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد تو میری کمرے سے نکلی۔ اور ملی تو برس پڑی۔

"اب آپ اور کیا پوچھنے آئے ہیں؟ میں نے کہہ تو دیا کہ وہ چور نہیں ہے ...... کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے!" میں پاپا سے شکایت کروں گی کہ میرا ناک میں دم کر رکھا ہے!"

گھور میری کی اس بے وجہ خفگی سے سراسیمہ ہو گیا اور کہنے لگا۔

"میں معافی چاہتا ہوں مس بیوی، مگر میں سوالات کرنے نہیں آپ کی مزاج پرسی کو آیا ہوں!" آپ کے والد کے دوست کی حیثیت سے اظہار ہمدردی کرنے آیا ہوں۔ وہ پاجی حبشی قبولتا نہیں ہے کہ آپ کے کمرے میں کس نیت سے آیا تھا۔ اس کا مقصد چوری تھا، یا قتل؟ اس وقت رائے قائم کرنا مشکل ہو رہا ہے!"

"آپ کو کیا خبر وہ مجھ سے محبت ہی کرتا ہو!" میری نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "یا آپ کے خیال میں میں اس عمر سے گذر چکی ہوں۔؟"

جج گھور چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔ اور دروازہ بند کرتے ہوئے اسٹڈل سے کہنے لگا۔ جو باہر اس کا منتظر تھا۔

"مجھے تو اندیشہ ہے کہ مس بیوی کے دماغ پر اثر پڑا ہے چیختی ہے۔ ٹھٹھے مارتی ہے، یقیناً اعصاب متاثر کرنے والا واقعہ تھا بھی! شک تو اس میں پہلے ہی سے تھی۔ حیرت اس پر ہے کہ اس کے سامنے سے میں صحیح سلامت آسکا۔"

"آپ آخر کس نتیجہ پر پہونچے؟" وہ قتل کی نیت سے آیا تھا یا کسی اور ارادے سے؟" اسٹڈل نے سوال کیا۔

"نہیں! میرا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ وہ پاجی مس بیوی کی عصمت دری کرنا چاہتا تھا! مس بیوی کا ایک فقرہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ مجھے تو اس خیال سے حیرانی ہے کہ نیگرو کوشش کر کیا کہیں گے!

میں سمجھتا ہوں اخبار نویسوں کو یہی بتانا قرین مصلحت ہے کہ وہ قتل کی نیت سے آیا تھا۔ نہایت ہولناک واقعہ ...... مگر گورنر سے بھی مشورہ کر لینا ضروری ہے۔"

گھور کی رائے سُن کر اسٹڈل افسردہ سا ہو گیا۔ اس کی نظر خیال ایک چوڑے چکلے حبشی کو میری سے چمٹا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ڈیوڈ کا یہ کہنا کہ وہ بلایا ہوا گیا تھا۔ اسٹڈل کے دماغ میں چکر کاٹ رہا تھا، میری سے کچھ بعید نہیں ...... وہ ہر بات کی اہل ہے! لیکن اہم بات یہ ہے کہ میری کا منہ بند کیا جا سکے۔ گھور سے کہنے لگا۔

"یہی خیال میرا بھی ہے، باقی تو سب تفصیلات ہیں، لیکن معاملہ کسی خادمہ یا ایکٹریس کا نہیں، ایک سینیٹر کی بیٹی کا ہے! صحیح یا غلط!"

"صحیح یا غلط، اس کو بجلی کی کرسی پر بیٹھنا ہے!" جج گھور نے اسٹڈل کا فقرہ پورا کر دیا۔

(۷)

حبشی ڈیوڈ جیل کی ایک کوٹھری میں زمین پر پڑا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ اور ہونٹھ پھٹ گیا تھا۔ باہر وارڈر پہرہ دے رہے تھے۔ اس وقت اس کا دماغ ایک سادہ صفحہ تھا۔ اس کو نہ کوئی تکلیف محسوس ہو رہی تھی نہ خوف! اچانک اسے دھیان آیا کہ اس کی پیاری اجینی، قرار داد کے مطابق، ریل کے پل تلے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی جس سے جیل کے در و دیوار گونج گئے۔

لیکن اجینی ریل کے پل تلے اس کا انتظار نہیں کر رہی تھی، ڈیوڈ کی خبر آناً فاناً حبشی بستی اور سارے شہر میں پہنچ گئی تھی۔ ایک بوڑھے حبشی نے سنتے ہی کہہ دیا تھا کہ "اسٹڈل کے کرتوت ہیں!"

حبشی عورتیں دہشت سے رونے لگی تھیں۔ اور بچوں کو باہر سے بلا بلا کر گھروں کے اندر چھپا رہی تھیں۔ ان حبشیوں کو یقین تھا کہ حبشی بستی پر حملہ ہوا ہی چاہتا ہے! ساری بستی کی بتیاں گل کر دی گئی تھیں۔

جس وقت اس کا بھائی ہانپتا کانپتا آیا اور اس کے منہ سے ڈیوڈ

کا نام نکلا۔ جینی نے سب کچھ سمجھ لیا تھا، جو اس وقت بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔

اس دن سے ٹھیک ایک سال پہلے جینی اور ڈیوڈ قریب کے جنگل میں ملے تھے۔ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتا تھا۔ مگر اجنبیوں کی طرح۔ مگر اس روز وہ ایک دوسرے کو جاننے کی طرح جان گئے۔ دشت زار میں کاہی سڑنے کی بو پچھلی بہار کی یاد دلا رہی تھی۔ ایک درخت سے چپٹی ہوئی بیل، محبت کرنے والوں کی جذبہ ناک ہم آغوشی سے کنایہ تھی، بات پہلے ڈیوڈ نے چھیڑی۔ لیکن بعد کے دنوں میں جینی کو کوشش کے باوجود یاد نہ آیا کہ ڈیوڈ کے وہ پہلے الفاظ کیا تھے؟ البتہ اسے اس وقت کا اپنا احساس یاد تھا کہ وہ اقرار محبت کر رہا ہے! پہلے شاید اس نے جینی کا نام لیا ہوگا۔ پھولوں، چڑیوں اور درختوں کی بات کی ہوگی' اور اس کے علاوہ تو ہاتھوں اور ہونٹوں کی زبان میں کہا گیا تھا!

یہ دونوں جب جنگل سے بستی کو پلٹ رہے تھے۔ تو جینی کی نظر ایک ستارے پر پڑی، اور وہ کانپ گئی تھی۔ جینا دوبھر ہو گیا تھا، ڈیوڈ نے سبب پوچھا تھا تو وہ خاموش سا رہی تھی۔ ایک منٹ پھر چلتے رہنے کے بعد اس نے کہا تھا ——— " مجھے ڈر لگتا ہے، ڈیوڈ!" ڈیوڈ کے تسلی دینے پر جینی نے گردن کے اشارے سے بتایا تھا کہ وہ سمجھتی ہے مگر جینی نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے جرمن قزیتوں کا ڈر نہیں بلکہ اس بڑے ستارے سے ڈر لگ رہا ہے جو سامنے چمک رہا تھا اس رنگ کا ستارہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ———. اتنے بڑے آسمان میں کانپتا ہوا اکیلا ستارہ! ان دونوں کی محبت کی طرح اکیلا!

ڈیوڈ نے جینی کی تسلی کے خیال سے کہا تھا:۔

"جینی! یہ ہماری خوش نصیبی کا ستارہ ہے! اسی ستارے کے گیت تو ہم گرجوں میں گاتے ہیں، یہی تو وہ ستارہ ہے، جو بھٹکے ماندے چرواہوں کی مدد کرتا ہے، انہیں راستہ بتاتا ہے۔"

جرمن محاذ پر جب روسی فوجیوں سے ملاقات ہوئی تھی، تو انہوں نے ڈیوڈ کو ایک سرخ ستارہ بطور یادگار دیا تھا جس کو ڈیوڈ ہمیشہ "مبارک ستارہ" کہا کرتا تھا۔ لیکن جو ستارہ جینی نے دکھایا تھا وہ منحوس تھا۔ مگر ڈیوڈ کو کیا معلوم؟ جینی نے اس کو بتایا تھا کہ:۔

"ڈیوڈ، میں کچے عقیدے کی لڑکی نہیں ہوں، تم ممی سے پوچھ لینا مگر اس ستارے کو دیکھ کر میرے دل میں ڈر سا گیا ہے کہ کوئی بلا آنے والی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں کسی بات پر پچھتا رہی ہوں۔ میں بے حد خوش ہوں، تم میرا بوسہ لیتے ہو تو میں، اپنے آپ کو دنیا کی ہر عورت سے زیادہ خوش و خرم محسوس کرتی ہوں! مگر یہ ستارا ڈرا رہا ہے۔ کہ میری یہ مسرت مجھ سے چھن جائے گی!"

اس کے جواب میں ڈیوڈ مسکرا دیا تھا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی۔ اس نے کہا تھا:۔

"جینی، کسی جبشی کو کبھی سچ مچ خوش دیکھا ہے، تم نے؟"

ڈیوڈ بڑھئی کے کام میں اور جینی سلائی کے کام میں چھ دن کھپ لیتے تھے، تو اتوار کے دن ملا کرتے تھے، میجر اسمڈل سفر پر تھا، اور بڑا جنگ ڈوبنے کے لئے تھا، اس طرح دن گذرتے گئے۔ ایک ملاقات میں ڈیوڈ نے کہا تھا۔

"جینی ڈارلنگ، اتنی سخت محنت نہ کیا کرو!"

"کیوں؟ میں تو بہت مضبوط ہوں! میرے بازو تو دیکھو!"

"مگر مجھے تو تم بہت نازک نظر آتی ہو!"

جینی نے گردن موڑ لی تھی، اور وہ ستارہ پھر اس کی بساط خیال پر چھا گیا تھا۔ اور پھر اچانک وہ ڈیوڈ سے چمٹ کر اس کے پیار لینے لگی تھی۔ جینی کو گانے کا شوق تھا۔ اور اسے بہت سے گیت یاد تھے وہ گنگناتی تو ڈیوڈ نے بڑے ستارے کا گیت گانے کی فرمائش کی تھی۔ جینی چپ ہو گئی تھی۔ اور اور باتیں ہوئیں تھیں، اور پھر جینی نے ایک گیت سنایا تھا:۔

"جنوب کے پیڑوں میں نرالے پھل لگتے ہیں،
پتوں اور جڑوں میں خون ہی خون ہوتا ہے؛
دکھنی ہواؤں میں کچھ لٹکتا سا لگتا ہے،

پر ان درختوں کے خونی پھل ہی تو ہیں ۔"

"یہ گیت تو جینی چارلی گایا کرتا تھا ! چارلی کا خون فرینک نے کیا اور یہ فرینک بھگوڑا تھا ۔ جینی ! سب کو معلوم ہے ۔ وہ اور دو دوسرے "سفید" بہانے کر کے ہمیشہ اسپتال میں ایڈا کرتے تھے ۔ بلجیم میں ہمارے کپتان نے جو بزدلی دکھائی ، ایک ایک آدمی ہنسا تھا ! رینگتا رینگتا خندق میں آیا اور بکارنے لگا ۔ بس ، معاملہ ختم ہے" اس کی پتلون سب نے دیکھا ، کہ گندی ہو رہی تھی ! اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ہم جرمنی حملے کو پسپا کر چکے تھے ! ہاں جینی ، اس وقت ان کو ہماری ضرورت تھی ! میں انہیں خوب خوب سمجھ گیا ہوں جینی !"

روسیوں سے ہم لوگ ایک ندی پر ملے تھے ! ٹرک میں ہی چلا کر لے گیا تھا ۔ یہ جھوٹے ہیں کہ روسیوں کی لمبی لمبی داڑھیاں ہوتی ہیں وہ نہایت صاف ستھرے اور بڑے جنٹلمین ہوتے ہیں ، جینی ! میرے ٹرک میں تین "سفید ے" بھی تھے ، اور تینوں روسیوں سے یادگاری تمغے مانگ رہے تھے ، اور دستخط لینے کو جا بیٹھے تھے ، میں اور چارلی الگ کھڑے رہے تو روسی کرنیل بڑھ کر آیا ، جس کے سینے پر دو تمغے ٹنگ رہے تھے ، اس نے ہم سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا یہ ان "سفیدوں" نے بھی دیکھا تھا ۔

اس افسر نے کچھ کہا بھی تھا ۔ مگر روسی زبان ہم کیا سمجھتے ۔ اس نے اچھی ہی بات کہی ہوگی ۔ جبھی تو دوسرے روسی بھی مسکرا دیئے تھے ! اس نے چارلی سے بھی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا ۔ میری طرح جینی اور چارلی کو بھی تمغہ ملا تھا ۔ میں نصیب کا دھنی نکلا کہ ثابت چمڑی گھر لا سکا پر بے چارے چارلی کا ایک ہاتھ اڑ گیا تھا ۔ اس کا ہاتھ تو لڑائی میں اڑا پھر انہوں نے تو سموچے چارلی کو اڑا دیا ۔ جینی ! اس لئے جینی ہمارا ہی نہیں ہو سکتی ! سمجھیں ؟ "

جینی نے بڑی توجہ سے سنا ۔ اور کچھ سمجھ کر کہا تھا ۔

"تم جیکسن میں مت رہو ڈیوڈ ، نیویارک چلے جاؤ ، روسی میں شاید نیویارک سے بھی اچھے رہتے ، پر وہ تو بہت دور ہے ! میں کرائے کے لئے روپئے جوڑ رہی ہوں ۔ اور تمہیں جانا پڑے گا !"

"نہیں ، جینی ، میں کہیں نہ جاؤں گا ۔ میں نے تمہیں کھو دینے کے لئے نہیں پایا ہے ! میں سوچا کرتا ہوں کہ حساب کتاب لگانے سے ایک نیا ستارہ دریافت کیا جا سکتا ۔ اور ایک نیا جزیرہ ڈھونڈھا جا سکتا ہے ، مگر محبت نہیں پائی جا سکتی ، جینی ! محبت تو ہو جاتی ہے یا پھر نہیں ہوتی ! مجھے یہ دولت مل گئی ہے جینی !"

"ڈیر ڈیوڈ وہ محبت کیسی دھان پان ہے !"

"جینی ، میسی سپی میں ہماری گنتی "سفیدوں" سے زیادہ ہے ان حبشیوں کو عقل آ جائے تو ہماری زندگیوں میں اطمینان آ جائے کل کی بات ہے ، میں چند لڑکوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے بھیجوں سے کام لینا کیوں نہیں چاہتے ؟ میں نے ان کو بتایا کہ چارلی کو انہیں بھگوڑوں نے قتل کیا تھا ۔ اور روسی کرنیل نے ہم سے خوب ہلا ہلا کر ہاتھ ملایا تھا ! جانتی ہو ان لوگوں نے کیا جواب دیا ؟ اللہ اللہ کر کے چلائے کیوں ؟ اس لئے کہ وہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں ! ایک دن بوڑھا پلاور کہہ رہا تھا کہ خدا نے حبشیوں کے لئے بھی اتنی ہی اچھی جنت بنائی ہے جتنی اچھی "سفیدوں" کی ہے ! کچھ سمجھیں ؟ وہ سمجھتا ہے کہ خدا بھی مزدور پلاور اور سنیڈر لو کو ایک ہی جنت میں نہیں رکھے گا ! میں نے کہا نہیں ۔ ہم لوگ سوچتے بھی ڈرتے ہیں !"

"سوچتے ہوئے تو ڈیوڈ میں بھی ڈرتی ہوں ۔ تمہاری باتوں کو سن کر مجھے بھی ڈر لگتا ہے ۔ پر ساتھ ہی ساتھ میرے اندر ایک لہر سی دوڑ جاتی بھی محسوس ہوتی ہے ۔ یہ باتیں خدا کرے کوئی سنتا نہ ہو !" جینی نے کہا تھا ۔

"کون سنے گا ، فرشتے ؟"

"نہیں ، اسنڈل !"

(۸)

ڈیوڈ نے جب پہلی بار اسے بتایا کہ پلاور کے گھر مبری بنوئیل آئی تھی تو جینی کے دل میں بڑے وسوسے پیدا ہوئے تھے ، ڈیوڈ نقاش

ہے، اس کے کمال کو سفید لیڈیاں بھی سراہتی ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن جب وہ خود اس کی تصویروں کی تعریف کرتی ہے تو وہ اسے صحبت کی وجہ قرار دیتا ہے۔ ڈیوڈ کو سنیٹر کی بیٹی سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیئے، ایسی ملاقاتوں کے نتیجے ہمیشہ برے نکلے ہیں۔ اس کے حق میں نیویارک چلا جانا ہی بہتر ہے:

"میری نیو تین سے پھر بھی ملاقات ہوئی، ڈیوڈ؟" جینی نے ایک دوسری ملاقات میں پوچھا تھا۔

"آج بھی آئی تھی۔ اور میرے لئے رنگ برش وغیرہ بھی لائی تھی۔"

جینی کو یقین ہوگیا کہ سفید عورت نے ڈیوڈ کے خیال و محسوسات میں جگہ بنالی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ آخر وہ دنیا کی خاک چھان کر آئی بھی تو ہے۔ چالاک نہ ہوگی؟ جینی کا دل بہت جلا اور وہ چلی جانا چاہتی تھی، مگر ڈیوڈ نے اس سے اپنی گود کو بھر لیا۔ جینی نے پوچھا تھا۔

"تو اس سے فائدہ؟ تم نے تو ایک دوسری ....."

ڈیوڈ سمجھ کر مسکرا دیا تھا، اور اس کی بات کاٹ کر سوال کیا تھا۔

"ڈارلنگ بتاؤ میں اس سے پیچھا کیوں کر چھڑاؤں؟ میں نے اسے روکا کہ بلاوے کے گھر نہ آیا کرے تو بگڑ گئی تھی ....."

"اور تم اسے ناراض کرنا چاہتے نہیں؛ اس لئے کہ تم اس کو چاہتے ہو!" جینی نے طنز سے کہا تھا۔

"نہیں، جینی، میں اس سے محبت نہیں کرسکتا، میں اس سے خوف زدہ ہوں، تم ملوگی تو سمجھ جاؤ گی، کہ وہ کسی گھر بند رہنے والی عورت نہیں ہے!"

ایک دن گھبرایا ہوا ڈیوڈ جینی کے گھر آیا اور کہنے لگا تھا۔

"اس سنیٹر کی بیٹی کا جینی دماغ چل گیا ہے، آج شام کو وہ مجھے اپنے گھر بلا گئی ہے! میں نے جانے سے انکار کیا تو دھمکیاں دینے لگی!"

"یہ جال ہے ڈیوڈ، اس کے یہاں ہرگز نہ جانا، یہ لوگ تمہاری جان کے خواہاں ہیں!"

"لیکن جینی، اس کا کہنا نہیں کرتا تو دوسری طرح بدلہ لے گی اسے مجھ سے لگاؤ ہوگیا ہے۔ جینی ساری مصیبت تو یہ ہے! سمجھیں کچھ؟ اس نے کھول کے کہہ دیا ہے کہ وہ میرے اوپر اسکنڈل کو للکار دیگی!"

"تم آج ہی نیویارک چلے جاؤ!"

"پگلی ہو؟ تمہارے بغیر میں جنت میں بھی نہ جاؤں گا! یہی ہے تو دو ٹکٹوں کے پیسے جوڑلو! اکیلا جاکر تو میں پاگل ہو جاؤں گا! آج جاکر میں اس سے صاف صاف کہہ آؤں گا ...."

خدا کے لئے ڈیوڈ! وہاں جانے کا تو نام بھی نہ لو ....."

"جینی ڈارلنگ، میں صرف تمہیں چاہتا ہوں! محبت کہیں تباہی کرتی ہے! اچھا ڈارلنگ، شام کو مل رہے!"

ڈیوڈ کے جانے کے بعد جینی نے اپنا کیش بکس کھول کر ریز گاری گنی ایک ٹکٹ کے دام جڑ گئے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ کل ڈیوڈ کو کسی نہ کسی طرح نیویارک روانہ کر دے گی۔ اور اس سے رخصت گھر پر نہیں بلکہ اسی جنگل کے گوشے میں ہوگی، جہاں وہ پہلی بار ملے تھے، اور اقرار محبت ہوا تھا۔ اس کے کیش بکس میں ایک سونے کا دل بھی تھا۔ جس پر دو فاختاؤں کا نقش بنا تھا۔ جینی اپنے اس زیور کو ڈیوڈ سے محبت ہو جانے کے بعد بہت عزیز رکھتی تھی۔ اس روز اس نے اپنے لئے ایک زرد رنگ کا بلاؤز سیا تھا۔ اور آخری ملاقات کے لئے اسی کو پہننا چاہتی تھی۔ تاکہ رخصت کے وقت ڈیوڈ کے ذہن و خیال پر اس کا جو تصور قائم ہو وہ دیر تک رہے: اس ارادے کے بعد فکر و ملال اس کے دل سے از خود رفع ہوگیا۔ اسے اس برے ستارے کا دھیان بھی نہیں آیا۔ اس کے دل میں یہ طمانیت تھی، کہ نیویارک پہونچ کر ڈیوڈ بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ پھر وہ سوچتی رہی کہ رخصت ہوتے ہوئے ڈیوڈ اس سے کیا کہے گا؟ "جلد لوٹ آؤں گا جینی!" جاتے وقت لوگ یہی تو کہا کرتے ہیں! مگر ایک حبشی جب اتر کی طرف چلا جاتا ہے، تو پھر دکھن کا رخ کبھی نہیں کرتا ہے، وہ شاید نیویارک میں

کسی حبشن سے شادی کرے گا ! بیوی کو سنیما لے جایا کرے گا ، اور حبشی کا دھیان آئے گا تو اداس پڑ جایا کرے گا ۔!

انہیں تصورات میں منہمک جینی ، اپنا سلائی کا کام لئے بیٹھی تھی کہ اس کا بھائی دوڑتا ہوا آیا ۔ وہ خبر سنائی تھی ۔ اس وقت جینی کو منہ سے اُف بھی نہ نکلی ، بس اٹھ کر باہر نکل گئی ۔ رات ہو چلی تھی ۔ ستارے بھی مدھم تھے ، گرم ہوا کے جھونکے اس کے رخساروں پر تھک رہے تھے ۔ وہ سناٹے میں پہونچ کر زمین پر بیٹھ گئی ۔ اور خاک پر منہ رکھ کر ایک چیخ ماری

"ڈیوڈ !"

(۹)

میری کو اپنے آپ میں آتے دو دن لگ گئے ، میجر اسٹڈل نے سنیٹر لو کو تار سے وقوع کی اطلاع دیدی تھی ۔ سنیٹر نے ٹیلی فون پر اسٹڈل سے پوچھا تھا کہ میری واشنگٹن کب تک روانہ ہو سکے گی ، اس لئے اسٹڈل میری سے دریافت کرنے گیا ۔ مگر وہ درد سر کا حیلہ کر کے وہ اس سے نہیں ملی ۔ لیکن پھر ایک ہی گھنٹے کے بعد خود اس کے گھر پہونچ گئی اس پر اسٹڈل کو مطلق تعجب نہ تھا ۔ اس نے بڑی نرمی اور نہایت رواداری سے گفتگو کی اور افسوس ظاہر کیا کہ ایسی حالت میں وہ میری کی تکلیف کا باعث بنا ۔ وہ کہنے لگا ۔

" واقعے کی ہنگامہ خیزی تو دس پانچ روز میں ختم ہو جائے گی ..."

" میری نے بات کاٹ کر کہا ۔

" تمہیں آرٹ یا ہنر سے تو کوئی لگاؤ ہے نہیں ۔ اس لئے یہ کہنا بے فائدہ ہے ، کہ وہ ایک ہنرمند نقاش ہے ۔ لیکن میں تمہیں آگاہ کر دینا چاہتی ہوں کہ عدالت میں میرا بیان غلط ہی ہو گا کہ وہ میرا بلایا ہوا آیا تھا ....."

" معاف فرمائیے گا ، اس کو کوئی باور نہیں کرے گا ۔ بلائے ہوئے آدمی چوروں کی طرح کھڑکی سے نہیں کودا کرتے ہیں !"

یہ سن کر میری لال پیلی ہو گئی ، اور کھڑی ہو کر چیخنے لگی ۔

" تو اب یہ کہوں گی ، کہ مجھے اس سے عشق ہے .... مجھ رتی بھر پرواہ نہیں کہ لوگ مجھے آبرو باختہ کہیں گے !"

" لیکن آپ کا یہ بیان بھی اس حبشی کو بچا تو نہ سکے گا ! یہ سنتے ہی لوگ اسے جیل توڑ کر گھسیٹ لائیں گے ، اور وہ زندہ بھون دیا جائے گا ۔ یا کسی درخت سے ٹنگا ہوا ملے گا !" "آپ تو جانتی ہیں کہ امریکن لوگ ایسی بات کو معاف کر دینا جانتے ہی نہیں ہیں ۔ رہ گیا یہ سوال کہ ایسا اقبال کرنے کا اثر آپ کی ذات پر کیا پڑے گا ۔ میں کچھ نہ کہوں گا ، مگر آپ نے اس پر غور کر لیا ہے ، کہ آپ کے ایسے شفیق باپ کی عزت و آبرو کے ساتھ یہ اقبال کیا سلوک کرے گا ؟" سنیٹر لو آج واشنگٹن میں ایک اونچی شخصیت کے مالک ہیں ...... میں تو کہوں گا کہ فخر امریکا ہیں ! جس وقت یہ خبر عام ہوئی کہ سنیٹر لو کی بیٹی ایک حبشی سے ہم بستر ہوئی ، تو سر بازار ان کے پیچھے تو تو ہونے لگے گی ، اور چونکہ میں اُن کی طبیعت سے واقف ہوں ۔ آپ مان لیجئے کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں گے : کیا آپ نے یہ بھی طے کیا ہے"

میری کو اسٹڈل کی بات کی صداقت کا احساس ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ، بے بسی کے آنسو ! وہ یہ کہہ کر وہاں سے چل دی ۔

" تم جوتے کے تلے کے برابر ذلیل ہو ۔ میں تم سے عمر بھر نفرت کروں گی "

میجر اسٹڈل نے بظاہر اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا ۔ ایک سکون آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا ۔

" مس ینگ لو ، میں آپ کے اس وقت کے محسوسات کو سمجھ رہا ہوں میں بس اتنا یاد دلاؤں گا کہ ایک وقت مجھے کہنا پڑا تھا کہ میں آپ کا شوہر بننے کا اہل نہیں ۔ کیونکہ میں نہ شاعر ہوں نہ صناع ۔ محض آپ کے والد ماجد کا دوست اور خیر خواہ ہوں ۔ اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی نفرت کا بھی اہل نہیں ہوں ۔"

(۱۰)

دوسرے دن میری ، بیرسٹر کلارک سے ملنے گئی ، جو ڈیوڈ کی قانونی چارہ جوئی کے لئے مقرر کیا گیا تھا ۔ اور شہر کے لوگ جن میں

اسمڈل سب سے آگے تھا۔ اس " لال وکیل " کے اسی لئے دشمن تھے، کہ وہ حبشیوں کو سزا ملنے سے بچانا چاہتا ہے۔

روٹری کلب کی ایک میٹنگ میں کلارک نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سوویت روس دنیا میں امن کا خواہاں ہے۔ اس تقریر کے بعد اس کے پاس پچاسوں خط آئے تھے، جن میں اسے گالیاں سنائی گئی تھیں۔ دھمکیاں دی گئی تھیں۔ اور کہا گیا تھا۔ کہ وہ جیکسن کو چھوڑ کر ماسکو میں گھر بسائے۔"

میری نے کلارک کو بتایا کہ یہ پورا واقعہ ایک " المناک غلط فہمی" کے سوا کچھ نہیں ہے! اس نے اقبال کیا کہ گو وہ ایک ہنرمند نقاش ہے، مگر ایک حبشی کو اپنے گھر بلانا احمقانہ حرکت تھی، حالانکہ وہ دھمکی اور دباؤ کی وجہ سے مجبور ہو کر آیا تھا۔ اور بدقسمتی سے اسمڈل کے آجانے پر خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن اس کا کوئی حل تو ہونا چاہئے!"

کلارک نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا۔ اور پھر کہا۔

" اس کے بچاؤ کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ چوری کی غرض سے جانے کا اقبال کرے! دوسری کوئی صورت میرے ذہن میں نہیں آتی ہے"!

اس پر میری بہت جھنجلائی، اس کے صناعانہ کمال کو سراہا اس کی حیا پروری کی تعریف کی۔ اور بتایا کہ ——— " میرے ہاتھ سے اسے رنگ اور برش کا تحفہ لینا منظور نہ تھا" میری نے بار بار کہا کہ سارا قصور خود اس کا ہے، اور ڈیوڈ بالکل معصوم ہے۔ " اپنی شہادت میں سارا الزام میں اپنے اوپر لے لوں گی۔"

بیرسٹر نے سر ہلا کر اختلاف رائے کر کے کہا۔

" بڑی ہمدردی دکھائیں گے، تو آپ کے دماغی مریض ہونے کا فیصلہ دیں گے۔ آپ اس کی معصومیت پر جتنا زور دیں گی۔ میرے موکل کے حق میں اتنا ہی مضر ثابت ہوگا! اس کیس میں آپ سے بڑی امداد یہ کر سکتی ہیں۔ کہ آپ بالکل خاموش و بے تعلق بن جائیں۔ میں اسے سمجھا سکوں گا کہ چوری کی نیت کا اقبال کر لینے سے ہلکی سزا

پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ ہر چند ہمیں کسی رعایت کی توقع یا رحم کی امید ہرگز نہ ہونا چاہئے، اس کے علاوہ جو بھی جواب دہی کی جائے گی، سنگین سزا ہونا لازمی ہے۔ چند مہینوں کی جیل بجلی کی کرسی پر بیٹھنے سے بہرحال بہتر ہے۔ سرکاری وکیل تو قتل عمد کا مقدمہ چلانا چاہتا ہے!"

" قتل کی نیت کا لفظ منہ سے نکالتے یہ لوگ شرماتے کیوں نہیں؟ میں جانتی ہوں یہ ساری ریشہ دوانیاں اسمڈل کی ہیں۔ یہ ظالم لوگ اپنی سیاسی اغراض کے لئے ایک بے گناہ اور ہنرمند نقاش کی زندگی ختم کر دینے پر تیار ہو سکتے ہیں! میں اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میں علانیہ کہوں گی، کہ مجھے ڈیوڈ سے عشق ہے! حالانکہ اس کو میرے ساتھ ایک ذرہ لگاؤ نہیں ہے، آپ کیوں نہیں سوچتے کہ میرے بیان پر عدالت اس کو بری کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔؟"

کلارک بیرسٹر نے پھر سر ہلا کر اختلاف کیا۔

" کچھ نہیں ہوگا! آپ سفید رنگ والوں کا ضابطہ توڑنا چاہتی ہیں۔ مگر توڑ نہیں سکیں گی۔" آپ کی گت گت البتہ ہو جائے گی آپ کے باپ سنیٹر ہیں۔ ان کی آبرو بچائی جائے گی۔ اور خلل دماغ کی بنا پر آپ کو پاگل خانے میں رکھا جائے گا!

" مگر وہ تو بری ہو جائے گا!"

" ناممکن! میں اس کی بریت تو چاہتا بھی نہیں۔ بری ہو جانے کے بعد اسے جو سزا دی جائے گی، اس سے بجلی کی کرسی کہیں بہتر ہے ------!"

" لیکن آپ وہی کہہ رہے ہیں، جو اسمڈل کہتا ہے، دونوں میں فرق کیا ہوا پھر؟ مجھے یقین نہیں آسکتا، کہ ایک بے گناہ آدمی کو بچایا نہیں جا سکتا۔ آخر انصاف کہاں چلا جائے گا؟ اُف میرا دماغ عاری ہے۔!"

بوڑھا بیرسٹر مسکرایا، اور اس مسکراہٹ! وہ ایک تندرست

وقد آور آدمی تھا۔ ساٹھ سال کی عمر تھی۔ اس کی سفید گھنی بھویں چہرے کو رعب دار بنا رہی تھیں۔ مگر جب مسکراتا تھا تو اندر کا ہمدردی اور محبت کرنے والا انسان برملا ہو جاتا تھا۔ کہنے لگا۔

"آپ طویل مدت تک غیر ملکوں میں رہی ہیں، اس لئے آپ کے اندر امریکن احساس مر گیا ہے۔ بعض وقت میں خود سے سوال کیا کرتا ہوں کہ آخر میں ہوں کہاں؟ کیا ایک بہت بڑے پاگل خانے میں تو نہیں ہوں؟ ہماری یہ اسٹیٹ ایک بڑا پاگل خانہ ہی ہے اس خط کو پڑھیئے آج ہی ڈاک سے ملا ہے۔

"لال بندریہ نہ سمجھو کہ اس کے بعد تم سلامت رہ سکو گے! تم ایک گندے حبشی کی جان بچانا چاہتے ہو، اپنی جان کی خیر مناؤ۔ اپنے شہر جیکسن میں ہم ایک کمیونسٹ کو باقی نہیں چھوڑیں گے! ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے پاس روس سے چھ ہزار ڈالر آ گئے ہیں۔ جس کے لئے تم یہ گندہ کام کر رہے ہو۔ ہم کو تمہارا امن نہیں چاہئے، تم روس کو ہمارے ایٹم بم سے نہیں بچا سکو گے۔ اور تمہارے لئے تو ایک چھوٹی سی گولی ہی کافی ہے!

(دستخط کی جگہ) سچے امریکن"

"درندے کہیں کے!" میری نے نہایت برانگیختہ ہو کر کہا۔

"ہوں ں! ایسوں کی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے! آپ نہیں جانتیں، کہ حبشیوں کو کن کن صورتوں سے قتل کیا جاتا ہے! میری طرف دیکھئے، میں کس طرف سے لال نظر آتا ہوں؟ میرا گھر ہے بیوی ہے اور بیٹی ہے۔ کمیونزم کو میں خود بھی ناپسند کرتا ہوں مگر روس سے میرے پاس ہزاروں ڈالر چلے آتے ہیں، زندگی بھر میں نے بجز ایک سرکس والوں کے سوا کسی روسی کو دیکھا نہیں ہے اور وہ کا زاک لال بھی نہ تھے۔ البتہ میں امن عالم ضرور چاہتا ہوں مگر یہ خواہش امریکہ کے اندر جرم ہے!

"فریڈ، شاید آپ کو یاد ہو۔ بڑا سعادت مند اور ہونہار لڑکا تھا! میں سمجھ سکتا ہوں کہ جوان بیٹے کی موت کے کیا معنی ہوتے ہیں! روس ہمارے ملک سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے اور مجھے کبھی روس کا خیال بھی نہیں آتا۔ لیکن فریڈ کا فوجی ساتھی اور دوست جو وطن کے لئے جنگ میں بہادری سے لڑا ابھی ہو، بے گناہ پھانسی کیوں پا جائے؟ میرے مکان کی دیواروں پر لکھ دیا گیا ہے ــــــ "حبشیوں کے حمایتی کے لئے موت ہے۔"

"اور میں آخر ایک وکیل ہوں، کسی پر الزام آئے گا تو کوئی نہ کوئی تو اس کی پیروی کرے گا ہی! مجھے حبشیوں سے خاص اُنس بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ بچوں کی طرح سادہ اور سیدھے ہیں، ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ترقی کرنے کا موقعہ ہی کب ملا؟ دیا کب گیا...؟ قانون پیشہ ہونے کے علاوہ میں حق و انصاف کا حامی ضرور ہوں یہ خط بھیجنے والے اپنے آپ کو "سچے امریکن" لکھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ بدترین امریکن ہیں۔ اور ایک دن امریکا کو بہت بڑی مصیبت میں پھنسا کے رہیں گے۔" وہ جذبات سے بے قابو ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ٹہلنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں بے قابو ہو گیا۔ اور سیاسی باتیں کرنے لگا۔ حالانکہ ہم بزنس کی بات کر رہے تھے۔ بہرحال صورت میں نے آپ کو بتا دی ہے، آپ میرا مشورہ مان کر الگ تھلگ ہی رہئے! وہ فوج میں رہ چکا ہے جنگی مورچے پر بہادری کا تمغہ پا چکا ہے، میری انتہائی کوشش ہوگی، کہ ہلکی سی ہلکی سزا پڑ جائے، اور وہ ابھی نو عمر ہے... گزار بھی آئے گا!"

میری، جانے کے لئے اٹھی، تو کلارک نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور کہا۔

"آپ نہایت شریف طبع لیڈی ہیں، مگر افسوس کہ آپ جیسی بہت نہیں ہیں!"

میری کو اب حق الیقین ہو گیا، کہ وہ ڈیوڈ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی لیکن اس صورت حال پر خفا بے حد تھی۔ کیسی ظلم کی بات ہے کہ بالکل بے گناہ آدمی سے چوری کے ارادے کا اقبال کرانا ضروری ہے،

گھر پہنچی تو باپ کا تار ملا، کہ میری اگر فوراً روانہ نہیں ہو جاتی ہے۔ تو وہ ہر چیز کو لات مار کر خود جیکسن کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ میری ڈر گئی اور روانہ بھی ہو گئی۔

ڈیوڈ کا خیال ٹرین میں آیا تو میری رو پڑی۔ پھر اس نے طے کیا کہ واشنگٹن پہونچ کر شوہر سے مدد مانگے گی۔ وہ بڑا کائیاں ہے۔ کوئی راستہ ضرور نکال لے گا۔

(۱۱)

میری جس وقت پہنچی تو حسن اتفاق سے باپ گھر پر موجود تھا اس نے سارا قصہ نیوئیل کو کہہ سنایا۔ البتہ اسٹول کے پاس اپنا جانا نہیں بتایا۔ ڈیوڈ کو اپنے گھر بلانے کی وجہ ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ یہ بتائی کہ :۔

"میرا منشاء ایک معصوم سا معاشقہ کرنا تھا۔ مگر اس احمق کو عورتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ واقعی ایک صناع ہے!"

نیوئیل نے بیوی کا بیان خوشی اور توجہ سے سنا، اور معاملے کی اہمیت کا اندازہ فوراً کر لیا۔ اس واقعے کے چھلکے پر سے سنیٹر تو بآسانی پھسل جائے گا۔ مگر سنیٹر تو کے ساتھ تو خود اس کا مقدر وابستہ ہے؛ اس لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس ہسٹریا زدہ عورت کو چپ رکھا جائے،...

.... کہنے لگا۔

"اس بیرسٹر نے ٹھیک کہا ہے، تم اپنے اقبال سے اس حبشی کو قبر میں سلا دو گی۔ یہ ہے تمہارا امریکہ!!"

"میرا کیوں؟ یہاں پیدا ہو جانے میں میری مرضی شامل کب تھی اور یہ میرا قصور کیونکر ہوا؟ مگر تم جھٹ سے کہدو گے کہ میں سیاست کو کیا سمجھوں! اور غلط بھی نہیں ہے، لیکن میں اتنا تو سمجھ ہی سکتی ہوں کہ تمہاری "ٹرانسوک" کی اسکیم ایک امریکن اسکیم ہے!"

"شیری (پیاری)، میں ایک فرانسوی ہوں، اور اگر جاننا چاہتی ہو تو سن لو، کہ مجھے بس ایک فرانس سے دلچسپی ہے۔ یہ حبشی والا معاملہ فرانس میں پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ رہ گئی "ٹرانسوک" کی بات۔ سو وہ تنہا امریکن اسکیم نہیں ہے، کیا سمجھتی ہو؟ بولشویک یہاں آگئے تو تمہارے ان سرائیلسٹوں (نقاشی کا ایک اسکول) کے ساتھ کیا کرینگے؟ میں امریکہ کا طرفدار نہیں ہوں، مگر روس کا مخالف ضرور ہوں۔ لڑائی کے زمانے میں تمہارے ایک فیکٹری مالک سے پیرس میں ملاقات ہوگئی تھی۔ آدمی تو بے ہنگم تھا، مگر شاید مذاق اچھا کر سکتا تھا۔ میں نے امریکنوں کے روسیوں کے ساتھ شیر و شکر ہونے پر اعتراض کیا تو کہنے لگا :۔

"جنگ کے اتحادی منتخب نہیں کئے جاتے ہیں!"

بہر حال اس بات کی سخت احتیاط لازم ہے کہ مسٹر تو کے سامنے ایسا کوئی ذکر نہ ہو۔ جس سے ان کو رنج اور صدمہ پہونچے۔

اب تک میری اپنے شوہر کی گفتگو پورے دھیان سے نہیں سن رہی تھی، مگر جب باپ کا نام آیا تو ہمہ تن متوجہ ہو گئی اور سوال کیا

"ویسے ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"عمر کا تقاضا! ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے، کہ ان کو دوران خون کی شکایت ہے، اس لئے بے جان جذبات سے بچائے رکھنا ضروری ہے۔ ویسے وہ چاق و چوبند ہیں! آج سینٹ میں ان کی پھر ایک تقریر ہے! تم سے ملنے کے لئے بڑے بے تاب ہیں۔"

میری مسکرا پڑی، مگر فوراً ہی چہرے پر تفکر کے آثار چھا گئے اور کہنے لگی۔

"مجھے اس حبشی کے خیال نے منتشر حواس کر رکھا ہے، کیا ہو سکتا ہے۔!"

"میں اس پر حیران ہوں کہ تم نے اس کو ایک مسئلہ بنا لیا ہے، وہ جوان آدمی ہے، دو تین سال کی بھی کاٹ آیا تو کون سا بڑا فرق پڑ جائے گا! جیل کے باہر ان لوگوں کی زندگی کون بڑی سہانی ہے بھگتا کر نکلے تو روپیہ پیسے سے مدد کر دینا کہ وہ نیویارک جا کر رہے شمالی ریاستیں ان حبشیوں کے لئے پھر غنیمت ہیں۔"

"مدد تو اس کی کروں گی ہی مگر......"

نیوتِل نے اندازہ کر لیا، کہ خطرے کا لمحہ گذر چکا ہے، تو موضوع بدل کر کہنے لگا:۔

"ہم لوگ ایک ہفتے میں روانہ ہو جائیں گے۔ مگر جانے سے پہلے مجھے نیویارک میں بہت سا کام ختم کرنا ہے، وہاں بھی کچھ وقت لگے گا۔ مجھے یقین ہے تم اس کا خیال نہ کرو گی میسی، کیپی کے بعد واشنگٹن کی آب و ہوا تمہارے لئے مفید بھی ہو گی" اور ہاں، تمہارے نام ایک خط بھی تو آیا ہے۔"

یہ اسی صناع کا خط تھا۔ اور اس نے میری سے دریافت کیا تھا کہ وہ نیویارک کب پہونچے گی، وہاں اس کی تصاویر کی نمائش ہونے والی ہے۔ خط پڑھ کر میری مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی" بھولا نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ڈیوڈ کا خیال اسے پھر آیا، مگر سرسری سا۔ اب یہ واقعہ باسی ہوتا جا رہا تھا وہ سوچنے لگی۔

" واقعی میں صورت واقعہ میں مبالغہ کر رہی تھی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! اس کے ہنرور ہونے میں کلام نہیں۔ غریب ناحق مصیبت میں پھنسا۔ جیل کے اندر نقش بنانے کی اجازت تو ہو گی؟ پہلی بات یہ ہے سزا کم سے کم ہو۔"

اس نے اپنے اٹیچی کو کھنگالا۔ جس میں بلا بدتر نہ جانے کیا کیا بھرا تھا۔ اور کاغذ کا پیڈ نکال کر بیرسٹر کلارک کے نام ایک خط لکھا۔ اور بتایا کہ اس کی ہی رائے صحیح تھی۔" مجھے امید ہے کہ ہیرستین کو کم سے کم سزا ہو گی۔ مہربانی کر کے اسے اطلاع کرا دیجئے، کہ اس کے سگریٹ اور سامان نقاشی کے لئے ہر مہینے الاؤنس پہونچ جایا کرے گا۔" خط کے ساتھ اس نے ایک چیک خود بیرسٹر کلارک کے لئے رکھ دیا۔ کہ اس طرح پیروی زیادہ دل سوزی سے کرے گا۔ یہ خط روانہ کر چکی تو اس نے محسوس کیا کہ سر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فرانسوی سفارتخانے کا کونسلر بول رہا تھا۔ جس سے میری پیرس میں مل چکی تھی۔ کونسلر نے ایک گارڈن پارٹی دی تھی، اور چاہتا تھا کہ میری بھی شریک ہو اب میری ساری باتیں بھول کر پارٹی کی شرکت کے لئے ایک نئی ہیٹ خریدنے چلی گئی۔ اور خوش رہنے اور رکھ رکھاؤ برتنے والا واشنگٹن اس وقت میری کی نظر میں زندگی کے ہنگامے اور مسرت سے معمور تھا۔

ٹوپی خرید لینے کے بعد میری نے دیا تا کے ایک مشہور طبلہ نواز کی نمائش فن کا ٹکٹ خریدا۔ اور جب وہ ٹکٹ لے رہی تھی ایک میکسیکن چہرے مہرے کا جوان عمر آدمی بھی وہاں کھڑا تھا۔ وہ میری کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ میری کو وہ صناع یاد آ گیا۔ اور وہ بھی مسکرا پڑی آخر وہ اپنے باپ سے ملاقات کرنے گئی۔ باپ نے بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا۔

" بیٹیا پیاری، سچ سچ وہ تمہیں قتل کرنے آیا تھا کیا؟"

" بالکل غلط!" میری نے ہنس کر جواب دیا" خدا کرے وہ اسے اگر بری نہ کریں تو ہلکی سی سزا پر بس کریں!"

" دیکھتے ہو، کیسے دل والی لڑکی ہے؟" سینیٹر نے نیوتِل، کو مخاطب کر کے احساس فخر کے ساتھ کہا۔ اور گردن کے اشارے سے نیوتِل نے تائید بھی کی۔

(۱۲)

بیرسٹر کلارک ابھی ابھی جیل میں ڈیوڈ ہیرستین سے مل کر آیا تھا۔ بجلی کا پنکھا اس کے سفید بالوں کو بکھرا رہا تھا۔ جیل کی گرمی اور ٹھوکل کے ساتھ مغز پچی کرنا کافی تھکا دینے والی صورت تھی۔ اس نے لاکھ کوشش کی اور ساری اونچ نیچ سمجھائی، مگر ڈیوڈ چوری کی نیت سے جانے کا جھوٹا اقبال کر کے حبشی نسل و خون کی تذلیل کرنے کو کسی طرح تیار نہ تھا۔ حالانکہ ایسا اقبال کر کے بھی ہلکی سزا ملنا مشکوک تھا۔ کیونکہ میجر اسٹڈال نے کہہ دیا تھا کہ:۔

" میں سارے حبشیوں کو برا نہیں کہتا۔ ان میں بعض اچھے بھی ہیں، مگر جنگ ختم ہونے کے بعد سے عام طور پر یہ لوگ گستاخ

اور دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ سینیٹر لوئی کے دفتر پر قاتلانہ حملہ کیا ثابت کرتا ہے؟
ان کالی چمڑی اور لال دل والے حبشیوں کو ایک سبق کی سخت ضرورت ہے۔"

"اس بیان کے بعد کسی نرم برتاؤ کی توقع رکھنا دشوار تھا۔ لیکن یہ حبشی جوان جھوٹا اقبال کر کے اپنی قوم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ جذبہ نیویارک کے اسٹیج پر دکھائے جانے کی چیز ضرور تھا، مگر جیکسن کی عدالت میں اس کے معنی یقیناً بجلی کی کرسی پر بیٹھنے کے تھے۔ مانا کہ وہ حبشی بالکل بے گناہ ہے۔ لیکن جب وہ عقل اور مصلحت کو یوں دھتکار دے گا، تو اس کی جان کیوں کر بچائی جا سکتی ہے؟ یہی کہ ایک سچے آدمی کے لئے جھوٹا اقبال جرم بہت بڑی قربانی ہے لیکن وہ بھلا دیتا ہے کہ یہ میسی سیپی اسٹیٹ ہے، جہاں دیانت داری صداقت کا وجود نہ ہو۔ وہاں اس کی تلاش فعل عبث ہے، بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، پنکھے کی ہوا بھی سکون بخشتی نہیں۔"

بیرسٹر کلارک ایسے ہی خیال میں گم تھا، کہ اس کی بیوی داخل ہوئی، کلارک نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ کوئی نیا گل کھلا ہے اس گھر میں چند روز سے کوئی نہ کوئی نیا ماجرا پیش آ جاتا تھا گالیوں سے بھرے خط، دیواروں پر لکھی ہوئی دھمکیاں، باورچن کا روتے ہوئے کہنا، کہ دکاندار "لال" آدمیوں سے کاروبار نہیں کرنا چاہتے اسی قسم کی اور بہتیری باتیں، کلارک کے لئے روزمرہ بن گئی تھیں۔"

"کیا بات ہے، اینی؟" کلارک نے بیوی سے پوچھا۔

"پہلے ہی تم کچھ کم پریشان ہو۔ لیکن کہوں نا تو کیا کروں، بیلا تو پاگل ہوئی جا رہی ہے، لوئیس نے خط بھیج کر اپنی منگنی توڑ دی ہے"

ایک ہفتہ پہلے تک بیرسٹر کلارک اس رشتے کے سخت خلاف تھا۔ لوئیس ایک دولت مند باپ کا لڑکا تھا، اور باپ روئی کی تجارت کرتا تھا۔ جب تجارت میں آدمی صبح لکھ پتی بن جاتا ہے اور شام کو قلاش۔ لیکن اس کی بیوی نے خود اپنی اور کلارک کی منگنی کا واقعہ یاد دلایا۔ اس کا باپ بھی اس رشتے پر رضامند نہ تھا، مگر کلارک کی بیوی نے باپ کی بات نہیں مانی تھی۔ اس دلیل کو سن کر کلارک رضامند ہو گیا تھا۔

لیکن آج ایک ہفتے کے اندر وہ بڑی محبت کرنے والا اپنی محبوبہ اور منگیتر سے غداری کر رہا تھا۔

"یعنی؟" کلارک نے مزید وضاحت چاہی، تو بیوی نے بتایا:۔

"بیلا نے وہ خط مجھے دکھا دیا ہے، لوئیس نے لکھا ہے کہ اس کی جان بڑے عذاب میں ہے، باپ نے کہہ دیا ہے کہ اس نے اگر "لال وکیل" کی لڑکی سے شادی کی تو وہ اسے عاق کر دے گا اور اس کو گھر سے نکل جانا پڑے گا! اب لوئیس اتنے مضبوط کردار کا تو ہو نہیں سکتا کہ باپ سے فرنٹ ہو جائے، اس لئے بیلا کی طرف سے میں بڑی فکر میں پڑ گئی ہوں، اس نے کمرہ بند کر لیا ہے اور جواب بھی نہیں دیتی ہے۔

کلارک ایک دم سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ان کمینوں کی فطرت کو میں جانتا ہوں، ابھی تو خط ہی لکھا ہے کل اخباروں میں مضامین بھی چھپوائیں گے، تم دیکھو گی کہ تمہاری دیواریں اوپر سے نیچے تک گالیاں لکھ کر کالی کر دی جائیں گی۔ اینی، میں ڈرتا ہوں... اپنے لئے نہیں... امریکا کے لئے ڈرتا ہوں!"

(۱۳)

جھٹپٹے کا وقت تھا جب حسب معمول جیل وارڈن نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا تو حبشی ڈیوڈ چھت سے لٹکا ہوا تھا اس نے ایک ریشمی رسی سے خود کو پھانسی لگا لی تھی۔ آناً فاناً پورے جیل کے اندر اس خبر سے ہڑبونگ مچ گیا۔ چیف وارڈن بہت برہم تھا کہ اس گندے حبشی نے اس کی بارہ سال نوکری کے بے داغ ریکارڈ کو داغی بنا دیا وہ پوری حبشی نسل کو گندی گالیاں دے رہا تھا۔ بجلی کی کرسی اور پھانسی میں کچھ ایسا فرق تو ہے نہیں لیکن اس کوّے نے ہم سب کو یہاں نہیں قانون کو بھی چکمہ دے دیا اس کے سازشی ضرور ہوں گے ورنہ رسی اس کو کیسے پہنچتی؟ اس کا پتہ کیسے چلے؟ جج گارڈن کو رپورٹ ہوئی تو اس نے فوراً اسمتھ کو فون کیا ...۔ "بڑی ہولناک خبر ہے جج! وہ حبشی لڑکا جس کو آپ نے گرفتار کیا تھا، یاد ہے نا؟! سنئے آپ پھانسی لگا کر مر گیا بہت ناخوشگوار واقعہ۔ بیشک! اس کو جیل میں رسی کیونکر پہنچی! میں حیران ہوں کہ ... لوگ خودکشی کر کیا کہیں گے؟"

"خیال کیا کریں گے : کم از کم میں اس وقت ان کے سامنے ہونا نہ چاہونگا! یہ معمولی نہیں بلکہ قومی اہمیت رکھنے والا کیس تھا۔ میں تصور میں نہیں لاسکتا کہ ذمہ دار لوگ اتنے غافل ثابت ہوں! یہ مقدمہ چلتا تو مشتبہوں کے حوصلے پست ہوتے مگر ___" اسمڈل نے جواب میں کہا:

"میجر میں نہایت بدحواس ہو رہا ہوں۔ سازش کا پتہ بیلے تک چلایا جائے گا۔ براہ کرم سینیٹر کو میرا پیغام ہمدردی پہونچا دیجئے گا۔" جج گلمور نے کہا۔

"سنئے! آپ کے خیال میں اسکورسی کسے پہنچائی؟ میں شرط لگاتا وہ بیرسٹر کلارک تھا! پہلوگوں نے اس کے ساتھ نرمی برتی۔ شکاگو کی تقریر کے بعد اس کے ساتھ ہمارا رویہ شدت کا ہونا تھا"

"اچھا دھیان دلایا آپ نے : اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا : دار بچہ کا بیان ہے کہ واقعے سے دو گھنٹے پہلے کلارک ملزم سے ملنے گیا تھا۔ میں ابھی ۔F۔B۔I کو فون کرتا ہوں!"

جج گلمور میجر اسمڈل سے یہ ناخوش گوار گفتگو کر کے کمرے سے نکلا تو دیکھا کہ اس کی باورچن بیٹھی رو رہی۔ گلمور اس کے فن طباخی کی تعریف کیا کرتا تھا۔ اور اس کے کمال فن کی داد دینا چاہتا تو اس سے کہتا "جاؤ غسل کر ڈالو۔ آج میری طبیعت بحال ہے"! چنانچہ اسے اس وقت روتے دیکھ کر گلمور کا دل پسیج گیا۔

"کیوں رو رہی ہو؟"

"مجھے ڈیوڈ پر ترس آرہا ہے!"

"تم بڑی بیوقوف لڑکی ہو۔ بجلی کی کرسی پر بیٹھنا پڑتا تو دیر تک تڑپتا۔ اس طرح پل بھر میں کام تمام ہوگیا۔ جانسن حبشی کا قصہ یاد نہیں رہا۔ پورے آٹھ منٹ تڑپتا رہا تھا! ترس کنہیں مجھ پر آنا چاہئے کہ اس فروگذاشت پر کیا جانے کیا آفت آنیوالی ہے!"

(۱۴)

جینی کے آس پاس مختلف رنگ و وضع کے بلاؤز بکھرے پڑے ہیں اور وہ بت بنی بیٹھی ہے، اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ ہے، اس پرچے میں لکھا ہے:

"بہت پیاری جینی، مجھے معاف کر دینا۔ یہ لوگ مجھے جینے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں قابل نہیں ہوں، چور بھی نہیں ہوں، مگر حبشی تو ہوں ہی! ایک روسی کرنیل نے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا؟ میں اپنے اس ہاتھ کو چوما کرتا ہوں! میرے سارے سنے جینی تم کو غلط نہیں بتایا تھا! تم اب کہیں اتری علاقے میں جا بسنا۔ جینی تمہارے پاس ریل کا کرایہ تو جڑ ہی گیا ہے! میں جانتا ہوں تمہیں بیحد صدمہ ہوگا۔ مگر جینی میں تم سے درخواست کرتا ہوں، منت کرتا ہوں کہ خوددار بنو، اور ظالموں کو اس وقت تک نہ بخشنا جب تک یہ تمہارے پاؤں میں نہ گر جائیں! چند منٹ اور رہتے ہیں پیاری! اس وقت تم اور میں جنگل کے اس برگزار میں پھر رہے ہیں! اور تمہارے ہاتھ تمہارے ہونٹھ۔ اور ہماری مسرت ہمارے ساتھ ہے! جینی مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ اس کو یاد رکھنا! یہ اس آدمی کے لفظ ہیں جو کبھی جھوٹ بات نہ اپنے آپ سے کہتا ہے نہ دوسروں سے!

میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا بوسہ لیتا اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ ڈیوڈ ہیریسن" گھڑی رات کے بارہ بجا رہی ہے۔ میجر اسمڈل اپنے مکان میں سویا پڑا ہے۔ جج گلمور اپنی باورچن کی کوٹھری میں گھسا ہوا ہے، جینی البتہ جاگ رہی ہے، بےحس و حرکت بیٹھی لالٹین کی لو کو دیکھے جا رہی ہے جس میں اسے ڈیوڈ کا چہرہ نظر آرہا ہے! اس کا جی اس بات کو نہیں مان رہا کہ ڈیوڈ اب اس دنیا میں نہیں ہے!

(۱۵)

نیویارک کے ایک فیشن ایبل ریسٹوران میں مینوئل میاں بیوی ایک پارٹی میں شریک تھے میری نے آج بناؤ سنگار میں زیادہ محنت کی تھی۔ مگر اس کے چہرے "میک اپ" سے مینوئل اتنا ہی کڑھ رہا تھا۔ شام کا اخباری ایڈیشن آیا" جیکسن جیل میں حبشی ہیریسن نے خودکشی کر لی!" موٹے حروف میں چھپا دیکھا تو میری کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مینوئل کو اس کی اس بدتمیزی پر ذلت

کا احساس ہونے لگا اور اس نے ڈانما کی پبلک جگہ میں بیٹھ کر شوہر سے جھگڑنا ناٹک کیا
کہیں گئے! وہ اٹھکر اس کمرے میں چلی گئی جہاں مغربی عورتیں اپنے بناؤ چناؤ کی
مرمت کرتی ہیں۔ سنبھل سنبھلا کر واپس آئی تو یہ سوچتی ہوئی کہ ڈیوڈ اس کے
اصرار پر بھی نیویارک جانے پر راضی نہیں ہوا تو ضرور اسے کسی لڑکی سے
شدید محبت تھی! اس نے ٹھان لی کہ بیرسٹر کلارک کے ذریعے سے اس لڑکی
کا پتہ چلا کر کچھ رقم بطور امداد بھجوا دے گی۔ اس خیال یا اس ارادے سے
اس کا ضمیر بالکل مطمئن ہو گیا! اور وہ کیفیت رفع ہو گئی۔ پھر ڈیوڈ کا
واقعہ ہی ذہن سے محو ہو گیا۔

پارٹی جب منتشر ہوئی تو میری نے ایک سہیلی کے ساتھ تھیٹر جانے کی
قرارداد کا حیلہ کر کے شوہر سے چھٹکارا لیا اور سیدھی اس صناع کے پاس
جا پہنچی، وہ اس کے خلاف توقع آ جانے پر بالکل متعجب نہیں ہوا۔
اور ایک جن کی بوتل نکال لایا۔ دونوں بیٹھے مے خواری کرتے رہے، میری
نے پوچھا:۔

"کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ABSTRACTIST اسکول SURREALIST کو ختم کر دے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کون جانے؟ اس پچھلے مہینے میں میری ایک بھی تصویر نہیں بکی
اور نہ میں نے کوئی بنائی۔ یہ زندگی جڑ تک سڑ چکی ہے!"

"پھر بھی!"

"نقاشی میں میں صرف رعنائی کو مانتا ہوں، میری نقاشی خود
میری نظر میں ہیچ ہے!"

"آخر کیوں؟"

"کچھ معلوم نہیں! ہو سکتا ہے اگلے سال تک کچھ سمجھ میں آ جائے
نہیں تو میں تمہارا جام صحت پیوں گا!"

"مگر ایک سال میں تو کہتے ہیں کمیونسٹوں کا حملہ ہو جائے گا!"

"کسے خبر ہے؟ ہو جائے اس سڑی ہوئی زندگی پر تو میں بموں کو
ترجیح دوں گا!"

"تو کیا تم بھی 'دلال' ہو؟"

"یہ بھی معلوم نہیں، آجکل تمہارا بن ڈنگھار سر لئے تو یقیناً نہیں تھا!"

"ہرگز نہیں! میں کونسٹرون کی پارٹی میں سے سیدھی آ رہی ہوں۔ یہ
پارٹی بقول تمہارے بالکل سڑی ہوئی تھی، جی اکتا گیا۔ تمہارا خیال کمیونسٹ
صناعت کے بارے میں کیا ہے؟"

"بھی وہ بھر ہو جاتی ہے! کہا نہیں یہ زندگی جڑ سمیت سڑ چکی
ہے! تم نے ابھی کہا کہ سال بھر میں حملہ ہو جائے گا۔ حملہ ہوا تو بم ضرور
برسیں گے۔ اور بم برسنے والے ہیں تو میں اپنی جان کیوں ہلکان
کروں!"

"جانتے ہو آج میں تمہارے پاس کیوں آئی؟"

"قیاس ہی کر سکتا ہوں، مگر میں جنٹلمین ہوں، ایک بوتل جن
چڑھا لینے کے بعد بھی!"

"سراسر غلط! دو گھنٹے پہلے میں گلے میں پھندا ڈال کر مر جانا چاہتی
تھی۔ تمہارا قول بالکل سچ ہے کہ اس زندگی کی ہر چیز سے سڑاہند آتی
ہے! اسی سیپی میں میں ایک حبشی کو چاہنے لگی تھی وہ ایک سنگدست
نقاش تھا۔ تم سے بہتر تھا! میں نے اسے اپنے گھر مجبور کر کے بلایا تو وہ
دیکھ لیا گیا، اور گرفتار کر کے جیل پہونچا دیا گیا، آخر اس نے جیل میں پھندا ڈالکر
جان دے دی اور پیچھا چھڑا لیا!"

صناع یہ سن کر خوب ہنسا۔

"اس نے کر کے دکھا دیا! اور تم سوچ سوچ کر ہی رہ گئیں! سچ سمجھو،
یہ زندگی سراسر سڑ چکی ہے۔ ہر چیز اور ہر بات سے جی اوب گیا ہے،
پڑوس میں ایک جوان عمر آدمی آ کر رہا ہے، ہر صبح مجھ سے کہتا ہے کہ
موسم خوشگوار ہے، میں جواب میں کہتا ہوں سڑا ہوا ہے! سال گزر نہ
جانے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ موسم ہی نہیں پوری زندگی سڑ گئی ہے،
بمباری کے بعد زندگی کی جو جو صورت ہوگی، بمباری سے پہلے بھی ویسی ہی
ہے! مجھے تمہارے اس حبشی پر رشک آ رہا ہے!"

صبح ہوتے میری گھر پلٹی تو اس کا دماغ ایک سادہ صفحہ تھا۔ اسے
محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بیمار تھی اور اب تندرست ہو گئی ہے۔ وہ سوچ

رہی تھی کہ یہ نقاشی پرا آدمی نہیں ہے، پر اسے پیرس کا ماحول درکار ہے مگر پیرس وہ نہیں جا رہا۔ میں جا رہی ہوں! اس زندگی کی تنظیم سچ مچ احمق احمقوں میں ہے!

(۱۶)

نیویارک کے میڈیسن اسکوائر میں ایک میٹنگ ہو رہی ہے اور حبشی تقریر کر رہا ہے:-

"جس وقت جنگ جاری تھی تو ہم حبشی اچھے امریکن کہے جاتے تھے، آج کوڑے مار مار کر ہمیں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ ہم ہر جگہ سے نکالے جاتے ہیں! ہم کالے رنگ کے ہیں اس لئے انسان نہیں ہیں اور اس لئے ہمارا کوئی حق بھی نہیں ہے! جیکسن جیل کے اندر ایک حبشی نے خود پھندا ڈال کر جان دے دی، اب تلاش اس بات کی ہے کہ اس کو رسی کس نے پہنچائی۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ اسے اس طرح جان دینے پر مجبور کس نے کیا؟"

سینیٹر نے تقریر کی ہے کہ ہمیں آزادی برقرار رکھنے کے لئے جنگ کرنا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ غلامی اگر امریکا میں نہیں ہے تو اور کہاں ہے؟"

مزدستی کمار شاد

غزل

زندگی کب ہے سازگار ہمیں — پھر بھی کمبخت سے ہے پیار ہمیں
اے سیہ بختی نصیباں توبہ — دن کو ہے دن کا انتظار ہمیں
ہم امیدِ بہار رکھتے لیکن — رو پڑی دیکھ کر بہار ہمیں
اپنے اشکوں کو پی رہے ہیں مگر — لوگ کہتے ہیں بادہ خوار ہمیں
تجھ سے چھٹ کر بہت ملول ہیں ہم — اے غمِ زندگی! پکار ہمیں
اپنی رعنائیوں کے پردے میں — ڈھونڈ لے اے نگاہِ یار ہمیں
مے نہیں ہے تو زہر لا ساقی! — اب نہیں یہ بھی ناگوار ہمیں
آج تک وہ نظر نہیں بھولی — تم نے دیکھا تھا ایکبار ہمیں

شادمانی بھی سوگوار سی ہے
دیکھ کر شاد سوگوار ہمیں

ڈاکٹر کالی داس ناگ
انگریزی سے ترجمہ

شام اور لبنان

ایران میں اپنے امور لازمہ کی تکمیل کے بعد ہمیں ایران سے دوسری جگہ جانا تھا۔ اور سفر کے لئے ہمارے سامنے دو متبادل راستے تھے۔ پہلا راستہ بیروت اور شامی ریگستانوں سے ہوتے ہوئے قاہرہ جاتا تھا۔ کہ اسی راستے سے ہمارے رفقاء کار شہزادہ یوسف مرزا اور مسٹری پربیش مسہا گئے۔ دوسرا راستہ ترکی اور ایشیائی یونان سے ہوتے ہوئے مصر جاتا تھا۔ اور اس راستے کو تار دس اکسپرس کے ذریعہ طے کیا جاتا تھا۔ میں نے اسی راہ سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن راستے میں کئی عربوں کے تاریخی اور ثقافتی مراکز میں میں نے قیام کیا۔ انہی تاریخی مقاموں کی سیر کرتے وقت ماضی کی ایک عظیم قوم اور اس کی لچکیلی اور دلکش زبان یاد آگئی۔ جو پاکستان، عراق، شام، شرق اردن، مصر اور شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس وقت شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری کا لہر دوڑ رہی ہے اور خصوصاً مراکش، الجیریا (الجزائر) اور تیونس کے عرب مسلمان بیدار ہو چکے ہیں اور عرب لیگ سے درخواست کی ہے کہ شاہ مراکش کو اسلام کا خلیفہ بنانے میں مدد دے۔ فرانسیسی حکومت اپنے مقبوضات کے عرب مسلمانوں کے اس جوش، تڑپ اور امنگ کو دیکھ کر سراسیمہ سی ہو گئی ہے۔

فرانسیسی حکام تو بوکھلا سے گئے ہیں اور تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے ظاہر ان کا چہرہ دستیوں پر تلے ہوئے ہیں۔

مگر وقت اور حالات کے تجزیے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ میں اسلام یورپین نوآبادیاتی طاقتوں کے لئے ایک زبردست مسئلہ بن جائیگا کیونکہ عرب لیگ کے جاندار اور ہوشمند جنرل سکریٹری عظام پاشا کی قیادت میں عربی بولنے والی اور مشرق وسطیٰ کی دیگر قومیں نوآبادیاتی نظام کو فنا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں مشہور عربی اخبار "الاہرام" کی اشاعت سب سے زیادہ ہے چنانچہ ہماری جمہوریہ ہند کو مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک کے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار رشتہ قائم کرنے کے لئے مشہور اور معیاری عربی جریدوں کے لئے عربی میں لکھے ہوئے مضمون اور تحقیقی مواد دینا چاہیے۔ مشرق وسطیٰ کے بہت سارے اخبار نویسوں اور مدیروں سے میں نے ملاقاتیں کیں اور ان سبھوں نے شکایت کی کہ ہندوستان سے سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری کتابیں پرچے اخبار اور رسالے نہیں آتے۔ جن کے باعث ان کو ہندوستان کے صحیح حالات سے واقفیت نہیں ہو سکتی ہے، جہاں کہیں بھی میں گیا۔ اور جہاں جہاں سابقہ مشترکہ لیکن اب الگ الگ ممالک۔ شام اور لبنان کے لیڈروں اور مدیروں سے ملا۔ مجھے ان کی بات چیت سے یہ احساس ہوا کہ مقام مدبر اور رہنما ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی کروٹ اور نئے سیاسی حالات سے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بیقرار اور بے تاب ہیں۔

جمہوریہ شام

جمہوریہ شام کے شمالی جانب ترکی ہے۔ مشرقی سمت عراق ہے۔ جنوب کی جانب اردن اور اسرائیل کے علاقے ہیں اور اس کی مغربی جانب جمہوریہ لبنان اور بحیرۂ روم ہے۔ شام کا کل رقبہ ۷۲ ہزار ۶ سو مربع میل ہے۔ شام کے شمالی مشرقی علاقوں سے دریائے فرات بہتا ہوا عراق میں داخل ہوتا ہے۔ شام گو بحری علاقہ ہے اور گرچہ اس کے علاقے سے تیل کی پائپ لائنیں گزرتی ہیں تاہم شام میں سوائے لتاکیہ کے کوئی اور عمدہ اور ترقی یافتہ بندرگاہ نہیں ہے۔

اس لئے کاروبار کرنے کے لئے شامی بیوپاریوں کو متصل ریاست لبنان کی دو مشہور اور بڑی بندرگاہوں ـــ بیروت اور طرابلس ـــ سے تجارت کا سلسلہ قائم رکھنا ہوتا ہے اور انہی دو بندرگاہوں سے مال بھیجے جاتے ہیں اور منگوائے جاتے ہیں لبنان ایک چھوٹی جمہوریہ ہے، اور اس کا کل رقبہ تقریباً ۴ ہزار مربع میل ہے یہیں سے ماروتیز ندی کو عبور کیا اور یہ ندی لبنان سے شمال کی طرف مڑ جاتی ہے اور پھر پیچ در پیچ راستوں سے گزرتی ہوئی تاریخی شہر انطاکیہ میں داخل ہوتی ہے اس تاریخی شہر کے متعلق ہمیں اشوک کے کتبوں سے بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں اور ابتدائی عیسائی تاریخوں میں بھی اس شہر کا ذکر بار بار آیا ہے۔ طرابلس کی بندرگاہ کو بہت زیادہ اہمیت اس لئے بھی حاصل ہے کہ عراق کے تیل کے کنوئیں سے پائپ لائن اس بندرگاہ تک گئی ہے۔ ان میں بیروت سب سے عمدہ اور خوبصورت بندرگاہ ہے جہاں سے میل، اسٹیمر اور بڑے جہاز بڑے ضابطہ اور قاعدگی کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں مغربی دنیا کی اجناس اور ضروری اشیا اس بندرگاہ سے بھیجی جاتی ہیں۔ عراق کے علاوہ ایران اور اندرونی ایشیا کے دیگر چھوٹے ملکوں کو اس بندرگاہ سے مغربی اشیا سپلائی کی جاتی ہیں۔

شام اور لبنان بہت قدیم باشندے کی پرانی تہذیب و ثقافت کے مرکز ہیں۔ لیکن کتنی بدقسمتی ہے کہ ان کی عظیم تہذیب اور ثقافتی زندگی کی معمولی سی یاد باقی نہیں رہی ہے۔ دونوں نہایت مہذب ممالک ہیں جو سلطنت روم کے "خزائن" شمار کئے جاتے تھے۔ اور ان کو دنیا میں بہت زیادہ شہرت نصیب ہوئی تھی اور اب دونوں حکومتیں ارتقائی منزلیں طے کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں نیا نظام تشکیل کرنا چاہتی ہیں اور آبپاشی کے لئے نئے طریقے رائج کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ان کی انتھک جانفشانی اور پرخلوص مساعی کے باوجود مالی مشکلات" ان کی ترقی کی منزل کی جانب جاتی ہوئی راہ پر پہاڑ کی وزنی، طویل چٹانوں کی شکل میں آ کھڑی ہوتی ہیں اور مسافت بڑی مشکل کٹھنائی اور دشواری سے طے ہوتی ہے۔

صدیوں سے بردہ اور اوارج ندیوں کے پانی سے نخلستان دمشق کو سیراب کیا جاتا رہا ہے اور اس دلکش اور حسین نخلستان سے عربی ادب میں کتنی خوبصورت کہانیوں اور دلکش افسانوں کا تانا بانا گیا ہے شام کی کل آبادی ۳۰ لاکھ ۱۲ ہزار ہے اور ان میں سے ۱ لاکھ خانہ بدوش بدو ہیں۔ اور لبنان کی کل آبادی گیارہ لاکھ ۸۶ ہزار ہے دونوں جمہوری ریاستوں کے باشندوں کی اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے، لبنان میں بہرحال بیرونی عیسائی کی اکثریت ہے (پوری آبادی ۳ لاکھ ۲۷ ہزار ۴۳۷ ہے) اور جمہوریہ لبنان کا صدر ایک روشن خیال عیسائی ہے جن کی قدر اور احترام تمام فرقے کرتے ہیں۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی سیاہی ان سے یکساں طور پر ان کو عزیز رکھتے ہیں۔

ان دونوں ریاستوں میں ہم نے عرب کی تحریک آزادی کا جذبہ اور رجحان پایا۔ یہ دو ریاستیں اپنے آپ کو عربی تہذیب کے سانچہ میں ڈھال لینا چاہتی ہیں اور عراق کے ساتھ وفاقی نظام قائم کرنے کی حمایت میں ہیں۔

شام میں اس جماعت کا نام انجمن احیاء عرب ہے اور لبنان میں عرب قوم پرور جماعت کہلاتی ہے، شام کی حزب مخالف کا نام پیپلس پارٹی (جمعیۃ عوام) ہے، یہ جماعت ۱۹۴۶ء میں قائم ہوئی اور اس کے قائد رشدی تھے۔

لبنان کی دستوری پارٹی کے لیڈر صدر جمہوریہ لبنان شیخ بعرہ
…ری ہیں کچھ دنوں قبل دونوں ممالک — لبنان اور شام - فرانس
زیر حکومت تھے، اس لئے فطرتاً ان کے قوانین وضوابط فرانس
…ڈمر سے پر ترتیب دیئے گئے ہیں اس جگہ "غیر ملکیوں" سے خط و
…بت کرنے یا تبادلۂ خیال کرنے کی زبان انگریزی نہیں بلکہ اب
…فرانسیسی زبان ہے ۱۹۴۶ء میں شام میں آزادی کی لہر تیز ہو گئی۔
…شام خالی کر کے چلے جاؤ" کے نعرے شام کی گلی گلی گونجنے لگے۔ اس
…نیں ہندستان میں آزادی کی تحریک شدت پکڑ چکی تھی اور یہاں
…" ہندستان چھوڑ دو" کے نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔
…سیوں نے شام کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نشوونما اور ارتقا
…طرف دھیان نہیں دیا۔ بلکہ لبنان میں فرانسیسی اسکولوں کی ترقی
…لئے مالی امداد دینا شروع کی۔ کیونکہ یہ اسکولی حکام فرانس کے
…خیالی تھے اور ان سے اندرونی رکاوٹوں اور مشکلوں کے ہٹانے
…کافی مدد ملتی تھی۔ لیکن اتنی بات ضروری ہے کہ فرانسیسیوں
…ہاتھ شام میں آثار قدیمہ کی چند بہت ہی اہم دریافتیں ہوئیں۔
…سے شام کی صدیوں قبل کی تہذیب، تمدن اور تاریخی اور ثقافتی
…گی پر روشنی پڑتی ہے اور اس روشنی میں ہم ماضی کی قدیم سماجی
…ثقافتی زندگی کے خد و خال دیکھ سکتے ہیں گو یہ خد و خال ہمیں
…دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں۔ بیروت اور دمشق کے عجائب
…روں میں بہت ہی قیمتی اور نادر نمونے ہیں اور فرانسیسی مورخین اور
…رین بطلے ملک زینوبیا کے نخلستان کی تاریخ پر تفصیلی کتاب لکھی ہے
…اس ملکہ نے ۲۷۳ء میں مصر کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا
…تھا۔

سر فلنڈرس پیٹری (۱۸۵۳ - ۱۹۴۲ء) شام اور فلسطین کو زمانۂ
…یم کے تہذیبی گہوارہ تصور کرتے ہیں، اور تہذیب اور ثقافتی گہوارہ
…بی شاہراہ پر واقع ہے جو مغرب اور مشرق کو ملاتی ہے اور اس راستے
…مغرب اور مشرقی دنیا کے درمیان تجارت کا سلسلہ قائم ہے حضو نہ

اور تل حلف میں پرانی تہذیب کے کئی نشان اور نمونے ملتے ہیں
جن سے پتہ چلتا ہے کہ عراق، ترکی اور شام کی سرحد سے متصل علاقے
قیمتی اور عمدہ تہذیب کے گہوارہ رہ چکے ہیں، اور شاید ان علاقوں
میں تہذیب اپنی کئی ارتقائی منزلیں طے کر چکی تھی اور اس علاقے
کی قدیم لیکن خوبصورت اور دلکش تہذیب کے جلتے ہوئے
چراغ سے دنیا کے دوسرے علاقوں نے اپنی تہذیب کے چراغ
جلائے تھے، بیتیں کے دور وسطیٰ میں جس کا ذکر "توراۃ کے عہد"
سے ملتا ہے (۳۰۰۰ - ۲۰۰۰ قبل مسیح) عبرانی قوم کے پیشوا ابراہیم
اور ان کے خاندان عراق سے ہجرت کر کے فلسطین آیا اور اس کے بعد
اسرائیلی پیغمبر یعقوب علیہ السلام نے مصر میں پناہ لی، لیکن میں جہاں
کہیں بھی گیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اب یہودیوں اور عربوں کی قدیم
ثقافتی اور تہذیبی معاشرت کی رمق باقی نہیں ہے اور ان کی سماجی
اور ثقافتی زندگی میں زبردست انقلاب آ گیا ہے اور ان کی ہم آہنگی
اور مطابقت ختم ہو چکی ہے اب یہ دونوں قومیں کچھ ایسی جداگانہ
طریقہ اور ڈھنگ سے زندگی گزارنے لگی ہیں کہ یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا
کہ صدیوں قبل ان کی یکساں تہذیب، یکساں ثقافت اور یکساں
معاشرتی و سماجی زندگی تھی۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں دستور ساز مجلس کا انتخاب عمل میں آیا
اور دستور ساز مجلس نے ۱۹۳۰ء کے فرانسیسی ساختہ دستور کو
ختم کر دیا۔ اور نیا دستور مرتب کرنے لگی۔ اور اسی دستور کے مطابق
شام میں تعلیم براہ راست حکومت کا کنٹرول ہے مجلس کی تاریخی میٹنگ
کے ایک سال بعد میں شام گیا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر لازوال خوشی ہوئی
کہ نئی جمہوریہ کے تمام شہری۔ خواتین و مرد۔ تعلیم کی ترویج اشاعت
اور مقبول بنانے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں۔ اور ان کی بے
لوث کاوشوں اور انتھک جانفشانیوں کے باعث شام میں ثقافتی
اور ٹیکنیکی تعلیم تیزی سے پھیل رہی ہے۔ سرکاری اسکولوں میں ابتدائی
تعلیم مفت دی جاتی ہے اور سات سال کی عمر کے لئے یہ لازمی قرار

دی گئی ہے۔ اور جب کوئی لڑکا اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے تو اس کے لئے اس کے ماں باپ اور گارجین کو بھی سزا دی جاسکتی ہے، مرد اور عورتوں کے لئے ٹریننگ کالج کھولے گئے جہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم دی جاتی ہے، یونیورسٹی کے دس فی صدی طلبا وظیفہ پاتے ہیں اور فلسطین کے مہاجر عرب طلبا کی سہولت کے لئے انہیں یہاں مفت داخل کر لیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دمشق میں ایک سرکاری یونیورسٹی قائم ہوئی تھی اور صاحب فاضل اور مشاہیرۂ ادب عصر ڈاکٹر قسطنطنیہ زارق کی رہنمائی اور رہبری میں اس یونیورسٹی کی از سر نو تنظیم ہو رہی ہے یونیورسٹی کی کلاسیں اور لیبارٹریاں بے حد عمدہ اور منظم ہیں اور دمشق کے تاریخی مقام پر یونیورسٹی قائم ہے، اس کی ایک طرف قدیم خوبصورت مسجد ہے جسکو ترکی کے ایک عظیم معمار سنان نے تعمیر کیا تھا اور اس کی دوسری جانب قومی میوزیم ہے، مختلف مضامین میں یونیورسٹی آنرز ڈگری عطا کرتی ہے اور وہ طلبا جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ریسرچ کرتے ہیں اس وقت یونیورسٹی میں پانچ شعبے ہیں شعبہ علم دفن، شعبہ قانون، شعبہ ادویات، سائنس اور انجنیئرنگ وغیرہ۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں دمشق میں قومی لائبریری تعمیر ہوئی تھی، اس لائبریری میں پچاس ہزار عمدہ کتابیں ہیں اور دس ہزار بے حد نادر قلمی نسخے ہیں۔ دمشق کی عرب اکیڈمی (قائم شدہ سنہ ۱۹۱۹ء) میں چالیس ہزار کتابیں اور تین ہزار بیش بہا قلمی نسخے ہیں۔

بیروت، دمشق، الفو کے نوجوان ادیب، شاعر اور اخبار نویسوں سے میں ملا۔ مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ وہ ہندوستان کی ترقیات کے نقش قدم پر چل کر اپنی شاہراہ ترقی کو طے کرنا چاہتے ہیں جب ہم طہران میں تھے تو ہمیں ہندوستانی کلاکاروں کے نمونے کی نمائش کا الفو میں انتظام کرنے کی دعوت ملی تھی۔ لیکن میرے دوسرے ساتھی دوسرے راستے سے چلے گئے تھے اس لئے اس کا انتظام نہ ہو سکا۔ میں بغداد سے روانہ ہوا۔ شمالی عراق کے "آثار قدیمہ" کا جائزہ لیا بعد پھر تارڈس ایکسپرس سے ذریعہ الفو چلا آیا۔ یہ مقام عرب اور عیسائی کلچرل تاریخ میں یکساں طور پر مشہور ہے الفو سے میں اطو کیہ گیا۔ ۳۰۰ قبل مسیح میں اس شہر کو سکندر اعظم کے جرنیل سلیوکس نے بسایا تھا) تارسوس، عدن اور انقرہ گیا اسپو سے میں بآسانی لبنان کی قلمرو میں جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں مشہور تاریخی مقامات حمص اور حماۃ کو پار کرنا ہوتا تھا۔ حماۃ عرب کے ایک عظیم ترین شاعر کی جائے پیدائش ہے الفو ایک شاندار اور ترقی یافتہ شہر ہے جس کی کل آبادی ۳ لاکھ ۳۷ ہزار سات سو ہے، یہ شام کی قومی لائبریری کا دوسرا مرکز ہے اور امریکیوں کے زیر اہتمام یہاں ایک ٹیکنیکل کالج بھی چل رہا ہے جہاں عرب نوجوانوں کے خیالات اور نظریہ میں وسعت اور ہمہ گیریت پیدا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

شری سبھاش چندر بوس بحالت بیماری کانگریس کی صدارت کے لئے جا رہے ہیں
روزنامہ ہند کے ڈائریکٹر اُن کے ہمراہ کلکتہ سے تری پورہ تک گئے۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پہلی آمد پر وزیر حکومت بنگال ڈاکٹر آر۔ احمد کی سرکردگی میں
مسلمانان کلکتہ کا گورنمنٹ ہاؤس میں ایک ڈیپوٹیشن "جس میں روزنامہ ہند کے
ڈائریکٹر اور ایڈیٹر بھی شامل تھے۔

روزانہ ہند کے اسٹاف

پنڈت کرشن پرشاد کول
صدر انجمن ترقی اردو ہند

صدارتی ایڈریس

(غیر مطبوعہ)

شعبۂ جدید افسانہ وناول

حیدرآباد ریاستی اردو کانفرنس سنہ ۱۹۵۴ء

افسانوی ادب کا شمار بھی مثل شاعری، موسیقی، نقاشی اور سنگ تراشی بھی فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے، ذوق حسن تمام فنون لطیفہ کا خمیر اور نفاست ولطافت جذبات ان کی جان ہے، باکمال حسن کار وہی ہوسکتا ہے جس نے شاعر کا دماغ اور عورت کا دل پایا ہو. شاعر یا ادیب کوئی ایسا حسین و پاکیزہ تخیل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ جس سے روشناس ہوکر چاہے تھوڑی سی دیر ہی کے لئے سہی اپنی سرشت کی ازلی حیوانیت کو بھول کر آدمی ہیں انسانیت کے قابل ہونے لگتے ہیں یا اگر وہ حسن وعشق کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ جاذب نظر ہوتی ہے اور ہم اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں. بلکہ ہمارے پیمان وفا. ایثار نفس - بے غرضی. سچائی اور پاکیزگی کے حسیات کچھ اس طرح اثر قبول کرتے ہیں کہ زندگی کا ہوش آنے لگتا ہے، یا اگر وہ مظلوم وبے کس کے دکھ درد کا بیان کرتا ہے تو ہمارے دل پر کچھ اس طرح سے چوٹ لگتی ہے کہ ہم تڑپ کر بے چین ہوجاتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے جوش کی کیفیت ہماری تمام تر قوت عمل کو متحرک کردیتی ہے اگر شاعر آزادی کا گیت گاتا ہے تو حب وطن کا جوش ہم میں ایسی بے خودی اور وارفتگی پیدا کردیتا ہے کہ ہم مٹ جانے کے لئے سر بکف ہوجاتے ہیں۔ غرضکہ اگر شاعر کی زبان اور ادیب کا قلم پر تاثیر اور جادو رکھتا ہے تو یہ اس کا کمال ہے اور جو شاعری اور افسانوی ادب ایسے ذوق حسن ونفاست جذبات کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے وہ یقیناً اعلیٰ پایہ کا ہے، درمیانی دور میں کچھ نسلیں ایسی گزری ہیں کہ موسیقی یعنی ناچ گانا بری صحبت کی وجہ سے بدنام ہوکر شرفا کے طبقے اور بھلے گھرانوں میں باعث ننگ وعار سمجھا جاتا تھا غنیمت ہے کہ وہ دور گزر گیا اور اب ہم آرٹ کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ لگانے لگے آج بھی بعض بزرگ افسانہ اور ناول پڑھنے کو محض تضیع اوقات اور فلم کو باعث تخریب سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عموماً فلم ہمارے یہاں آرٹ کے مرتبہ سے گر کر تجارت کی ہوسناکی میں مبتلا ہوگیا ہے مگر ان وجوہ سے خواہ موسیقی ہو۔ افسانوی ادب ہو یا فلم آرٹ کی قدروں پر آنچ نہیں آتی۔ اور نہ آنی چاہئے، جس طرح ورزشیں یوگہ کرپائیں۔ جمناسٹک یا اسپورٹس، انسانی جسم کے سڈول بنانے. جسمانی قوت میں اضافہ کرنے اور ہمیں صحیح اور تندرست رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یا ریاضی منطق وفلسفہ۔ سائنس کا مطالعہ ہمارے دماغی اور ذہنی نشوونما کے لئے لازمی وضروری ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ یعنی موسیقی، شاعری، اور افسانوی ادب بھی

ہمارے جذبات وجذبات کی نفاست ولطافت میں چار چاند لگاتا ہے۔ اس کا نظر انداز کرنا انسانی شخصیت کے نشو ونما کے توازن میں خلل انداز تھا اور ہم میں ایک بڑی کمی یا خامی پیدا کرتا ہے نہ صرف یہی کہ آج کا ذوق انسانی کیریکٹر اور شخصیت کے کھوٹے کھرے کے جانچنے میں کسوٹی کا کام دیتا ہے بلکہ دنیا کی قوموں کے تمدن اور کلچر کا پتہ اور اندازہ بھی اس کے ذوق حسن اور نفاست جذبات ہی سے بہت کچھ ہوتا ہے

میری آج کی بحث کا موضوع مختصر افسانہ اور ناول ہے۔ ہمارے پرانے زمانہ کے افسانوں اور موجودہ دور کے ناولوں میں ایک بین فرق تو یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر رومان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے، اور معیار پرستی کی دھن میں بسا اوقات زندگی کی حقیقتوں کا ان میں خون ہوتا تھا۔ موجودہ دور کے ناول حقیقت نگاری کا مرقع ہوتے ہیں اور زندگی کے حقائق کی ان سے عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ ناول کا لفظ ہماری زبان اور ادب میں انگریزی زبان سے مستعار ہوا ہے اور اب ہم نے اسے پورے طور پر اپنا لیا ہے ناول کے پڑھنے اور لکھنے کا شوق بھی انگریزی ادب کے مطالعہ سے ہم میں پیدا ہوتا ہے لازمی طور سے ہم اپنے یہاں کے ناولوں میں وہی رنگ ڈھنگ ڈھونڈتے ہیں اور انکو اس کسوٹی پر کسنا چاہتے ہیں کہ جو انگریزی یا فرنگی ادب کے ناولوں نے ہمارے دماغ میں رودح دیا ہے پڑھتے یا لکھتے وقت وہی معیار اور ٹیکنیک ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے جس کے ہم انگریزی یا فرنگی ناولوں کے اثر سے عادی ہو چکے ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہئے یورپ کی زبانوں اور ادب میں اعلیٰ پایہ کے ناول بالعموم دو قسم کے ہوتے ہیں اول یہ کہ جس میں روزمرہ کی انسانی زندگی کی نقاشی کی گئی ہو۔ سوسائٹی کے عیب اور خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ ان میں ہمیں ایسے ہی کرداروں اور واقعوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ جن سے ہم روزانہ ملتے جلتے رہتے ہیں یا جو ہمیں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے اعلیٰ پایہ کے ناول انگریزی میں "ڈکنس اور تھیکرے" کے قلم کے مرہون منت ہیں۔ "ڈیویڈ کوپر فیلڈ" "پکوک پیپرز" اور "وینیٹی فیر" کے ناموں سے کون انگریزی پڑھا لکھا شخص واقف نہ ہوگا مگر روزمرہ کی زندگی کی عکاسی نسبتاً آسان کام ہے دوسرے قسم کے ناول وہ ہیں جن میں غیر معمولی کردار پیش کئے گئے ہیں۔ اور معیاری یا ٹیپکل کیریکٹر کا تدریجی ارتقا یا نشو ونما دکھایا گیا ہے ان کی بہترین مثالیں ٹھامس ہارڈی، جارج ایلیٹ، ٹالسٹائے وکٹر ہیوگو اور رومن رولاں کے شاہکاروں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس قسم کے ناول لکھنا مشکل کام ہے جس کے لئے افسانہ نگار کو بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ بڑے سے بڑے فنکاروں کا قلم بھی رک رک کر چلتا ہے دنیا کے افسانوی ادب کے تصویر خانہ میں ایسی تصویریں کہ جن سے حسن اخلاق ومعراج انسانیت کے رموز کی بدرجہ کمال عقدہ کشائی ہوتی ہو خالی ہی خالی نظر آئیں گی۔ آسمان سے تارے توڑ لانے کی سعادت صرف چند ہی باکمال ہستیوں کو نصیب ہوئی ہے، جارج ایلیٹ کی آدم بید ٹھامس ہارڈی کا، اور میئر آف کسٹر برج۔ ٹالسٹائے کا ڈیفرکشن اور وکٹر ہیوگو کا لے مزرابیل اور اور رومین رولاں کا جین کرسٹافر ایسے شاہکار ہیں کہ جو یورپ میں بھی باوصف اس کے کہ وہاں سینکڑوں ناول ہر سال ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور دو چار نسلوں میں دو ہی چار لکھے جاتے ہیں لے مزرابیل میں زبان وہاں زبان کا زندہ جاوید کردار میری رائے ناچیز میں افسانہ نگاری کا ایسا کمال ہے کہ جس کی دوسری مثال دنیا کے افسانوی ادب میں ابھی تک کسی افسانہ نگار نے پیش نہیں کی ہے زبن کرسٹافر کے بارے میں اس فن کے مبصروں نے لکھا ہے کہ (۲۰) ئی صدی کا یہ تنہا شاہکار ہے کہ جس کے لکھنے میں رومین رولاں نے اپنی عمر کے کئی سال صرف کئے تھے، ظاہر ہے کہ ان عظیم الشان شاہکاروں اور ہمارے یہاں کے بہترین اردو ناولوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔

زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اردو میں رتن ناتھ سرشار ناول نگاری کے فن کے موجد تھے۔ افسانہ آزاد ان کا پہلا ناول تھا اور ان کا شاہکار بھی جو شرف قبول عام کا اس کو حاصل ہوا۔ اردو کے کسی دوسرے ناول کو میسر نہ آیا۔ افسانہ آزاد آج بھی اسی شوق و ولولے سے پڑھا جاتا ہے کہ جیسے تین نسل پیشتر سرشار نے ڈکنز اور تھیکرے کا اثر قبول کیا تھا۔ افسانہ آزاد کی چار جلدیں (۳۰۰۰) تین ہزار تین سو صفحوں پر مشتمل ہیں۔ اگر یہ ناول ایک جلد میں ہوتا تو ڈھنگ کی بات ہوتی۔ چنانچہ اس میں باوصف اپنی گوناگوں خوبیوں کے نقائص بھی ہیں، اس کا تفصیلی تذکرہ ممکن نہیں۔ بایں ہمہ سرشار نے اپنی جینئس نچوڑ کر اپنے اس شاہکار میں رکھ دی ہے۔ سرشار لکھنؤ کی پرانی سوسائٹی کی مصوری کے لئے پیدا ہوئے تھے اور اپنا خاص طرز ساتھ لے کر آئے تھے۔ شبہ نہیں کہ اس نقاشی کو انہوں نے اپنے طرز میں خوب ہی نبھایا ہے بلکہ اعجاز دکھا دکھایا ہے۔

فیض قدرت سے سرشار کو شاعر کا دماغ اور مصور کا قلم عطا ہوا تھا۔ شوخی و شرارت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ زندہ دلی سے انکی سرشت کا خمیر گندھا تھا۔ ظرافت ان کی رگ رگ اور پور پور میں کوٹ کر بھری تھی۔ اس سرچشمۂ حیات سے زندہ دلی اس طرح ابل ابل کر بہی کہ اس کے قہقہوں سے ادب کی فضا گونج اٹھی زندگی ہر سمت سے کھل کھلاتی نظر آنے لگی۔ شوخی اور ظرافت کے اس سیلاب کی باڑھ سے سنجیدہ ثقاہت و متانت کی بند اور حدیں ٹوٹ کر اور گر گر کر بہنے لگیں اور بہت کچھ کوڑا کرکٹ بھی سطح آب پر آگیا لیکن اردو ادب میں طنز و ظرافت کا ایک نیا طرز ابھر آیا اس پنچاینہ رنگ کے مالک سرشار تھے، مرزا سجاد حسین اور اودھ پنچ نے اسے فروغ دیا، اور اودھ پنچ کے نورتنوں میں مرزا سجاد حسین مچھو بیگ ستم ظریف، نوبھون ناتھ ہیں، اکبر حسین اکبر۔ جوالا پرشاد برق اور نواب محمد آزاد نے اپنے زمانہ اور اپنے طرز میں نام پیدا کیا

رتن ناتھ سرشار ان سب کے سرتاج تھے، سرشار نے ہمارے ادب کے چمنستان ظرافت میں ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ جو ایک زمانہ گزر جانے پر بھی نہ آج تک کملائے ہیں نہ مرجھائے ہیں۔ جب چاہیے ہاتھ سے چن اور سونگھ کر ان کی مہک سے دماغ تر و تازہ اور معطر کر لیجئے، جب ایسے شاعرانہ دماغ اور چنچل طبیعت کے ہاتھوں میں مصور کا قلم ہو تو کیا کیا معجزے دیکھنے میں نہ آئیں گے، سرشار نے اپنے زمانہ کی لکھنؤ کی سوسائٹی کی نقاشی کی ہے انکا کینوس نہایت وسیع ہے زندگی کا کوئی پہلو بھی نظر سے چوکا نہیں ہے ان کے اس کشادہ اسٹیج پر قسم قسم کے ایکٹر اپنا اپنا پارٹ کرتے نظر آتے ہیں طرح طرح کے کھلاڑی اپنے اپنے کرتب دکھلاتے ہیں۔ ہر تصویر جو سامنے آئی ہے جیتی جاگتی، بولتی چالتی، چلتی پھرتی اور ہنستی کھیلتی ہوئی غرضکہ زندگی سے بھرپور ہے ایسی تصویریں بھی ہیں کہ جن سے پھوہڑپن اور پھکڑپن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے لیکن زندگی ثقاہت اور متانت کی تو نہیں ہوتی اور مصور اس کی نقش کشی تو کرے گا جو اسے دکھائی دیتا ہے چونکہ ان کی تصویریں سچی ہیں بھلی اور پیاری معلوم ہوتی ہیں۔

افسانوی ادب کے تذکرے میں دو اور ناول نگاروں کے نام نامی ایسے ہیں جن کا کافی چرچا اور شہرہ ہوا۔ ایک مرزا محمد ہادی رسوا اور دوسرے مولانا عبدالحلیم شرر۔ مرزا رسوا کا رنگ اس معنی میں سرشار سے ملتا جلتا ہے کہ انہوں نے بھی پرانے زمانہ کے لکھنؤ کی صحبتوں کی عکاسی کی ہے، ان کے قلم سے کئی ناول تصنیف ہوئے لیکن امراؤ جان ادا ان کا شاہکار ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اردو ادب کے تاج میں کوہ نور کی طرح ہمیشہ چمکے گا۔ میری رائے میں امراؤ جان ادا نہ صرف اردو ادب کا کوہ نور ہے بلکہ ہمارے تمام افسانوی ادب میں بہترین ناول ہے میں اسکو افسانۂ آزاد پر اس لئے ترجیح دیتا ہوں کہ اس کے مذاق کا سے پھر سے مذاق کو مناسبت ہے، فسانۂ آزاد کا مذاق اکثر پھکڑپن پر آ جاتا ہے جو سنجیدہ طبقوں پر گراں گزرتا ہے، ماسوا فسانۂ آزاد کی گوناگوں خوبیوں کے ساتھ اس میں فروعات و حشویات کی بھی بہتات ہے اور

امراؤجان ادا میں نکتہ چینی کرنے کے لئے مبصر کو عینک لگانے کی ضرورت ہوگی، غرض کہ امراؤجان مرصع کار کا کام ہے اور مجسم آرٹ، شرر کا موضوع اس سے بالکل الگ مختلف ہے، انہوں نے اسلامی تاریخی ناول لکھے ہیں اور "اسکاٹ" کی تتبع کی ہے، انکا اسلوب تحریر ناول کے لئے موزوں ہے لیکن جس دور اور جس سوسائٹی کی انہوں نے نقاشی کی ہے اس سے کوسوں دور ہے اس لئے ان کی تصویریں اصلیت سے بہت دور اور پھیکی ہیں، ناول کی تاریخ اور تنقید کے مصنف نے شرر پر جو فیصلہ صادر کیا ہے نقل کیا جاتا ہے۔

"آپ چاہئے کہ ہمیں ان پر رستم اور سہراب کہیں، لندھور سعدان و مالک بن اژدر کا کہیں شہزادگان ارج و تورج کا شک ہو تو کیا جائے۔ تعجب ہے سحر کا نام نہیں آتا، طلسم کا ذکر نہیں، خلاف فطرت انسانی امور کا بیان مقصود نہیں لیکن ہیرو کے معرکہ بالکل ویسے ہی ہیں کہ جیسے بوستان خیال یا داستان امیر حمزہ کی زینت ہیں پھر بیان کرنے کا ڈھنگ بھی ایسا ہے کہ بات حلق سے اترتی نہیں لیکن وہ لوگ جو شاہنامہ میں رستم کے کارنامے پڑھ چکے تھے جنہوں نے بچپنے سے افیونیوں کی زبانی داستانیں سنی تھیں وہ مولانا کی تیسرے درجہ کی تصنیفات پر محض اس لئے ایمان لائے تھے کہ کلمہ پڑھتے ہی کمزور سے کمزور انسان بھی دس کافروں پر بھاری ہو جاتا ہے، غرض کہ مولانا کے نام نہاد تاریخی ناولوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاہلوں کے سے اعتقاد کی ضرورت ہے۔" مجھے اس فیصلہ سے قطعی اتفاق ہے، ہمارے بعض تنقید نگاروں نے خاص کر مولانا نذیر احمد کو بھی ناول نگاروں میں شامل کیا ہے بلکہ اولیت کا سہرا ان کے سر باندھا ہے مجھے اس رائے سے اختلاف ہے ڈاکٹر نذیر احمد عربی و فارسی کے عالم متبحر تھے اور اپنے زمانہ کے اردو نثر لکھنے والوں میں ممتاز ان کی کہانیاں مثلاً مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت پند و نصائح کا ذخیرہ ہیں اور نوجوان طلبا کے لئے بڑی کارآمد، مسلمان گھرانوں کی تہذیب و معاشرت اور ان کی بول چال کا بہت اچھا چربہ اتارا ہے ان کا طرز بیان نہایت سلیس اور زبان نوک تک ٹکسالی روزمرہ ہے، مگر ان کی یہ کہانیاں ناول نہیں، ناول کا شمار فنون لطیفہ میں ہے اور ہدایت اور آرٹ میں جنم کا بیر ہے۔

یہ تو انیسویں صدی کے آخر نصف کا تذکرہ تھا اب بیسویں صدی کو لیجئے اس دور میں پریم چند کی افسانہ نگاری کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اور موجودہ نسل پر ترقی پسند ادیبوں کی افسانہ نگاری چھائی ہوئی ہے میں پہلے کچھ پریم چند کے بارے میں کہوں گا اور پھر ترقی پسند ادیبوں کے متعلق پریم چند پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے مختصر افسانہ کو اردو اور ہندی میں رواج دیا اور اس فن کو ایسے عروج پر پہونچایا کہ پوری ایک نسل گزرنے پر بھی اس کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اور کوئی ان سے سبقت نہ لے جا سکا لیکن بحیثیت ناول نگار ہونے کے انہیں جس قدر سراہا جاتا ہے وہ قصیدہ خوانی سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا حضرت طالب الہ آبادی نے پریم چند کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور اسکا تبصرہ بھی کسی قدر تفصیلی ہے بعض مقامات پر ان کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے لیکن اس کمی کو ایسی تعریف سے پورا کر دیا ہے کہ جو شائستہ تنقید کے بالکل خلاف ہے۔ فرماتے ہیں اگر پریم چند نے ساری عمر میں بھی (یعنی چوگان ہستی) ایک ناول لکھا ہوتا تب بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ ملتی برونٹی کی جسارت۔ ریل کی آزادی۔ ڈکنس کی غربت نگاری۔ کالزورری کا ساطنز یہ تبسم، ڈیوا کی نقشہ کشی، نظامی کی سادگی، نفیس کی عظمت شرر کا جوش۔ رسوا کی مغلوبیت اور ٹیگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس ناول کو پڑھئے اور حضرت فراق گورکھپوری نے تو اس عقیدت کی بنا پر کہ جو ان کو پریم چند مرحوم سے تھی ایسی قصیدہ خوانی کی ہے کہ پریم چند کے آگے سرشار کا تو ذکر ہی کیا سرت چندر چٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے فرماتے ہیں کہ ان کی عظمت ان کے ناولوں کے بعض ٹکڑوں سے ظاہر ہوتی ہے، غالباً ناول کی پیچیدگی، فنی دشواریاں مختلف حصوں کا مرکزی اتحاد۔ وحدت جو کامیاب ناول کے لئے ضروری ہے

اس کا مرکز کمال نہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اردو اور ہندی کے سب سے بڑے ناول نگار تھے۔

پریم چند کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے مختصر افسانہ نگاری کے فن کو اردو اور ہندی میں رائج کیا اور اسے ایسے عروج پر پہنچایا کہ آج بھی ان کا مدمقابل کوئی نہیں۔ اب تک ہمارے افسانہ نگاروں نے اعلیٰ طبقہ کے شرفاء اور شہری زندگی کی ترجمانی کی تھی۔

پریم چند نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور دیہاتی زندگی کی عکاسی کر کے ہمارے لٹریچر کو مالا مال کیا۔ ایسی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویریں دیہاتی زندگی کی ہمارے سامنے پیش کیں، کسان اور مزدور کے مصائب اور مظلومیت کی فریاد ہم تک اس طرح پہنچائی کہ طبیعتیں تڑپنے لگیں انہوں نے ایسے اسلوب تحریر کو رواج دیا کہ جو اردو اور ہندی دونوں میں نبھ سکے، جس ہندستانی زبان کے رائج کرنے کے لئے ہم آج پریشان ہیں لیکن ہم سے بن نہیں پڑتا انہوں نے اس کا راستہ دکھا دیا کسی ادیب یا مصنف کے لئے یہ کسب کمال کم نہیں بلکہ فخر کی بات ہے، اردو کے ادیبوں اور مصنفوں میں پریم چند کو صفِ اول میں جگہ ملے گی اور ان کا نام نسلاً بعد نسلاً قائم رہے گا تو پھر کیا ضرورت ہے، کون سی مجبوری ہے کہ ہم پریم چند کی ان خامیوں اور لغزشوں کو بھی سراہیں کہ جو یقیناً ان میں تھیں نامور ناقدین کی رایوں اور فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے اور اختلاف کی گنجائش ہے میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ پریم چند بحیثیت ناول نگار کے ناکامیاب رہے اور نہ ان کے ناول بجز ایک کے ایسے ہیں کہ ان کا شمار اعلیٰ پایہ کے ناولوں میں ہو سکے۔ البتہ ان کا ناول گئودان جس میں انہوں نے ہماری دیہاتی زندگی کا مکمل مرقع بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے اور جس کے کردار جیتے جاگتے ہیں، باوصف اپنی بعض خامیوں کے اعلیٰ پایہ کے ناولوں میں شمار کیا جائے گا اور اردو ادب میں ایک نیا تجربہ اور نیا اضافہ۔ ہمارے نئے ادب اور ترقی پسند ادیبوں میں سے اکثر کو تو نفسیاتی تجربہ اور مارکسٹ پروپیگنڈہ کا روگ لگا ہوا ہے

اس میں ادب بہت کم اور صحافت بہت زیادہ ہے۔ ہر سال سینکڑوں مختصر افسانے ان کے نام سے شائع ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ معدودے چند البتہ ایسے ہوتے ہیں جن کے افسانوی ادب کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور آرٹ کا پیکر ہوتے ہیں مگر سینکڑوں اور ہزاروں میں دس بیس کی کیا حقیقت۔ دو چار ناول بھی ترقی پسند ادیبوں کے قلم سے شائع ہوئے ایک عرصہ تک اس کا چرچا رہا اور رفیقوں نے خوب سراہا لیکن اب دبی زبان سے انہیں تشنہ اور پھسپھسا کہا جاتا ہے میری رائے میں ترقی پسند ادب نے ایک ہی شخصیت ایسی پیدا کی ہے کہ جو آرٹسٹ بھی ہے، اور مصنف بھی اور وہ ہے عصمت چغتائی، ان کے اکثر افسانے نہ صرف یہ کہ آرٹ کا پیکر ہوتے ہیں بلکہ بصیرت افروز بھی ہوتے ہیں بالخصوص ان کے ناول ٹیڑھی لکیر کا پہلا نصف حصہ کہ جس میں ایک لڑکی کا چربہ بڑے سلیقہ اور خوبصورتی سے اتارا گیا ہے اردو لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے ان کی ذات پر ناز بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی امیدیں بھی باندھی جا سکتی ہیں نیا ادب پچھلے بیس سال کی پیداوار ہے بقول شخصے کہ کے آمدی کے پیر شدی اگر اس نے اب تک کوئی پایہ کا ادیب پیدا نہیں کیا اس میں کوئی زندہ جاوید شاہکار نظر نہیں آتا تو نہ یہ کوئی شکایت کی بات ہے نہ ملامت اور نکتہ چینی کی۔ پایہ کے ادیب آئے دن پیدا نہیں ہوتے۔ ادب کے زندہ جاوید شاہکار ہتھیلی پر سرسوں جما کر نہیں گڑھے جا سکتے! غالباً وہ زمانہ آئیگا جب نئے ادب میں پرانے ادب کی طرح پایہ کے ادیب پیدا ہوں گے اور زندہ جاوید شاہکار بھی لکھے جائیں گے شکایت ہے تو اس بات کا کہ آپ ایسا ماحول پیدا کر رہے ہیں کہ جس میں کسی پایہ کے ادیب کا پیدا ہونا اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا ہے نئے ادب کے نقادوں کی نگاہ میں ہر طفل مکتب جو اسکول یا کالج چھوڑے ہوئے دو تین برس ہوئے ہوں اور جس نے دو چار مختصر افسانے لکھ لئے ہوں ادیب ہے ہونہار ادیب ہے اور پایہ کا ادیب ہے اور جہاں تک شاہکاروں اور شہ پاروں کا تعلق ہے وہ تو نئے ادب کے ذخیرے میں بکھرے پڑے ہیں تنقید نہیں کی جاتی مدح سرائی کی جاتی ہے ہر کس و ناکس کو آسمان پر چڑھایا جاتا ہے۔

نریش کمار شاد

قاشیں

شوق کی بے بسی نہیں جاتی
دل کی بیچارگی نہیں جاتی
آپ کو دیکھنا بھی مشکل ہے
آنکھ بھی بند کی نہیں جاتی

ناامیدی دلِ پریشاں کی
آخری حد سے جب گزرتی ہے
زندگی کے نگار خانے میں
بے نیازی کا روپ بھرتی ہے

زیست کیا موت کے بھی سینے میں
دلِ پرنور بن کے دھڑکے گا
عشق وہ لازوال شعلہ ہے
جب بجھاؤ گے اور بھڑکے گا

مسکرانے کو مسکراتے ہیں
پھر بھی دل کی کلی نہیں کھلتی
زندگی کی کوئی خوشی ہم سے
بے تکلف کبھی نہیں ملتی

میکدوں کے بھی آس پاس رہی — گلرخوں سے بھی روشناس رہی
جانے کیا بات تھی کہ اس پر بھی — زندگی عمر بھر اداس رہی

تیرگی میں دیئے جلا دے گی — منزلِ زیست کا پتا دے گی
جب بھٹکنے لگیں گے دیوانے — موت خود راستہ دکھا دے گی

ذہن و دل میں اگر بصیرت ہو — تیرگی کیفِ نور دیتی ہے
زیست کی راہ میں ہر اک ٹھوکر — زندگی کا شعور دیتی ہے

زندگی کے شگفتہ گلشن میں — ہر تبسم ہے داغدارِ الم
جب نچوڑا ہے خندۂ گل کو — اس سے ٹپکا ہے گریۂ شبنم

بے حسی تو ہے موت سے بدتر — کچھ نہیں تو اداس ہو تو سہی
تیرا ہنسنا اگر نہیں ممکن — اے دلِ نامراد رو تو سہی

مطلقاً یا اثر نہیں ہوتی — کیف سے بہرہ ور نہیں ہوتی
جس میں ہلکا سا غم نہ شامل ہو — وہ خوشی معتبر نہیں ہوتی

دیویندر اسر

مندر

مندر کی تعمیر مکمل ہونے میں ہفتہ عشرہ باقی تھا اور اب باقی رہ بھی کیا گیا تھا۔ سوائے باہر کی دیوار کے جس میں آہنی دروازہ اور سلاخوں والا جنگلہ لگنا تھا۔ اینٹیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ جوگیا بھیگی ہوئی اینٹوں کے انبار سے اینٹ اٹھاتی اور اپنے بازو کی بھرپور قوت سے اوپر پھینک رہی تھی۔ پنچم اسے اُن کے گوسے کی طرح اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لیتا اور ایک طرف پھینک دیتا۔ بدریام سیمنٹ، ریت اور چونے کا مسالہ پلستر بھر بھر بانس کی کانپتی سیڑھیوں پر اوپر پہنچا رہا تھا۔ راموں پلستر تیار بھی کرتا جاتا تھا اور سپلائی بھی کر رہا تھا۔ دیوار کے درمیانی حصہ میں بھورا بلیاں باندھ رہا تھا۔ ابھی دیوار اوپر اٹھنی تھی۔ لیکن اس تمام ہڑبونگ سے بے نیاز شیاما چرن اینٹ پر اینٹ جمائے جا رہا تھا۔ تمام کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ لیکن شیاما چرن کے ہاتھوں میں مشین کی سی یکسانیت اور پھرتی تھی وہ اپنے ہاتھوں کو اتنی جلدی سے حرکت میں لا رہا تھا جیسے شام شروع ہونے سے پہلے ہی دیوار آسمان تک پہنچ جائے گی۔ چند دنوں سے کام میں مزید تیزی نظر آنے لگی۔ جنم اشٹمی کے تہوار میں سات آٹھ دن باقی تھے، جنم اشٹمی کے دن مندر کا افتتاح سیٹھ رام نارائن ٹین والے کو کرنا تھا۔ گو اس مندر میں پبلک نے بھی شردھا انوسار بھینٹ کی تھی لیکن سب سے زیادہ رقم سیٹھ رام نارائن ٹین والے نے دی تھی ورنہ مندر کبھی بھی تعمیر نہ ہوتا اور اس جگہ ایک ٹیلہ ہی رہتا جس کے ارد گرد ایک چٹیل میدان ہوتا جس میں گائے بھینس پیشاب اور گوبر جمع کرتی رہتیں اور جب شام کو دودھ دوہا جاتا تو تلنے کے لئے یہاں بیٹھ جاتیں۔ اس لئے اس مندر کا نام سیٹھ رام نارائن مندر رکھا گیا اور اس کی آدھار شیلا پر کندہ کیا گیا۔

"اوم" سیٹھ رام نارائن شام نارائن ٹین والے نے بھاگن شدی گیارہ - ۲۰۱۱ وکرمی اس مندر کی آدھار شیلا اپنے کر کملوں سے رکھی۔ ٹھیکیدار [illegible] وقت پر کام ختم کرنے کے لئے پچاس مزدور زیادہ لگا رہے تھے اور اس نسبت سے اپنی گالیوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔

"ارے او بڈھے کیا ٹانگوں میں کھیلا رہے ہو۔ جلدی لا پلستر" شیاما چرن نے تسلے میں کانڈی مارتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے، شور مچا رہے ہو" بھورا بلی سے تختہ باندھتے ہوئے بولا ــــ

"ارے بھورے، ذرا اب تو نظر سے، میری دیوار اب بھی سب سے اونچی ہے۔ اکیلا ہوں پھر بھی۔"

"ارے تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا مندر کے لئے اتنی اونچی دیوار کی کیا ضرورت ہے۔"

"مندر ہے بھگوان کا۔ قید خانہ تو نہیں۔" جوگیا نے بے دلی سے اینٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ وہ تو پنچم نے پکڑ لی ورنہ جوگیا کے سر پر پڑتی۔

"ابھی سر پر پڑتی تو سب معلوم ہو جاتا کہ مندر ہے کہ قید خانہ ہے" شیاما چرن نے اینٹ جماتے ہوئے کہا۔

"ارے مندر ہو کہ قید خانہ اپنا تو دھندا ہے ـــ" نیچے سے راموں کی آواز آئی

"ارے سارا تو بھورا کہتا ہے کہ اتنی اونچی دیوار کی کیا ضرورت ہے۔"

گدی ہے جڑا گدی کیا جانے اس میں سونے کی مورت ہو گی

"ہم جانتے ہیں سب کہنے کی باتیں ہیں۔ سونے کا پانی بھی مورت پر چڑھا دیں گے تو غنیمت جانو" بھورا نے کہا۔

"تم سب تو نرے گھاس کھانے والے ہو" شیاما چرن چلایا "چند روز میں بھگوان کا اصلی روپ نظر آجاوے گا" بھورا بولا سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"رادھے شیام کے مندر کا کلس بھی سونے کا تھا۔ ایک چوما سے کے بعد جو دھوپ نکلی سب چمک دمک غائب ہو گئی" بھورا بولا۔

شیاما چرن غصے میں آکر کام کو اور زیادہ تیزی اور رفتار سے کرنے لگا اس کے خیال میں کسی کے من میں بھگوان کے گردھ کا ڈر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ سب نرک کے بھوگی ہوں گے، اس کے ہاتھ اور تیزی سے حرکت کرنے لگے، وہ پیسے کے لئے تو کوئی مزدوری نہیں کر رہا تھا۔ اسے تو بس یہی خوشی تھی کہ بھگوان کا مندر بن رہا ہے اگر اس شبھ کام میں وہ ہاتھ بٹائے گا تو بھگوان کی پوجا بھی جا سکے گی۔

اس جگہ جہاں اب مندر کی تعمیر ہو رہی تھی ایک چٹیل میدان تھا اور اس میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ کئی سالوں سے لوگ اس ٹیلے کو دیکھتے آتے تھے اور کبھی نے اسے ایک ٹیلے سے زیادہ سمجھنے کی کوشش نہ کی پچھلے سال ایک لمبی لمبی جٹاؤں والے ایک سادھو نے آکر دھونی رما دی۔ اس ٹیلے میں کوئی رہسیہ ضرور چھپا ہوا ہے۔ ورنہ —— ابھی بات یہاں تک پہنچی تھی پھر لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ۔ میدان کے ساتھ والے مکان کے مالک نے بتایا کہ آدھی رات کے قریب اس ٹیلے سے بانسری بجنے کی آواز آتی ہے، ایسی مرلی آواز ہوتی ہے جیسے بھگوان کرشن خود بجا رہے ہوں۔ پھر شہر کے تمام سادھو سنتوں اور فقیروں کے نام گنوائے گئے جن کے نام سے یہ ٹیلہ منسوب کیا جانے لگا، سوامی اکھلانند لوگوں نے اس بات کو نہ مانا۔ کیونکہ سوامی اکھلانند تو ہمالیہ چلے گئے تھے، کہتے ہیں وہیں انہیں بھگوان کے درشن ہوئے تھے، اور انہیں لوکش پراپت ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ انہوں نے کبھ میلہ پر انہیں پریاگ راج میں دیکھا تھا۔ جو کچھ بھی ہو یہ ان کی سمادھ نہ تھی۔ کیوں کہ سمادھ کسی پرانے سادھو سنت کی ہی ہو سکتی ہے۔ پچاس سال پہلے کی بات ہو گی۔ بھائی آسا نند سنگھ پر لوگوں کا کچھ وشواس سا ہو چلا کہ یہ سمادھ بھائی آسا سنگھ کی ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ سادھو مہاراج کے گورو کی سمادھ ہو گی......

لیکن چند دنوں میں جب سادھو مہاراج نے آنکھیں کھولیں تو غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ یہ سمادھ نہ سوامی اکھلانند کی تھی نہ بھائی آسا سنگھ کی نہ سادھو مہاراج کے کسی گورو کی۔ ایک روز حسب معمول جب پو پھٹتے ہی شہر کے بھگت لوگ سادھو مہاراج کے درشن کرنے آئے تو انہیں ٹیلے پر بھگوان کی چھوٹی سی مورتی پڑی نظر آئی جو مورتی کے بجائے بچوں کا کھلونا زیادہ نظر آتی تھی، لوگ کچھ حیران ہوئے اور پھر شردھا سے ان کا ہردے گدگد کرنے لگا بھگت لوگوں کے ذہن میں جیسے دویہ پرکاش کیا کہ یہ مورتی ٹیلے کے نیچے دفن تھی سب لوگ اسے سادھو مہاراج کا چمتکار سمجھنے لگے انہیں معلوم ہوا کہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے، یہاں ایک مندر تھا، شہر میں ایک بار بھونچال آیا سارا شہر تباہ ہو گیا۔ مندر کی دیواریں بھی گر گئیں۔ جان و مال کا نقصان ہوا۔ لیکن یہ مورتی ثابت و سالم رہی اور زمین کے نیچے پوشیدہ ہو گئی۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین بھی اسی جگہ پھٹی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ لوگ پاپی اور بھرشٹ چاری ہو گئے تھے۔ بھگوان نے پاپ اور بھرشٹ چار کا ناش کرنے کے لئے سارے شہر کو تباہ کر دیا اس کے بعد کئی سادھو اس جگہ آئے لیکن ان کی بھگتی اتنی مکمل نہ تھی کہ مورتی کو زمین سے نکال سکتے، مگر یہ تھے تپسوی سادھو۔

شیاما چرن کو اب بھی وہ رات یاد ہے جب سادھو مہاراج رات گئے تک منتروں کا اچارن کر رہے تھے۔ شیاما چرن ان کے پاؤں میں بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ کب سادھو مہاراج کے نیتر کھلیں اور اسے آشیرواد دیں۔ لیکن سادھو مہاراج دنیا و مافیہا سے بے خبر بھگوان کی بھگتی میں مست تھے شیاما چرن وہیں بیٹھا تو اسے

سادھو مہاراج کے چرنوں میں سو گیا۔ اچانک اسے جھٹکا سا محسوس ہوا اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے دیکھا سادھو مہاراج بھگوان کی استتی میں مگن ہیں اور ٹیلے پر بھگوان کی مورتی ہے، شیاما چرن کو ایسے نظر آیا کہ اس جگہ روشنی کی شمع جلنے لگی ہے۔

"بھگوان ——" شیاما چرن حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"بھگت اٹھو اور بھجن کرو۔ بھگوان میری تپسیا سے پرسن ہوئے اور مجھے درشن دیئے"

صبح ہوتے ہی یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق ٹیلے پر جمع ہونے لگے، عورتیں ایک دوسرے سے بار بار یہ کہہ رہی تھیں میاں نہ جی تھی کہ یہ سادھو مہاراج پہنچے ہوئے ہیں۔ دھن ہے جن کے درشن ہوئے۔

شام تک بھگتوں کا تانتا بندھا رہا، رات کو جونہی پہلا تارا نکلا سادھو مہاراج نے اپنا جھولا سنبھالا اور بھگتوں کے ہجوم سے نکل کر ایک سمت ہو لئے، لوگوں نے پوچھا سادھو مہاراج آپ کہاں جا رہے ہیں سادھو مہاراج نے دھرو تارے کی طرف اشارہ کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولے لوگوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن سادھو مہاراج بضد تھے لوگوں نے زبردستی ان کے جھولے میں تمام روپے پیسے، پھل پھول اور گنے ڈال دیئے، سادھو مہاراج نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور سبھی پیسے مٹھی نکال کر بھگوان کی مورتی کے سامنے رکھ دی۔

"اے بھگوان یہ بھینٹ تمہاری ہے"۔ اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے" سادھو کی بھینٹ تو تب ہوگی، جب یہاں بھگوان کی سونے کی مورتی ستھاپت ہوگی۔ سب کا پاپ تبھی نشٹ ہوگا۔ یہ کہہ کر سادھو مہاراج چلے گئے

رات کو شہر کے معزز لوگوں کی میٹنگ ہوئی، فیصلہ ہوا کہ یہاں ایک عالیشان مندر بنایا جائے، عارضی طور پر اس ٹیلے پر ایک چبوترہ بنا دیا گیا اور لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا یہ بھی طے پایا کہ اسی طرح جو بھینٹ ان کی اور بھگتوں سے جمع ہوگی اس سے مندر کی تعمیر ہوگا۔

دوسرے روز سے ہی مندر کے لئے دان جمع ہونا شروع ہو گیا سیٹھ رام نارائن جو ان دنوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے واپس آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ اس طرح ٹیلے کے نیچے سے مورتی نکلی ہے، انہوں نے پچاس ہزار ایک روپیہ دان دیا۔ لوگوں نے ان کی شردھا سے پر بھاوت ہو کر انہیں مندر کمیٹی کا پردھان بنا دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے دادا جب زندہ تھے تو کہا کرتے تھے کہ اس جگہ ایک بڑا ہی عالیشان مندر تھا۔ اورنگزیب کے زمانے کی بات ہے کہ اس نے یہ مندر گرا دیا جب وہ مورتی کو توڑنے کے لئے بڑھا تو یہ مورتی زمین کے نیچے پردیش کر گئی

بہرحال سیٹھ رام نرائن۔ شام نارائن بٹن والے کو اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ جب مندر کمیٹی نے انہیں سروسمتی سے پردھان چن لیا اور مندر کی آدھار شلا پران کا نام آ گیا۔ کہ ادگھاٹن بھی وہی کریں گے تو وہ اپنے کام میں لگ گئے، انہوں نے اپنی دوکان کے سامنے گئوشالا ودھوا آشرم اور اناتھ شرم کے ساتھ "مندر ستھاپتی دان" کا بکس بھی لگا دیا پرکاروباری لین دین میں مندر ستھاپتی دان کے بکس میں بھی کچھ پیسے پڑ جاتے تھے۔ اپنے انہی کاموں کے باعث وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی بن گئے تھے۔

چند دنوں میں ہی مندر کی تعمیر شروع ہو گئی۔ کھائیاں کھد گئیں، بنیادیں پڑ گئیں۔ دیواریں اوپر اٹھنے لگیں، گنبد کے گھیرے خوبصورت ہونے لگے اور بالآخر مرکزی گنبد پر ایک صبح سورج کی پہلی کرن نے سونے کے کلس کو چوم لیا۔ شیاما چرن غریب آدمی تھا اس کے من میں کئی بار آیا کہ وہ اپنی بیوی کا کنگنی بیچ کر بھگوان کی مندر میں اپنی شردھا انو شار بھینٹ کرے اس کی بیوی بضد تھی کہ بھگوان کو سونے کا لالچ نہیں بھگوان تو شردھا کے پریمی ہیں۔ کرم دیکھتے ہیں۔ انتریامی ہیں بھگوان کی سیوا دھن سے نہیں تن اور من سے بھی ہوتی ہے۔ شیاما چرن نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنے تن سے بھگوان کی سیوا کرے گا غریب آدمی کے پاس دھن نہیں تو تن اور من تو ہے، اس نے مکانوں کی تعمیر کا کام بڑی مدت پہلے چھوڑ رکھا تھا۔ ایک بار اس نے پھر اس

سے مندر کی تعمیر میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ شیاما چرن کو چند ہی دن لگے کہ وہ سب سے ہوشیار کام کرنے والا نکلا۔ اس کو اکیلے ہی سامنے کی دیوار پر کام مل گیا۔ بھگوان کی کرسی بھی اس نے ہی بنائی تھی، جوں جوں دیوار اوپر اٹھتی جاتی وہ اور تیزی اور رفتار سے کام کرنے لگتا۔ معلوم نہیں اسکے دل میں یہ خیال بار بار کیوں آتا کہ یہ دیوار اونچی ہوتی چلی جائے اور اونچی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ یہ دیوار آکاش تک چلی جائے، وہ اپنے اس جذبہ کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

جنم اشٹمی میں چند دن باقی رہ گئے تھے۔ کام ابھی کافی تھا ٹھیکیدار کی پریشانی بڑھ رہی تھی، لیکن اس کے بنیادی اصول میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ زیادہ کام۔ کم اجرت اور غلیظ گالیاں۔ مزدور بھی اس کے کچھ عادی سے ہو چلے تھے،

کام کام ہو رہا تھا۔ اجرت اجرت نہ رہی تھی، گالی گالی نہ رہی تھی۔ جب نیچے سے ٹھیکیدار آ تھوک کے کوئی مغلظ گالی دیتا تھا تو کوئی کہہ اٹھتا کہ ہم کام کر رہے بابو۔ یہ شیاما چرن باتیں بناوت ہے، دراصل تمام مزدوروں کو شیاما چرن سے چڑ ہو گئی تھی وہ سب سے زیادہ کام کرتا تھا۔ اور سب سے کم اجرت لیتا تھا، ٹھیکیدار اس سے بہت خوش تھا۔ شیاما چرن تو یہ سمجھ کے کام کرتا تھا کہ بھگوان کی سیوا کر رہا ہے کبھی کبھی کوئی مزدور کہہ اٹھتا "مندر بھگوان کا ہے کیا ٹھیکیدار پوکٹ میں کام کر رہا ہے"۔ مزدور جانتے تھے کہ جہاں آٹھ بوریاں سمنٹ سے کام چلتا ہے۔ وہاں ٹھیکیدار نے دس لکھوائی ہیں۔

شیاما چرن کو کیا معلوم وہ تو نرا گاؤدی ہے، اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مندر کمیٹی کے سکریٹری نے کتنا روپیہ غبن کر لیا ہے، ٹھیکیدار شیاما چرن کا نام سن کر چیخ ہی تو اٹھا۔ تمہارا کیا لیتا ہے، شیاما چرن کے سالے۔ جی سے کام کرتا ہے حرام کی نہیں لیتا۔ اور پھر شیاما چرن کو آواز لگا ارے او ٹھہرے۔ باتیں ہی بناتے رہو گے یا کچھ کام بھی کرو گے۔ جتنی دیر تک تم ایک اینٹ جماتے ہو آدمی قطب مینار بنا لیتا ہے شیاما چرن پہن کر زیادہ مستعدی سے کام شروع کر دیتا۔

اب رات کو بھی کام ہونے لگا، مزدوروں کی تین تین شفٹیں لگنے لگیں، گیس کی روشنی کا انتظام ہو گیا۔ شیاما چرن نے ایک شفٹ کے وقفہ کے بعد دوسری شفٹ میں بھی کام شروع کر دیا دیکھتے ہی دیکھتے عمارت کھڑی ہو گئی، ملبہ صاف ہونے لگا بھگوان کی کرسی پر پچی کاری ہونے لگی، دیواروں پر سرخ رنگ ہو گیا۔ سونے کے کلس کو پالش کر دیا گیا۔ مندر کی تعمیر جنم اشٹمی سے ایک رات پہلے ختم ہو گئی۔ بس اب بھگوان کی مورتی آنے کی دیر تھی۔

جنم اشٹمی کا دن آ گیا۔ آج بھگوان کی سونے مورتی ستھاپت ہو گی شہر میں چرچا تھا ہر ایک کی زبان پر تھا۔ لوگوں میں جوش پھیل گیا شیاما چرن خوشی سے جھوم اٹھا۔ آج اس نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ اسے اپنے جسم میں حرارت سی محسوس ہوئی، لیکن اس کے دل میں خوشی تھی اسے سادھو مہاراج کا آشیرواد یاد آیا۔ شیاما چرن نے پوتر ہردے سے سیوا کی تھی، لیکن پھر بھی اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال آ جاتا شاید اسکی قسمت بدل جائے، بھگوان سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

صبح سے ہی شہر کی سڑکوں پر دروازے بننے شروع ہو گئے جس جس سڑک سے بھگوان کی مورتی گزرے گی لوگ جمع ہونے لگے، عورتیں بچے، اپنے مکانوں کے چھتوں پر ہاتھوں میں پھول اور گنگا جل لے کر میں دوپہرے ہی کھڑے ہو گئے۔

مندر کے دروازے پر قالین بچھ گئے، مندر کے باہر کاریں ہی نظر آنے لگیں لوگ کاروں سے اندر سے ننگے پاؤں نکلے، ہاتھوں میں پھولوں کے دونے لئے مندر کی دہلیز پر سیس نواتے اس کی دھول ماتھے پر لگاتے اور اندر داخل ہو جاتے، عام لوگ ابھی باہر ہی کھڑے تھے کہ بھگوان کے درشن کر کے ہی اندر چلیں گے، دور سے بھگوان کی مورتی کا جلوس نظر آیا اس کے سامنے لوگ جھوم جھوم کر گا رہے تھے، ڈھولکی اور چمٹے بجا رہے تھے، جلوس نزدیک آ گیا۔ لوگ دو قطاروں میں بٹ گئے بھگوان کی مورتی پھولوں سے لدی ہوئی تھی، بس چہرہ ہی چہرہ نظر آتا تھا، مورتی اور سنگھاسن اندر لے جائی گئی اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کا ایک ریلا اندر

داخل ہو گیا۔ شیاما چرن نے بھی اندر جانے کی بار بار کوشش کی لیکن ہمیشہ ہجوم میں پیچھے ڈھکیل دیا گیا، ایک بار وہ مندر کے آہنی دروازے تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور اندر داخل ہونے لگا سیوا سمتی کے ایک آدمی نے اسے روک دیا۔

"ارے کیا کرتے ہو بابا۔ بھگوان کے درشن کرنے دو" شیاما چرن ذرا بگڑ کر بولا۔

"ابھی اندر نہیں جا سکتے، اندر جگہ نہیں۔ ابھی خاص خاص آدمی جا سکتا ہے۔"

"ارے بھگوان کے درشن ——"

"کہہ دیا جب چاند نکلے گا بھگوان کا جنم ہوگا۔ سب جنے اندر جا سکیں گے۔"

شیاما چرن پھر باہر ڈھکیل دیا گیا۔ لوگ اب بھی اندر جا رہے تھے، اجلے اجلے کپڑے پہنے، بچے، عورت، مرد، زیورات سے لدے پھندے ہاتھوں میں پھول کیسو دھوپ اور اگر بتی لئے۔

شیاما چرن نے کئی بار کوشش کی کہ میں شیاما چرن ہوں، یہ سب سے اونچی دیوار میں نے بنائی ہے۔ یہ دیوار جس پر دیئے جل رہے ہیں۔ جب ٹیلے سے مورتی نکلی تھی تو میں ہی سادھو مہاراج کے چرنوں میں تھا۔ سب سے پہلے میں نے ہی سب کو بتایا تھا میں نے اپنی آنکھوں سے مورتی کو نکلتے دیکھا ہے۔ میں شیاما چرن"۔

لیکن یہ سب اس نے سوچا اور کہہ نہ سکا وہ۔ وہ شیاما چرن نہیں تھا جس نے یہ دیوار بنائی تھی۔ جس پر اب دیئے جل رہے ہیں جس میں آہنی دروازہ اور سلاخوں والا جنگلا تھا۔ وہ شیاما چرن نہیں ہے جو سادھو مہاراج کے چرنوں میں تھا جب یہ مورتی ٹیلے سے نکلی تھی اس نے بھوڑا کا حشر دیکھا تھا، بھوڑا نے بھی اندر جانے کی کوشش کی تھی لیکن دروازے سے پیچھے ڈھکیل دیا گیا تھا اور لوگوں کے پاؤں کے نیچے آنے سے مشکل سے بچا تھا۔

"ارے بھوڑا۔ تم نے دیکھی۔ بھگوان کی مورتی ——" شیاما چرن نے پوچھا۔

"ہاں۔ دور سے دیکھی تھی ——"

"سونے کی تھی نا ——"

"معلوم تو ایسے ہی ہوتا تھا۔ خوب چمک رہی تھی۔ آگے بھگوان جانے ——"

یہ سن کر شیاما چرن ایک بار پھر آگے بڑھا۔ اس کے دل میں طوفان ابل رہا تھا۔ اب سیوا سمتی کے لوگوں نے اس دھکم پیل سے گھبرا کر سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا اور کہہ دیا جب چاند نکلے گا تو دروازہ کھلے گا۔ اندر جگہ نہیں۔

شیاما چرن نے سلاخوں کے پیچھے سے بھگوان کی مورتی دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ تھی اور اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، بس گھنٹیاں بجنے اور بھگتی گیت کے سوا کچھ سنائی نہ پڑا۔ اس نے سوچا کہ وہ دیوار سے کود کے اندر چلا جائے اس نے دیوار کی بلندی دیکھی، اگر شیاما چرن تین گنا زیادہ لمبا ہوتا تو شاید وہ اندر جا سکتا تھا۔ اس دیوار پر ایک پتھر پر جسے لوگ آدھار شیلا کہتے ہیں لکھا ہوا تھا "سیٹھ رام نارائن، شام نارائن کا اس مندر کی آدھار شیلا رکھی ہے" وہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھائے مگر دیوار اس سے کسی قدر زیادہ اونچی تھی، بھوڑا نے جو یاکی بات دہراتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کا مندر ہے کبھ کھلا نہیں۔"

"کب سنکھ بجے گا" شیاما چرن نے پوچھا۔

"جب چاند نکلے گا۔" بھوڑا نے کہا۔

شیاما چرن آسمان پر بادلوں کے پیچھے دیکھنے لگا کہ کب چاند نکلیگا اور مندر کا دروازہ کھلے گا، اور آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اسے ایسے نظر آنے لگے جیسے بھگوان کرشن اپنے گھوڑے پر سوار بانسری لئے اوپر ہی اوپر بلندیوں میں اڑتے جا رہے ہیں۔

مولوی ہمایوں

اُردو زبان کی جدّت طرازی اور اس کی اہمیّت

اردو نے اوائلِ رعیاں سے عہد بعہد تا الی الآن ترقی و عروج کا جامہ ملبوس کیا۔ اس کی برق رفتاری نے کمال سلعت کو آئینۂ امروز میں اس طرح چمکایا، کہ سارے عالم کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا، اور تختۂ ہند پر کمال افروں کا تاج مرصع کرکے جلوہ افروز ہوئی، کہ ایک میعاد معین تک تمام زبانوں پر ایسی سلطنت کرنے لگی، اور کسی مروجہ زبان کہنہ کو اپنے شان و شکوہ کے آگے زور پکڑنے نہ دیا۔ کہ رفتہ رفتہ ہندستان کی سلفی زبان کو زوال آیا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پیر میں ضعف اثر کیا۔ اور اس کی اصلی زبان نے صفحۂ ہستی سے مشاہیر اردو کو خیرباد کہا چونکہ زمین ہند پر اردو نے اس طرح اپنا اقتدار جمایا، کہ زبان ہائے سلعت کو مجبوراً الوداع کہنا ہی پڑا۔

اردو ایک ایسا سبزہ زار چمن ہے، جس کی خوبی و رعنائی نے ہر ایک دلِ ناسور کو فرحت بخشی، اس کے شاخہائے گل سے ایسی ایسی کلیاں چٹکیں، جو کبھی پژمردگی کے مآل کو نہ پہونچ سکیں۔ اس نے زائرینِ چمن کو اپنی بوقلمونی کا سحار چڑھا کر مخمور بنا ڈالا۔ ہندی بھنورے نے گلہائے اردو کی شیرینیت کو چوس چوس کر اپنی زبان کی لذت بڑھائی اور ہر ایک صاحبِ سخن نے اس کی چاشنی سے اپنے ذائقہ کو فروغ دیا۔ اردو کی فصاحت و بلاغت کا آج ہر ایک شخص قائل ہے، خواہ وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہی زبان ہے، جو صدیوں پہلے ہند سے معدوم تھی، اور کسے معلوم تھا، کہ اسی ملک سے اردو کا لازوال چشمہ اُبلنے والا ہے۔ جس سے ہندستان کو صد فخر حاصل ہوگا؟ اور کون جانتا تھا کہ بطنِ ہند سے ایک ایسی نسل چلے گی، کہ وہ تمام زبانوں کی ملکہ ہوگی۔ جس کے شاہی دربار میں تمام زبانوں کو رعایا کی حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل نہ ہوگی۔

اس بات کا ہر شخص معترف ہے، کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا کی ایک شاخ ہے۔ جس میں سنسکرت، پراکرت اور عربی فارسی زبانیں مروج تھیں۔ برج بھاشا خاص ہندستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر ۰۰۰ برس سے زیادہ نہیں، اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے، جیسے جیسے لوگ آتے گئے، اپنی اپنی زبان کو اہمیت دی۔ لیکن جب مسلمان اسلام کے بعد ہندستان میں آئے، تو فارسی اور عربی ان کی زبان تھی، مگر ان کے تیں یہاں برج بھاشا کا اقتدار تھا۔ اس لئے وہ لوگ بھی اس زبان سے مانوس ہوتے گئے اور اہلِ برج نے بھی ان کی زبانوں کو اپنے قلوب میں جگہ دی۔ اس کی یادگاریں اب تک کتب سلعت میں موجود ہیں جن میں فارسی،

عربی اور بھاشا کی خلط ملط زبانیں ملتی ہیں۔

گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی، جسے آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں اس وقت بھی تمام افراد کی اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی رہی، کہ دفعتہً زمانہ کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم فرش ہند پر آیا۔ اس نے بڑے شد و مد سے پھر ملک و مذہب کو ایک نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت سے ہر ایک کی زبانوں پر اثر ڈالنا شروع ہوا۔

اس زمانہ کی عہد بعہد کی تصنیفیں آج نہیں ملتیں۔ جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چند کوی نامی ایک شاعر نے پرتھی راج راسا لکھا، اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زبان مذکور نے باوجود برج بھاشا ہونے کے اس قدر جلد فارسی عربی کے اثرات کو قبول کیا کہ نفس ناطقہ کو تعجب میں ڈال دیا پندرھویں صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا۔ کبیر نامی ایک شاعر گو ان پڑھ ہونے کے باوجود گرو راما نند کا چیلہ ہو کر فارسی و عربی کے الفاظ کو اپنے کلام میں جگہ دی اور اسی عہد میں اول اول کایستھ نے فارسی پڑھ کر شاہی دفتروں میں داخل ہو کر اپنا وقار بڑھایا مسلمان بھی اس زمانہ میں یہاں کی زبانوں سے محبت رکھتے تھے، سولھویں صدی عیسوی میں شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی نامی ایک شاعر ہوئے جن کے کلام سے ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمان بھی ان کے ملک میں رہ کر یہاں کی زبان سے مانوس ہو گئے ہیں، اور اسے اپنے کلام کا ایک جزو سمجھ لیا ہے۔ اور شاہجہاں کے عہد میں جبکہ اقبال تیموری کا آفتاب عین عروج پر تھا۔ کہ اس کے ملازمین شاہی اور عساکر چونکہ مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے جاننے والے تھے، اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے، اس لئے وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔ یہ اس وقت جب کہ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر دلّی دارالخلافہ ہوئی تھی۔

اردو ترکی زبان میں لشکر بازار کو کہتے ہیں۔ چونکہ اردو مختلف زبانوں سے مرکب ہو کر بنی ہے، اس لئے شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے، کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب ہو کر معروف و مشہور ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی گفت و شنید کو اس طرح لوگوں کے دماغ نے قبول کیا، کہ اچھی طرح سمجھنے لگے، اور چند عرصہ میں شاہی دربار کی زبان خاص اردو ہو گئی۔

اردو کے سبزہ زار میں سب سے پہلے شمس ولی اللہ دکنی نے قدم رکھا۔ یہ اردو زباں کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا۔ جس میں وقت کے محاوروں نے اپنے جواہرات خرچ کئے۔ اور مضامین کی رائج الوقت دستکاری سے مینا کاری کی گئی جب کشور وجود میں پہونچا تو ایوان مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ جو شہرت عام نے ان کے نام خشت عزت سے تعمیر کیا۔ اور یہی اصل نظم اردو کا بانی ثابت ہوا، کہ اپنی ابتدائی کلام کے موتیوں کو صفحۂ ہند پر بکھیرا۔ گو ان کے قبل بھی بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ٹوٹی پھوٹی اردو کو رائج کیا، مگر ان کے کلام نے شہرت نہ پکڑی۔ بہر حال عالمگیر کے عہد میں ولی دکنی نے اس نظم اردو کا چراغ روشن کیا۔ جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ بن کر چکا۔ اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب ہو کر اوج پر آیا، اور اسی لئے ان کا نام دور اول کے استادوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس وقت کے سخن گو ابتدائی اردو ہونے کے باعث کلام ناموزوں اور بے ڈھب سا استعمال کیا کرتے تھے، اس لئے ان کے کلام میں کوئی خاص جدت نہیں، اور دور اول میں بہت خامیاں رہ گئیں۔ دوسرے دور میں شاہ عالم نے بڑی کوشش کر کے ان رنگ آمیزیوں سے اردو کو پاک کیا، اور تیسرے دور میں سودا کے عہد میں بھی اس مادۂ فاسد کا بقیہ چلا آتا [illegible]، چنانچہ انہوں

نے بھی اپنے ایک کلام میں ان بزرگوں کی شکایت کی اور ان سے بھی جو کچھ رہی سہی خامیاں تھیں، پانچویں دور میں سب کی تلافی ہوگئی۔

ہمارے بزرگوں میں سے دلی میں اول مرزا رفیع سودا نے پھر ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق نے اردو زبان کی پاکیزگی، الفاظ شگفتگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں زور پیدا کیا۔ میر تقی اور خواجہ میر درد نے آہ زاری، افسردہ دلی دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا اور اصل قالب اردو میں روح پھونکی۔ غالب نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی اور تمام شوخ اور چست مضامین کو اپنے کلام میں جگہ دے کر اردو کی اہمیت کو بڑھایا اور ایسے ڈھنگ اور اصول سے صفحۂ قرطاس پر جمایا کہ سلاست و روانگی کا آبشار جاری کر دیا۔ جس کی سیرابی نے علم اردو کے سوکھے باغات کو روئیدگی اور تازگی بخشی۔ باوجودیکہ غالب کی مادری زبان فارسی تھی، لیکن اپنی جدت طرازی کی آئینہ میں اردو کو اس طرح سرزمین ہند پر چمکایا کہ اہل نظر کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ زبان اردو کو اس کی ذات سے مدفخر حاصل ہے، جس نے علم ترقی کو فضائے عالم میں لہرایا گو ان سے قبل میر انیس، میر دبیر، میر حسن، جرات، مومن خان، امام بخش ناسخ، خواجہ علی حیدر آتش، شیخ غلام ہمدانی مصحفی وغیرہم اور ان کے علاوہ بہت سے شعراء نے ادب اردو کی خدمت کی اور اپنی کے بل پر اردو کو عالم وجود میں لائے، اور اسے رائج وقت کیا۔ لیکن جو شہرت ذوق و غالب کی ذات سے وابستہ ہے کسی کو حاصل نہیں۔ اور جو اصول اور جو اصول اور حد بندی اردو میں برتی کسی کے ذات سے ایسا نہ ہوا۔ بہر حال شعراء کی مشترکہ کاوشوں نے اردو کو ایک تندرست جوان بنا دیا۔ اور ہر ایک ادیب اردو نے اپنی روحانی طاقت عطا کی۔ اور عہد بعہد اپنی فصاحت و بلاغت سے اردو کو اس طرح سنوارا کہ دیکھنے والے مرغ بسمل ہوگئے۔ اس کی تعمیر کو اس حوصلہ بندی سے مضبوط کیا کہ قدرت کی تمام آفاتی طوفان و بلیات بھی اسے نقصان نہ پہنچا سکی۔ یہاں تک کہ پانچویں دور کے مشاہیر ادب اور صاحب شعراء فلک ادب پر جگمگا کر غروب ہو گئے۔

اردو زبان کا ظہور تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری سے پہلے نہ ہوا تھا۔ اور نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی۔ اسی سنہ میں محمد شاہ کے عہد میں فضلی نامی ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی، اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں۔ اور غالباً نثر اردو کی پہلی تصنیف یہی ہے، اور اسی عہد میں میر محمد عطا حسین خان تحسین نے چار درویش کا قصہ اول اردو میں لکھا۔ اور شجاع الدولہ کے عہد میں اس کی تصنیف ہوئی۔ اور اسی سلسلہ میں ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی افسوس نے باغ اردو اور ۱۸۰۵ء میں آرائش محفل لکھی۔ اور اسی زمانہ میں ۱۸۰۲ء میں میر امن دہلوی نے باغ و بہار آراستہ کیا۔ اور اب اردو کے نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ میر انشاء اللہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے ۱۸۰۸ء میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ذکاوت کے پھول کھلائے اس قدر زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنے برکت کا ہاتھ ان کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۸۰۳ء میں مولوی شاہ عبدالقادر نے قرآن کا ترجمہ اردو میں کیا۔

۱۸۳۵ء سے سرکاری دفاتر بھی اردو ہونے شروع ہوئے چند سال بعد کل دفتروں میں اردو زبان رائج ہوگئی، اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ اور ۱۸۳۶ء میں اردو کا پہلا اخبار دلی میں جاری ہوا۔ غرض کہ اردو اپنی جدت اور وسعت سے ملکی زبان تسلیم کی گئی۔ اور دفتری زبان بھی اردو ہی قرار پائی

دلی زبان اردو کا مرکز اور علم و ادب کا گہوارہ ہے، اسی سرزمین میں شعرائے ملک اور بانی اردو نے زبان اردو کی بنیاد ڈالی۔ اور اسی سرزمین میں اردو کی تعمیر کی پہلی اینٹ رکھی گئی اور تمام صاحبان سخن نے اسی ارض اردو سے گذر کر عدم کی مسافت طے کی۔ یہیں سے شاخ علم اردو کی پھوٹی، یہیں سے نفس ناطقہ

اور ظرافت طبعی نے پہلے زور پکڑا۔ اس کی جدت پسندی اور جدت طرازی نے عالم ناپائدار کو مبہوت کیا۔ اس کے لفظوں کی روانی اور کلام کی سلاست نے اس طرح زور پکڑا کہ ایک عرصہ میں تمام زبانوں پر حاوی ہوگئی۔ لوگوں کی جہل و بدزبانی اور بے وضعی حالات کے خس و خاشاک کو چھانٹ کر ایسا سبزہ زار بنایا، جس کی دلکشی و رعنائی کا ثبوت بلقیس سبا بھی سلیمانؑ کے لئے نہ دے سکی، اس کی مینا کاری کو صد آفریں ہے کہ اردو کے باغات کو اس خوبی سے سجایا کہ آرائش چمن کی ضرورت نہ رہی۔ اس چمن لالہ زار میں بھانت بھانت کے طیور اور مرغانِ چمن نے اردو کے ایسے گیت گائے، کہ سامعین کو دم بخود کر ڈالا۔

یوپی، لکھنؤ اور دکن کی زبانوں کی آج بھی قدر کی جاتی ہے اس کی فصاحت نے زمین ہند پر اردو کا سکہ رائج کیا، اور زبان اردو کو اچھی طرح تمام متروک الفاظ سے چھانٹ کر عالم وجود میں لائے اور بہت سے مشاہیر علوم اس سرزمین سے ظہور میں آئے، اور وہیں پیوند زمین ہوئے، اور آج تک وہاں کے قدیم ماحول کے اثرات نے بچہ بچہ کو فصیح اللسان بنا دیا۔ اور اس کی تابانیوں نے گرد و نواح کو زرق برق کر دیا۔

اردو نے اس قدر جلد ترقی کا جامہ پہنا۔ کہ دیگر صاحبِ علوم کو حیران کر ڈالا، جسکی بنیاد بہت معصوم تھی، کہ اس قدر اپنی وجود کے میدان کو وسعت دی کہ تمام سخنورانِ ہند اس میں سما گئے اور اس قدر جلد جلد رنگ بدلا کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کا دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو فرق آئے گا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے، اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالک فرنگ میں ایسے نکلے ہیں، کہ زمانہ سلف میں بالکل ہی معدوم تھے۔ اس واسطے عربی، فارسی زبانیں جو کہ اردو کے منبع ہیں، ان کے خزانہ میں بھی ان کے ادائے مطلب کے لئے الفاظ نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ اردو عالم وجود میں سب سے زیادہ مقبولیت کی حد کو پہونچی۔ چنانچہ اوائل میں سرکار نے حکم نافذ کیا کہ دوسرے علوم اردو کے ذریعہ سکھائے جائیں، چنانچہ انگریزی علوم و فنون کو سمجھنے کے لئے دلی میں ایک سوسائٹی قائم ہوئی جس میں دیگر علوم کے ترجمے اردو زبان میں ہونے لگے۔ اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہونچانے لگی۔

مگر اب دورِ حاضرہ میں اردو کا نسبی اقتدار کم ہوا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے، کہ اب اردو بجائے ملکی زبان رہنے کے علاقائی زبان تسلیم کی جا رہی ہے، بلکہ اس کو بھی ختم کرنے کے لئے ہندی کے حامیوں نے بڑی بڑی سازشیں کیں۔ اور اس کو مٹانے کے لئے اپنی قوم کو ابھارا اس کے راستے پر کانٹے بچھائے، مگر ان کی تمام سازشیں شائقین اردو کا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔ اور اس کی اصلیت کو نیست و نابود کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اور بھی بہت سے دشمنانِ اردو اس زبان کے اصلی جوہر کو تہِ خاک کرنے کو تاں ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے، کہ اردو کی جوہر کو زنگ تو لگ سکتی ہے، مگر اس کی اصلیت نہیں مٹ سکتی، ان کی تمام سازشوں کے باوجود اردو صفحہ ہستی پہ رائج رہے گی، اور اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ مگر اہل سخن کو چاہئے، کہ اپنی زبان کی حفاظت کرتے رہیں۔ چونکہ دشمن گھات میں ہے ہو سکتا ہے کہ ہماری زندگی میں نہیں، بلکہ آئندہ نسلوں کی عہد میں موقع پاکر اردو کے پرخچے اڑا دے، اس لئے جس قدر ممکن ہو سکے اپنی زبان کو فروغ دیں۔ اپنے ہر اقدام اور حرکات میں اردو کو دخل دیں۔ انجمن، لائبریریاں، اور مدارس قائم کریں، تاکہ ابن الوقت لوگوں کی سازشوں کی طاقت اردو کی بیخ کنی نہ کر سکے۔ اس طرح عام فہم اردو کو رائج کریں، کہ پھر اوائل سلف کی طرح اردو کو نیرِ اعظم بنا کر گردِ فلک پر چمکا دیں۔ وما علینا الا البلاغ

سعیدہ ریحانہ، ایم۔اے، ایل۔ٹی، ریسرچ اسکالر

جگر کی ترنم ریزیاں

کسی نے سچ کہا ہے کہ "جگر شاعر ہے، مگر کیسا شاعر، ہمہ تن شاعر" سراپا شاعر ہے! جگر محض شاعری کا وہ چھلکتا جام ہے جس سے سب سرمست ہو گئے۔ اس نے ایسا نغمہ چھیڑا جس کی دھن دلوں کو برما گئی۔

یہ غزل گو دنیائے شاعری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں اس شاعر کی غزلیں قدیم تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا مخلوط نمونہ ہیں۔ موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں سے وہ خیالات کا ایسا محل بناتا ہے جہاں نغمے ہی نغمے بکھرے ہوں۔ چمنستان سخن میں اس بلبل نے وہ نغمہ سنجیاں کیں، جو فضائے بسیط پر محیط ہو گئیں۔

جگر ایک فطری اور عام طبیعت شناس شاعر ہیں، وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں ایسا لگتا ہے ع گویا یہ بھی مرے دل میں ہے' خوش آئند الفاظ اور انوکھی ترکیبوں سے وہ اپنے کلام کو یوں مزین کرتے ہیں، کہ سامعین کے دل کے ساز بجنے لگتے ہیں' سادگی' روانی اور دلکش تسلسل جگر کی شاعری کا خاصہ ہے۔

مولانا ندوی کا کہنا ہے "سادگی اور بے تکلفی حسرت کی خصوصیت ہے، مگر اس کی سادگی میں کشش ہے، بناو نہیں" مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ع

بتاؤ کیا تمھارے دل پہ گذرے
اگر کوئی تمھیں سا بے وفا ہو

اب تو یہ بھی رہا نہیں احساس
درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا
دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا!

شبنم آلودہ وہ حسیں آنکھیں
رخ پہ اڑتی ہوائیاں توبہ

وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اپنے دل کی بات ہے، اس کے خیالات' احساسات' اور اس کی شاعری میں تضاد نہیں' وہ حقیقی تاثرات، اور واردات پیش کر کے آپ سے دلوں کو مسحور کر لیتا ہے، اور خود بھی اسی میں سرشار و بے خود ہے

وہ حسن و عشق کا متوالا ہے، اس کی تمام زندگی محبت کی رنگین وادیوں میں گذری۔ اور وہ خود سراپا محبت بن کر محبت کی پرخار راہوں سے گذرتا رہا۔ جگر نے خود اپنے متعلق کہا ہے، کہ میری شاعری غزل ہی تک محدود ہے، اور چونکہ حسن و عشق ہی مری زندگی ہے۔ اس لئے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر بھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔"

اس کی سرشاری اور بے خودی ملاحظہ فرمائیے۔ ع

ہائے یہ کافروں کی کافر جنوں انگیز یاں
تم کو یاد آئے نہ آئے مجھ کو پیار آہی گیا

مرا جو حال ہو سو ہو برقِ نظر گرائے جا
میں یونہیں نالہ کش رہوں تو یونہیں مسکرائے جا

بس اک سمت اُڑا جا رہا ہوں وحشت میں
خبر نہیں کہ خودی کیا ہے، بے خودی کیا ہے

پاسِ ادب سے چھپ نہ سکا رازِ حسن و عشق
جس جا تمہارا نام سُنا سر جُھکا دیا

یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تم نے ادھر دیکھا۔

جگر کے کلام پر قدیم شاعری میں سے داغ کا رنگ سب سے زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ داغ کی خصوصیات کو مثلاً شوخی، الفاظ کی تکرار محبوب کے سراپا کو دلکش اور موزوں الفاظ میں بیان کرنا، یہ تمام چیزیں جگر کے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ نئی راہ پر گامزن ہیں۔ اس کلیم سخن کی جو بات ہے وہ انمول ہے اس کی نگاہیں حسن کی بہت بڑی ادا شناس معلوم ہوتی ہیں۔ اس رند آزاد کا دل لذتِ عشق سے پُر اور گوناگوں نغموں سے بھرا پڑا ہے۔ جو بھی ان نغموں کو سنتا ہے ایک عالم وارفتگی میں ڈوب جاتا ہے۔ اک کیفیت ہے جو طاری ہو جاتی ہے، ان کا یہ شعر ؎

شباب سیکش، جمال میکش خیال میکش نگاہ میکش
خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی انہیں خود اپنی خبر نہیں ہے

الفاظ کی تکرار کا اک نادر اور دلکش نمونہ ؎

زہے صورت زہے معنی زہے پردہ زہے جلوہ
بیک لحظہ بیک ساعت عیاں ہونا نہاں ہونا

جگر ایک ایسا کامیاب مرصع کار ہے کہ پامال سے پامال، مضامین میں الفاظ کی مناسبت، نشست، ترتیب اور ساخت سے سننے والوں کو اک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے آپ نے کوئی نئی دھن سنی ہے۔ ایسی دھن جو ان کے ذہن میں موجود تو تھی، لیکن یاد نہ آتی تھی، ملاحظہ ہو ؎

تا عمر آہ کنج قفس دیکھنا پڑا
اڑ کے چلے تھے چار قدم آشیاں کے ہم

آئے زباں پہ رازِ محبت محال ہے
تم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے

کس طرف جاؤں کدھر جاؤں، کسے آواز دوں
اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

ترا جذبۂ شوق بے حقیقت!
ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا
نہیں کھیل ناصح جنوں کی حقیقت
سمجھ لیجئے گا تو سمجھائیے گا

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے بقول ندوی صاحب "معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے

نہاں ہوا ہے۔ سرمستی و سرشاری تاثر و دلفگاری اس کے مصرعے کی جان ہے۔ جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں... انہیں کو الٹ پلٹ کر دہراتے ہیں، تو سننے والوں کو یہ بات نئی معلوم ہوتی ہے: غرضیکہ موسیقیت اور غزلیت جو جگر کے یہاں ہیں وہ ہم کو کہیں نہیں ملتی۔ ہم چمنستان ادب میں آرزو، مرحوم اور حسرت و فانی کا نام لے سکتے ہیں۔ ان کے اشعار بھی تغزل میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں وہ کیف آور نغمہ پیدا ہی نہیں ہوتا جس سے پانی میں ارتعاش پیدا ہو جائے۔ ان کی زبان غزل کی جان ہے۔ حسن و عشق کی چاشنی، معاملہ بندی کی سرور کن کیفیتیں جو ان کے یہاں ہیں، کسی کے یہاں نہیں۔ بے ساختگی اور موسیقیت نے ان کو جملہ معاصرین میں ممتاز کر دیا ہے۔ دیکھئے وہ نغمہ ریز ہیں۔

دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن،
اب بھی روِش روِش ہے مگر پائمال ہے

کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں
دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں

جب تک ہمارے جسم میں جان حزیں رہے
نظریں مری جواں رہیں دل حسیں رہے

مشہور نقاد I. A. Richards کا کہنا ہے کہ اشعار موسیقیت عظیم شاعری کا نشان امتیاز ہے۔ جس شاعر کے کلام میں جتنی موسیقیت ہوگی، اتنا ہی اس کا اثر ہمہ گیر ہوگا۔ کتنے انگریز شعراء Cole Ridge اور Tennyson آج صرف اپنے کلام کی نغمگی کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں، مثال کے طور پر Cole Ridge کے اشعار کا بہاؤ دیکھئے ؎

And lo: The worker of those harms
That holds the maiden in her arms'
Seems to slumber still and mild,
As a mother with her child:

ترجمہ:- "وائے حیرت! کہ بانئ فتنہ
نازنین درکنار ہے ایسے
خواب خرگوش میں حسین و بیک
اک جگر گوشہ اور ماں جیسے" (ادارہ)

جگر کے کلام میں اتنا تیز بہاؤ نہیں ہے، ان کے نغمے میں آہستہ بہنے والے دریا کا سکوت ہے۔ ایک ایسی ٹھہری سی روانی ہے، جو ہمیں Coleridge سے زیادہ Keats کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن ان اشعار کی تیزی اور تندی ملاحظہ ہو ؎

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں
گریں لاکھ بار یہ بجلیاں،
مری سلطنت یہی آشیاں
مری ملکیت یہی چار پر

میں رہین دردِ سہی مگر
مجھے اور چاہئے کیا جگر
غم یار ہے مرا شیفتہ،
میں فریفتہ غم یار پر

لیکن یہ جگر کے نغمے کا اصل رنگ نہیں ہے، ان کی موسیقی اس وقت نکھر کر اور سنور کر سامنے آتی ہے، جب ان کا

گیت دردبھرا اور بڑا بڑا سا ہوتا ہے ، ملاحظہ ہو ؎

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی
ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائگاں سعیِ التفات گئی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

جگر کے اشعار دلوں کو موہ لینے میں ہر ہر پہلو سے کامیاب ہیں ۔ وہ Shelley کے اس مصرعے کو پوری پوری طور سے اپناتے ہیں ۔

"Our sweetest songs are those
That tell our saddest thoughts"

ترجمہ
" گیت کو زندۂ جاوید وہی کرتا ہے
جس کا ٹوٹا ہوا دل نغمہ گری کرتا ہے " (ادارہ)

ان کے اشعار میں آپ کو ایک ایسا چبھتا ہوا درد ملے گا جس سے آپ خود تڑپ اٹھیں گے ، آپ کے دل کے ساز کا ایک ایک تار درد سے چیخ اٹھے گا ـــــ نغمہ آپ کی رگ رگ میں سرایت کر جائے گا ۔ آپ کا دل دردیلی فضاؤں میں ڈوب جائے گا ۔ اور شاعر کے درد کو اپنے میں سمولے گا ؎

دل کو نہ چھیڑ اے غمِ فرصت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

مری سمت سے اسے اے صبا یہ پیام آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

دیکھ سکتا نہیں ساقی مری محرومی کو
جام خالی نہیں ہوتا کہ وہ بھر دیتا ہے

بہارِ رفتہ مری پھر نہ آئی اے جگر واپس
چمن میں ہر خزاں کے بعد لیکن اک بہار آئی ہے

ذرا ان اشعار کو مشہور انگریز شاعر Shelley کی اس نظم کے سامنے رکھ کر دیکھئے ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں شعراء نے غمِ دل کو اپنے اندر رچا بسا کر غم کائنات بنا دیا ہے غم کا انتہائی عروج یہ ہے کہ وہ صرف شاعر کا غم نہ رہ جائے ، بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس غم سے بھرپور نظر آئے ، سنئے شیلے کہتا ہے ۔

Out of the day and night
A joy has taken flight:
Fresh spring and summer
and winter hoar
Tell my faint heart with
greif but with delight
No more, oh! Never
more!

ترجمہ
" روز و شب سوگ میں ہیں ڈوب گئی یاس میں آس
فصلِ گل دورِ خزاں موسمِ سرما ہے اداس
لیکن اس دل پہ چلے جاتا ہے سدا خنجرِ یاس
پُرمسرت نہ کبھی آئے گی بدبخت کے پاس " (ادارہ)

وہ ایک کامیاب مصور ہے ۔ ایسا مصور جس کی تصویریں سادہ رنگوں سے رنگی گئی ہوں ۔ لیکن جس کو رنگوں کی آمیزش میں کمال حاصل ہو ۔ محاکات کا وہ استاد ہے وہ جو کچھ کہے

گا، اس کی تصویر آپ کی نظروں میں کھنچتی جائے گی۔ آپ دیکھتے جائیں گے، اور محسوس کرتے جائیں گے ؎

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

سولہویں صدی کا مشہور شاعر John Donne کہتا ہے

Her pure and eloquent-
blood spoke in her cheeks
And so distinctly wrought
That one might almost say
Her body thought:

ترجمہ "جام رخسار ہائے رنگین سے وہ لہو کا چھلک چھلک جانا
جیسے رنگینیاں مناتی ہوں حسن کا دلفریب افسانہ" (اداؔ)

انگریز شاعری اس لذت پسندی Hedonism اور رنگینی کے مقابلے میں جگرؔ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ سادگی اور کیف نے زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

آستینوں کا وہ چڑھا لینا
گوری گوری کلائیاں توبہ
شبنم آلودہ وہ حسیں آنکھیں
رُخ پہ اڑتی ہوائیاں توبہ

۱۹۴۷ء کے بعد سے جگرؔ کی شاعری میں سرمستی اور بے ہوشی کی جگہ فلسفیانہ ٹھہراؤ اور گہرائی نے لے لی ہے۔ اب وہ اسلامی فلسفۂ حیات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی اب غم جاناں سے بدل کر غم دوراں ہو گئی ہے۔ اگرچہ اب ان کے اشعار میں وہ "آگ" وہ کیف وہ لپک نہیں رہ گئی ہے، لیکن ان کی شاعری کا نیا موڑ اس لحاظ سے خوش آیند ہے، کہ اب اس میں گہرائی، سکون اور آفاقی ہمہ گیری کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں
کیا یہ کہا تو نے اے ناداں فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر پیدا تو کر کیا چیز ہے جو انعام نہیں

★

ظلمت شب نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے
ضبط محبت شرط محبت
دل ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

★

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب چمن کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں
جو حق کے خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگرؔ
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

★

لیکن ان سب کے باوجود جگرؔ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور جو درجۂ امتیاز ملا ہے۔ جس کی مثال دنیائے شاعری میں شاذ ہے۔ اس میں جگرؔ کے لحن و ترنم کا ذکر ضروری ہے ان کا وہ مخصوص لب و لہجہ، ان کی وہ مخصوص آواز، اور منفرد پڑھنے کا طریقہ اور انداز ہے۔ جس نے جگرؔ کو ہر خاص و عام کا دلپسند شاعر بنا دیا ہے۔ ہر نو آموز شاعر نے جہاں ان کی تراکیب اسلوب بیان اور نشست الفاظ کی تقلید کی، وہاں ان کے ترنم کو بھی اپنایا۔ انہوں نے اپنے ترنم سے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش بنا دیا۔ جس مشاعرے میں بھی جگرؔ نے نغمہ ریزیاں کی ہیں، وہاں نغمہ ہی نغمہ بکھر گیا ہے، ان کی

درد بھری آواز وہ جادو جگاتی ہے۔ کہ سامعین کے دل ان کی مترنم آواز میں کھو جاتے ہیں۔ وہ مدہوش ہو کر سنتے جاتے ہیں۔ اور جگر کا ترنم ان کو بے ہوش کئے جاتا ہے، اور اس حقیقت سے کسکو انکار ہے کہ سو فی صدی مشاعرے کی بازی جگر کے ہاتھوں رہی ہے۔ بڑی بڑی ادبی محفلیں انہوں نے اگر اپنی رندی اور سرمستی سے لوٹی ہیں۔ تو شاید ہی کوئی مشاعرہ منعقد ہوا ہو جہاں ان کا مخصوص انداز بیان لوگوں پر اک مستانہ وار کیفیت کی بارش نہ کر رہا ہو۔

آج وہ ہندستان کے مشہور پڑھنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شروع میں وہ ایک خاص قسم کی دُھن سے وہ اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے، لیکن شاعروں نے فوراً اس کو اپنا لیا۔ اور تب جگر نے دوسری دھنیں اپنے گلے کے سوز و گداز سے نکالیں، اور وہ بھی دلوں پر چھا گئیں، اور زبان پر چڑھ گئیں۔ لیکن اب تو وہ اسی دُھن پر قانع ہیں۔

پھر بھی جگر کی شاعری کو ان کے طرز ادا نے وہ شہرت دوام بخشی، جو اور شعراء کو دنیائے ادب میں نہیں مل سکتی، معنوی لحاظ سے اتنی گہری باتیں نہیں کہتے، لیکن ان کا ترنم ان کے گلے کا سوز دلگداز دلوں پر ایسی چوٹ لگاتا ہے، کہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے، اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری کی تنقید اگر جگر کے کلام پر یاد کر لی جائے، تو جگر کے ترنم اور لحن کی اہمیت واضح ہو جائے گی، وہ کہتے ہیں "جگر میں ایک زبردست صلاحیت یہ ہے، کہ وہ چند سطحی تاثرات اور ظاہری خصوصیات میں ہم کو مبہوت کر لیتے ہیں، اور گہرائیوں میں جانے سے باز رکھتے ہیں۔"

بالفاظ دیگر جگر کو جگر بنانے میں ان کی آواز ان کے لحن اور ان کے ترنم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

حافظ محمد الیاس

غزل

تدبیر اپنی کوئی ہوئی کارگر کہاں
دار المحن میں رنج و محن سے مفر کہاں

اپنا سر نیاز کہاں اُن کا در کہاں
اتنی بلندیوں پہ ہمارا گذر کہاں

احساس بھی ہے بار اب اپنے وجود کا
لے آئی مجھکو جانے تیری رہ گذر کہاں

اک درد مستقل ہیں میری تیرہ بختیاں
اس رات کے نصیب میں نورِ سحر کہاں

ہم رہروانِ شوق تو ہیں محوِ جستجو
گم ہو گیا ہے جانئے خود راہبر کہاں

سرمایۂ حیات بھی بے برگ و بار ہے
اپنی دعا کے پاس متاعِ اثر کہاں

الیاس میں ہوں اور غمِ دل کی شدتیں
روداد دل پہ فرصتِ نقد و نظر کہاں

شہاب، ایم، اے

★

مزاحیہ افسانہ

"کہتے ہیں جس کو عشق ..."

آج بھی لکھنؤ کی شام کم جاذب نظر نہیں تھی۔ لیکن مجھے تو فضا ایک گنجی عورت کی سی بدصورت معلوم ہو رہی تھی، درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ لیکن مجھے اپنے طیش اور ناامیدی میں معلوم ہو رہا تھا، جیسے یہ سب اُلّو بول رہے ہیں۔ چاند نکلا تھا، لیکن پیلا پیلا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک ایسا تپڑ رسید کروں کہ منہ لال ہو جائے تاروں کو بقول مجاز کے جی چاہتا تھا کہ نوچ کر ہی نہیں، بلکہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں۔ تاکہ پھر کبھی نکلنے والی گستاخی نہ کریں۔ غرض میں خفا تھا۔ اور بہت خفا تھا۔ خود سے، شہنا سے، اور ساری دنیا سے اور خصوصاً اس مرتق قسم کے چشتی گدھے پروفیسر زیدی سے، جو ناک پر عینک جمائے پہلے تو کلاس میں اپنے اشعار سے سمجھدار قسم کے دوستوں کو بور کیا کرتا تھا، اور اب اردو میں فرسٹ کلاس 'ایم' اے کر کے ہمارے ہی کلیجہ پر مونگ دلنے کے لئے یونیورسٹی میں لکچرار ہو گیا تھا۔ اور جس کم بخت نے فضا سے ساری رومانیت چھین لی تھی۔ اس گاؤدی قسم کے انسان نے جس کو مجھ جیسا آدمی کبھی گنتی میں نہ لاتا تھا۔ میرے سنیما کے پروگرام کو چوپٹ کر دیا تھا وہ شہنا کو ——— جی ——— میری منگیتر کو لئے اُڑا تھا۔ حرام خور نے نہ معلوم کیا جادو کیا تھا کہ اس کے آتے ہی شہنا جیسے امتحانات ختم ہوتے ہی بدل سی گئی تھی۔ جب دیکھئے، اس کمبخت کی تھوک لگی ہوئی انگلیوں سے پاکٹ بک کے ورق اُلٹے جا رہے ہیں" اور وہ نہ معلوم کیا کیا خرافات سُنا رہا ہے۔ اور آپ محو ہیں، سُن رہی ہیں۔ شروع شروع میں تو ٹال دیا۔ کہ بھئی وقتی خبط ہوگا، فرسٹ ائیر فول جو ٹھہری۔ پروفیسر کے رُعب میں آگئی ہے۔ لیکن نہیں صاحب کافی ہاؤس میں اس کے ساتھ کامن روم سے غائب ہیں لان پر شاعری کی قسمت پر زیدی صاحب مرثیہ کہہ رہے ہیں اور وہ فاتحہ پڑھ رہی ہیں۔ لہذا ایک دن احتجاج کیا۔ کہ ہمیں یہ سب نہیں پسند۔ جواب ملا۔ "آپ نہیں سمجھتے، بی، اے کرنے بی اے سے جب 'ایم' اے میں آئیے گا تو سمجھ جائیے گا۔" ہم نے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا گول ہو جاؤ۔ عارضی جوش ہے اُتر جائے گا۔ لہذا ہم بھی سچ مچ گول ہو گئے۔ لیکن صاحب آج حد کر دی تھی۔ اس چھوکری شہنا نے۔ یعنی ان کا مجھ سے نو بجے پکچر جانے کا پروگرام تھا۔ چچا سے اجازت لی جا چکی تھی۔ کہ اُن کی صاحبزادی کو ان کے ہونے والے مجازی خدا سنیما لے جا رہے ہیں، جو بارہا ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ ابھی ہم لوگوں کی نسبت کا گو یا صرف بڑے بوڑھوں کو علم تھا۔ اور ہم بھی جانتے ہوئے انجان تھے ہمیں شہنا بقاعدہ ابھی تک بھائی جان کہتی تھی۔ تو جناب آج ہم سنیما جا رہے تھے۔ اور ٹکٹ وغیرہ کا انتظام میں نے اس مہینے کی آخری تاریخوں میں کس طرح کیا تھا یہ میرا دل جانتا ہے لیکن توبہ کیجئے، من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال والا معاملہ، اتنے

سنگین طریقے پر پیش آیا ہے۔ کہ منہ کھلا رہ گیا۔ تعجب سے، کومن روم میں ٹیبل ٹینس کھیلیں کر الگ ہوا ہی تھا۔ کہ جیسے بجلی چمکی، اور شہنا نے عرض کیا:-

"کدھر کا چاند نکل آیا آج۔"

"مذاق نہ کریئے" فرمایا۔ "مجھے بہت جلدی ہے، زیدی صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا ہے، ذرا شعر تگڑے کہنے لگیں گے، انتظار، شاعری کے لئے مفید ہے۔" تیور پر بل ڈال کر فرمایا۔

"دیکھئے بھئی ہمیں فرصت نہیں ہے۔ میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میں آج سینما نہیں جا سکوں گی۔"

"بہت اچھا۔" ہم نے اطمینان سے کہا "نہ جائیے' دو لیکچر۔ بس جرمانے کے طور پر آپ کے ذمہ لکھدی جائیگی۔"

"آپ سنتے کیوں نہیں۔" آنکھیں سنجیدہ کر کے فرمایا "مجھے زیدی صاحب کی غزل سننے مشاعرے میں جانا پڑے گا۔" اب جو میرا منہ کھلا ہے تو بند ہونے میں نہیں آتا۔ جبڑا جیسے جم گیا یعنی یہ کمبخت ——— میرا سینما کا پروگرام ——— اور ——— اس مردود کے ذوقِ سلیم کو منہ چڑھاتے ہوئے اشعار ——— لاحول ولا قوۃ یقین نہیں آتا تھا۔ منہ کھلا کا کھلا تھا۔ بڑی مشکل سے غرارہ کرنے کے انداز سے ہم نے فرمایا۔

"لیکن ——— سینما"

"وہ کل بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آج گول کر دیئے نہیں تو زیدی صاحب کی دل شکنی ہوگی۔"

"اسی قابل ہے وہ مردود۔" میں نے غصے میں بھر کر کہا "ہونے دیجئے دل شکنی اس کی۔ میں اس کی سر شکنی کر دوں گا، اگر اس نے میرے پروگرام کو چوپٹ کیا ———"

"سنئیے تو ———؟" بات کاٹنے کی کوشش کی گئی، لیکن میں واقعی چراغ پا کیا "لالٹین پا" ہو چکا تھا۔

"سنیئے وغیرہ کچھ نہیں" میں نے کہا۔ "آپ سینما چل رہی ہیں' یہ طے ہے۔ آپ کو میری دل شکنی کا بھی خیال کرنا ہے۔ لہٰذا ماریئے گولی اس چشمے والے بیل کو۔ اور ابھی اس کی غزل سن کر چھٹی کیجئے، چلئے میں بھی چلتا ہوں۔"

ان کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ اور میں ایک سانس میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ یکا یک گردن تن گئی۔ ابرو پر بل آگئے۔

"معاف کیجئے گا جمال صاحب، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ ذوقِ سلیم سے اتنی گری ہوئی باتیں کریئے گا۔"

اب میری باری تھی، میں نے کہا۔ "لیکن ———!"

"بس بس، اب آپ کچھ کہنے کی تکلیف گوارہ نہ کیجئے۔" انہوں نے ذرا رُخ بدل کر کہا۔ "میں اپنے پروفیسر اور اتنے عظیم المرتبت ادیب کی شان میں اور کچھ سننا گوارہ نہ کروں گی۔"

"کیوں، شہنا۔" پیچھے سے آواز آئی، جیسے کوئی بھیڑ اپنے بچے کو بُلا رہی ہو۔ "کیا بات ہے بڑی دیر کر دی"

گھر سے تو دیکھا وہ پلنگ کی چوتھی قسم، خدا کی بدترین غلطی جناب پروفیسر زیدی اپنی موٹی عینک کے اوپر سے گردن اٹھائے مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا، کہ شہنا نے جلدی سے زیدی سے کہا۔

"چلئے زیدی صاحب چلیں۔ آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔ آپ کا کلاس ہے، اور ———"

آشیاں لُٹتا رہا ہم ناتواں دیکھا کیے۔

کے مصداق ہم بیوقوفوں کی طرح کومن روم کے طول و عرض میں قیس بیاباں بنے رہے۔ اور وہ بکری نما انسان میری منگیتر کو بخوشی خاطر اپنے ساتھ لئے کومن روم کے دروازے کے افق پر غروب ہو گیا۔

لعنت ہو اس پر۔ حمید نے پوچھا کیا ہے۔ میں نے کہا تمہارا سر ——— اور اس مختصر مکالمے کے بعد کامن روم جیسے ہمیں کاٹنے لگا۔ اور نکلے جو تو سائیکل اٹھائی۔ تو حسرت گنج پہونچ کر دم لیا۔

اب یہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور فضا، آسمان، چاند، تارے اور سب کے بعد امتیازی طور پر موٹی موٹی گالیاں خاص سرِ مبارک زیدی پر نازل کر رہے ہیں۔ غرض صاحب، بڑی کوفت اور بڑا کرب اور شرمندگی بھی ــــــ چھ فٹ کے ایک آدمی سے جو یونیورسیٹی میں تین کھیلوں، ہاکی، فٹ بال، کرکٹ میں بلیزر رکھتا ہو۔ ٹینس کا کپتان ہو۔ بیڈمنٹن بھی خاصہ کھیل لیتا ہو، باکسنگ سے بھی شغل رکھتا ہو۔ اس کی منگیتر کو ایک مرنجی بیل نما چشمیٔ انسان جس کی کوئی کل سیدھی نہ ہو یوں صفاً اڑا لے جانتے، اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ لہذا پہلے طے کیا کہ گردن توڑ دو۔ اس کمبخت کی مشاعرہ ختم ہوتے ہی۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ نہیں۔ اس مشاعرے میں اُسے بیوقوف بنایا جائے۔ کافی ہاؤس میں وحید کو ڈھونڈا۔ اس نے پتہ تو بتا دیا۔ کہ مشاعرہ نخاس میں ایک نواب چھوٹے صاحب کے مکان پر ہے۔ لیکن خود اس امتحان سے میری دوستی کے سو واسطوں کے باوجود انکار کر دیا۔ خیر ہم ہی چلے۔ وہاں پہنچے تو روح سلب ہو گئی ایک سے ایک جفا دری صفت زیدی منش نظر آیا۔ صورت سیرت لباس، سب سے شاعر۔ اکیلے شرارت بھی نہیں کی جاتی۔ لہذا چپکے بیٹھے ستمہا کو بالکونی پر سے خواتین کے جھرمٹ میں زیدی صاحب کی معتقدانہ نگاہوں سے پرستش کرکے چھوڑ کر جو بھاگے، تو تیر پر آکر دم لیا، کہ گولی مارو ایسے عشق کو کل دیکھا جائے گا

(۲)

صبح اٹھے تو زندگی میں پہلی مرتبہ بستر پر پڑے رہنے کو جی چاہا۔ خیر اٹھ کر کثرت کی، نہائے، چائے پی۔ لیکن کوفت اپنی جگہ پر تھی۔ سائیکل اٹھائی۔ حضرت گنج، امین آباد، حسین آباد کے چکر کاٹ ڈالے لیکن طبیعت عجیب گری گری سی تھی۔ دل میں سوچا کہ یار عشق ہو گیا ہے۔ اب فکر ہوئی کہ کسی تجربہ کار سے مشورہ لیا جائے، خیال آیا کہ وحید کو معلوم ہے کہ میری شادی شہنا سے ہونے والی ہے، لہذا اسی سے مشورہ کیا جائے، تجربہ کار بھی ہے، شاید کچھ داؤ پیچ بتائے

غرض پھر سائیکل کے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ ہٹا کٹا "مجنوں" چلا "ہمدم و ہمراز" کے پاس وحید نے صبح صبح نازل ہوتے دیکھ کر چائے پیتے پیتے پیالی چھوڑ نعرہ مارا۔ "یا وحشت۔ جمال" کمبخت رکا بھی نہیں اور بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ "یار یہ بھی زیادتی ہے، تو صبح کی ہوا کھا کھا کر موٹا اور حفظانِ صحت کا اشتہار ہو رہا ہے، تو دوسروں کو تو چین سے دن کاٹنے دے، یہ اس وقت نازل ہونے کا کون سا تُک ہے۔ میری تو ابھی آنکھ بھی نہیں کھلی"

"یار مذاق نہ کرو" ہم نے رونی صورت بنا کر "ہمیں عشق ہو گیا ہے"

"جلاب لے لو۔" آپ نے اطمینان سے فرمایا۔

"جلاب؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا بکتے ہو" اب اتنا بھی اناڑی نہیں ہوں۔ کہ یہ نہ سمجھوں کہ عشق جلاب سے کبھی نہیں اترتا، اور نہ جلاب سے تسکین ہوتی ہے۔

"جی ــ ہاں ــ" آپ نے زور دے کر کہا۔ "جلاب لے لو۔ عشق وشق کچھ نہیں ہوا تمہیں۔ پیٹ میں گرمی ہو گئی ہے، تم ایسے ہاتھی کو عشق وغیرہ جیسی ریشمی بیماریاں نہیں ہوتیں اور ہاں مجھ سے تو کہا۔ لیکن اب اور کسی سے نہ کہنا۔ ورنہ بیٹا، شہنا بھابی، وہ خبر لے گی، گردن کو تارے نظر آجائیں گے۔ یہ عشق کا کاروبار ہم پر چھوڑ دو۔ ہم اس کے سول ایجنٹ ہیں۔"

ہمیں واقعی اپنے اس جگری دوست کی اس بے وقت غداری پر بہت غصہ آیا۔ لیکن ضبط کرکے کہا۔

"مذاق نہ کرو۔ مجھے واقعی عشق ہو گیا ہے، اور تمہاری شہنا بھابی سے ہی ہوا۔"

"تب تو اور خوشی کی بات ہے۔" وحید کمبخت نے پھر زخموں پر نمک چھڑکا۔ "اول تو میں اس کا قائل ہی نہیں تم ایسا، تنتے لطیف سے کورا انسان عشق کر سکتا ہے، اور اگر عشق ہوا بھی ہے، تو شہنا بھابی سے جو بلا شرکتِ غیرے تمہاری ملکیت ہیں۔ لہذا عشق ہونے سے پہلے کامیاب ہو گئی محبت تمہاری" ایک ٹھنڈی

سانس بھر کر۔ "ہائے کاش میری بھی اسی طرح میرے لئے بُک ہو چکی ہوتی۔ بڑے خوش قسمت ہو یار۔" اور ایک زبردست آہ کے ساتھ ٹھنڈی چائے چڑھالی۔

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے جل کر کہا۔ "میں جو کہنے آیا ہوں وہ سُنتا نہیں، اپنی ہانکے جاتا ہے۔ کمبخت اسی کا تو رونا ہے۔ تری شہنا بھابھی سے مجھے اس وقت عشق ہوا ہے، جب بلا شرکت غیرے والا معاملہ ڈانوا ڈول ہو گیا ہے۔

"کیا مطلب۔" اب ذرا چونکے وحید صاحب۔

میں نے بہ حسرت و یاس سارا قصہ کہہ سُنایا۔ وحید کا بھی منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ تعجب سے۔

"یعنی وہ ..... یعنی کہ زیدی۔ وہ کمبخت چمر دل، بیوقوف گاؤدی احمق کی دُم۔" وحید نے میرے مسرت کے پیمانے کو لبریز کرنے ہوئے زیدی کو یہ سب گالیاں ایک ہی سانس میں دے ڈالیں "یار تجھے دھوکا ہوا ہے۔ شہنا بھابھی کبھی ایسی بدذوق نہیں ہو سکتی، تو بھی کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ لیکن تیرے مقابلہ میں زیدی ـــ ناممکن"

"خدا کی قسم۔" میں نے بضد ہو کر کہا۔ "مجھے کل نو بجے کا شو پکچر زیدی صاحب کی وجہ سے گول کرنا پڑا۔ وہ کمبخت اسے شالیمار میں لے گیا۔"

"تب تو یار معاملہ سنگین ہے۔" وحید نے سنجیدہ ہو کر کہا "میری نے بھی میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا۔ ٹھیرو سوچنے دو۔"

یہ کہہ کر وحید تو سگریٹ کے کش اڑانے لگا۔ اور نگاہ بڑے عالمانہ انداز سے ایک ٹوٹے ہوئے فریم میں ایک کالی سی اینگلو انڈین لڑکی کی تصویر پر جمادی۔ اور میں کچھ کرنے کے لئے چائے بنانے لگا۔

"مل گیا۔" وحید یکایک چلایا۔ اور میں جو اُچھلا تو آدھی چائے طشتری میں آرہی۔ "تیری مشکل کا حل مل گیا۔ تو شاعری کر۔" "ہائیں" میں نے بھونچکا ہو کر کہا۔ "شاعری ـــــ یعنی میں؟"

"قطعی" وحید نے فیصلہ صادر کرنے کے انداز سے کہا ـــ

ـــــ "اس کو اس کے ہی ہتھیار سے شکست دو، شعر میں کہہ دیا کروں گا۔"

"لیکن شاعری سے صرف کام نہیں چلے گا۔" میں نے ایک پوائنٹ نکالا۔ "زیدی تو گھنٹوں اس سے رومانی باتیں کیا کرتا ہے، وہ بھی کیا تم سکھایا کرو گے۔"

"نا بابا" وحید نے کہا۔ "میری کے ساتھ ہی میرا اسٹاک کام نہیں کرتا۔ میں تجھے کیا بتاؤں گا۔ ایک کام کر تو زہر عشق اور لیلیٰ مجنوں کے ڈرامے لے آ۔ اور ست قلندر وغیرہ میں سے کچھ عاشقانہ رسالے پڑھ لے۔ پھر دیوان داغ، دیوان غالب، وغیرہ سے چند اشعار یاد کر لے، اور موقعہ بے موقعہ ٹھونس دیا کرو۔ عاشقانہ افسانوں سے تجھے عاشقانہ باتیں کرنا آجائے گا۔ اور تو سو فیصدی عاشق بن جائے گا۔ کیوں بچا کیسی کہی۔"

"لیکن یار یہ سب مجھ سے ہو گا؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہو گا کیسے نہیں۔" وحید نے باوثوق انداز میں کہا۔ "میں خود تجھے ٹرین کروں گا۔ آخر تو باکسنگ کی بھی تو ٹریننگ لیتا ہے، سمجھ تجھے زیدی سے اس کے اکھاڑے میں لڑنے کے لئے کثرت کرنا ہے، بس"

"اچھا کل سے سہی۔" ہم بھی سر سے کفن باندھ کر تیار ہو گئے۔

(۳)

اور دوسرے دن پندرہ روز کے لئے کالج بند ہو گیا۔ کہ کھلنے پر امتحانات نتیجے سنائے جائیں گے، اور ہم اپنے نئے فن میں جیسے ڈوب گئے۔ غزلیں رٹی جانے لگیں۔ عاشقانہ سین حفظ کئے جانے لگے۔ رومانی نگاہوں کی پریکٹس ہونے لگی۔ مناسب موقعوں کے لئے مناسب اشعار فٹ کئے جانے لگے۔ غرض وحید نے سچ مچ جیسے ہمیں سچا خالص عاشق بنانے کی قسم کھالی، صحت گر گئی۔ کثرت کو منع کر دیا گیا۔ کہ عاشق کا نحیف و زار ہونا شرط ہے بغیر پاور کی ایک عینک لائی گئی۔ جسے ناک پر رکھ کر چلنے کی مشق کرنا پڑی۔ بال بڑے بڑے دلیپ کمار نما رکھے گئے متعرض ہم ہیرو نمبر ۱

بنائے جانے لگے۔

اُدھر شہنا کافی ہاؤس میں زیدی کے ساتھ، سنیما میں زیدی کے ساتھ، پارکوں میں زیدی کے ساتھ، پکنک میں زیدی کے ساتھ، غرض زیدی کا سایہ بن کر رہ گئی۔ اور ادھر وحید کا قطعی حکم کہ بالکل شہنا کے سامنے نہ جانا۔ اس کے گھر پر بھی نہ جانا، کہ سامنا نہ ہو جائے۔ خیر صاحب پندرہ دن دوستوں سے چھپ کر شہنا سے چھپ کر عاشق بننے کی مشق ہوئی۔ اور پندرھویں دن ہمارے استادِ محترم نے فرمایا۔ کہ اب ہم زیدی سے مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ لہذا اس معرکہ کا افتتاح نتیجہ کے دن کیا جائے، جب کالج کھلے گا۔

خیر صاحب وہ گھڑی بھی آن پہنچی۔ ہم کالج گئے، دوستوں نے ہمیں دیکھا، کوشش کر کے پہچانا، اور چپکے سے ہاتھ ملا کر "کٹ" گئے ہمیں کوفت تو ہوئی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ مجنوں نے پتھر کھائے تھے چپ رہے۔ بورڈ پر جا کر نتیجہ دیکھا، تو واجبی واجبی تھا شاید ٹیچروں نے ہمارے حال زار پر رحم فرما کر ہمیں تھرڈ میں پاس کر دیا تھا۔ شہنا اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ حالانکہ اردو اس کی بڑی کمزور تھی۔ کیونکہ وہ انگلش اسکول سے جونیر کیمبرج کر کے آئی تھی۔ اور یقین تھا کہ مادری زبان میں ضرور لڑھکے گی۔ ہم ابھی اس معجزے پر غور کر ہی رہے تھے، کہ پیچھے سے آواز آئی "معاف کیجئے گا۔" شہنا ـــــــ میں مڑا۔ اس نے سری طور پر نظر دوڑائی۔

"شہنا!" میں نے گھٹی ہوئی آواز سے کہا۔

"ارے" اس کا منہ ایکبارگی تعجب سے کھل گیا۔ "آپ ـــ کیوں بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں" ہم نے مسکین سی صورت بنا کر کہا: ـــ

"ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

"جی" ـــــــ وہ تعجب سے بولی: "یعنی یہ آپ کو شاعری کا شوق کب سے ہوا۔ اور یہ آپ نے حالت اپنی کیا بنالی ہے' یہ عینک ـــــ "آپ کی آنکھیں کب سے کمزور ہو گئیں۔ کیا بات ہے۔"

"یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔" ہم اپنے آپ کو ایک چند محسوس کرتے ہوئے سنبھالے، "کہیں اکیلے سنسان جگہ چلو تو سنائیں!"

"ہاں ضرور چلئے۔ اس نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔" مجھے بھی آپ سے یہ پوچھنا ہے، کہ آپ غائب کہاں رہے۔"

"میں ذرا دیوان داغ اور غالب کی تشریح لکھ رہا تھا" ہم نے جھوٹ سے کام لیا۔

شہنا نے سنجیدگی سے کہا: "جب ہی شاید آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں" ـــــ

ہم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا۔ اور وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی میرے ساتھ سائیکل اسٹینڈ سے سائیکل لینے چلدی، ہم نے سائیکلیں اٹھائیں۔ اور گومتی کے کنارے نکل گئے واقعی عجیب دلکش سماں تھا۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ افق پر سورج شفق کی رنگینیاں بکھیرتا ہوا غروب ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، یہ سب مناظر دلکش تھے۔ یا میری اور شہنا کی یکجائی۔ لیکن مجھے عجیب سکون سا محسوس ہونے لگا۔ ایسے میں اگر وحید نے شاعری اور عاشقی کی تربیت نہ بھی دی ہوتی تب بھی میں شاید اچھا کردار پیش کرتا۔ لیکن اس محنت اور جانفشانی نے تو کمال کر دیا۔

بیلی گراؤنڈ کے سامنے کشتی پر بیٹھ کر میں نے شہنا سے بہت کچھ کہا۔ اور وہ افق پر نظریں جمائے پُرسکون، شرمائی، لجاتی مسکراہٹ سے سب کچھ سنتی رہی۔ اس کے بعد اس نے کچھ کہا۔ اور میری دنیا جیسے ناچ اٹھی۔ اور میری خوشی کے اثر سے کشتی الٹتے الٹتے بچی۔ اور رومانیت جان بچانے کی دھن میں تھوڑی دیر کے

لئے کافور ہوگئی۔ بہرحال کام ہوچکا تھا۔ اب شہنا تھی اور میں تھا۔ زیدی کا پتا کٹ چکا تھا۔ اور وہ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح اڑتے اڑتے پھرتے تھے۔ اور کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ کا مصداق بنے رہتے تھے، یہاں تک کہ اس کی تیمی پر کبھی کبھی افسوس بھی آتا تھا، لیکن پھر دل کو سخت کر لیتا تھا۔ کہ اسی چیونٹی نے ایک دن مجھ جیسے ہاتھی کو دے ٹپکا تھا۔ لہذا میں تھا، میری شہنا تھی اور رومان کی دلفریب دنیا۔ لیکن وحید اب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا روز نئی ٹریننگ ہوتی تھی۔ پہلے دن کے قصے سنے جاتے تھے، اور دوسرے دن کی تیاری ہوتی تھی۔ میں نے لاکھ کہا۔ کہ میں عاشقی میں گریجوئیٹ ہوگیا ہوں۔ لیکن اس نے یہی کہا ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

غرض روز ہمارے دل کی "اوور ہالنگ" ہوتی رہی۔ اور روز ہم تازہ بہ تازہ اشعار یاد کرتے رہے۔ اور شہنا کو گومتی کے کنارے پارکوں میں، کافی ہاؤس میں سناتے رہے، وہ یہ اشعار دور افق پر نظریں جمائے، یا کافی ہاؤس کی میز پر ایک مکھی کو دم بھگوئے کھسکتے ہوئے دیکھتی رہتی، اور ہمارے بجواس ختم کرنے پر ہمیں بڑے احترام اور خوف سے ملی جلی نظروں سے دیکھتی کبھی کبھی خود بھی شعر و ادب کا کوئی رسالہ دبائے پہونچ جاتی۔ اردو بھی اچھی لکھنے لگی تھی، اور بولنے میں بھی زبان بہت صاف ہوچکی تھی۔ اور "انگریزیت" غائب ہوچکی تھی۔ گھنٹوں شعر و شاعری، رومانیت، اور ادب کے موضوع پر بحث ہوا کرتی۔

وہ کہتی —— "مجھے ذوق کی شاعری سے عشق ہے۔"
میں کہتا —— "مجھے غالب کے اشعار الہام معلوم ہوتے ہیں۔"

وہ کہتی —— "آپ نے شفیق الرحمن کا نیا افسانہ پڑھا؟"
میں کہتا —— "غضب ہے صاحب غضب عجیب و غریب طبیعت

پائی ہے۔" اور مگر اگر اس افسانے کو جبراً و قہراً پڑھتا۔ کیونکہ وحید صاحب ابھی تک پیر تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار تھے

غرض گھنٹوں ایسی ہی باتیں ہوتی رہتیں۔ یہاں تک کہ وہ رومانیت میں کھو جاتی۔ اس کی آنکھیں وفور تخیل سے بھر آجاتیں۔ اور میں پروفیسر زیدی کو ایک کونے میں اکیلا بیٹھے، انگوٹھا چوستے دیکھ کر پھولا نہ سماتا

لیکن ان مشاغل میں میری صحت کے بارہ بج چکے تھے آنکھیں واقعی اکروسی ہوگئی تھیں۔ دماغ ہر وقت چکر کھاتا رہتا تھا۔ اس عاشقی میں بھی زرد ہوگیا تھا۔ اور شہنا بھی زرد ہوگئی تھی۔ لیکن بسنت کی ایک کلی کی طرح، مجھے اس سے لامتناہی محبت ہوگئی بناوٹی نہیں، بلکہ سچی، جی یہ چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے چپ کا بیٹھا دیکھا کروں، اور وہ مجھے۔ صدیاں گذر جائیں، اور ہم سیر زہوں۔ میں کرکٹ کھیلوں۔ ایک چھکا لگاؤں۔ اور وہ تالیاں بجائے میں فٹ بال میں ایک شاٹ کروں۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوجائے۔ میں ٹیبل ٹینس میں ایک بیک ہینڈ کا نقش کروں، اور وہ کرسی سے اچھل پڑے، میں باکسنگ رنگ میں اپنے مخالف کو دس تک گنوادوں، اور شہنا خوشی سے پاگل ہوجائے۔ لیکن ہوتا کیا تھا کہ شاعری ہو رہی ہے۔ غالب اور داغ کی روحیں بلائی جارہی ہیں۔ آزاد اور حکبست کے بھوت ناچ رہے ہیں اور میں ہوں کہ ایک بھولی بھالی لڑکی کو ایک چھوٹے رومان میں پھنسا کر اپنے کو وہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میں نہیں تھا۔ یہ جذبہ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا، کہ مجھے وحید سے نفرت ہوگئی۔ شاعری سے نفرت ہوگئی۔ اور سب سے زیادہ اپنے سے نفرت ہوگئی۔ ہم اب بھی ملتے تھے، لیکن میں ہر مصنوعی جملے کے ساتھ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا تھا۔ ہر شعر کے ساتھ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کونین کی گولی کھا رہا ہوں۔ شاید شہنا بھی میرے مصنوعی لہجے اور بات چیت سے بھانپ گئی تھی، کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ لہذا وہ بھی اب مجھ سے الگ تھلگ رہنے لگی تھی

اور اب وہ بہت کم بولتی تھی۔ میں بجو اس کرتا رہتا تھا۔ اور وہ سُنتی رہتی تھی۔

(۴)

ظاہر ہے کہ یہ حالات زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک طرف شہنا کی محبت اس پر مُصر تھی کہ میں اس سے ساری باتیں کہہ کر فیصلہ اسی پر چھوڑ دوں۔ نتیجہ معلوم ہی تھا کہ کیا ہوگا۔ میرا پتّا کٹ جائے گا۔ اور زیدی کا مُرغا پھر آسمان پر اڑنے لگے گا۔ لیکن اس طرح اگر تھوڑے دن اور یہ ڈھونگ جاری رہا تو اب مجھے خطرہ تھا کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرتے کرتے پاگل ہو جاؤں گا۔

لہذا میں نے وحید سے چپکے ایک دن یہ دل میں ٹھان لی کہ آج فیصلہ کر ہی کے رہوں گا، اور اپنے کو شہنا کے رحم و کرم پر ڈال دوں گا غرض عینک تو اتار کر پھینکی، اور بلیزر پہن کر کالج گیا۔ تو آج پہلی مرتبہ یہ احساس ہُوا کہ لڑکے مجھسے ایسے کتراتے ہیں جیسے کوئی کوڑھ سے کتراتا ہے۔ اس پر غور نہ کرنے پایا تھا کہ دور سے دیکھا شہنا آرہی ہے رنگ زرد، عجیب نڈھال سی۔ مجھے دیکھ کر کترا جانا چاہا۔ لیکن میں نے ایک دوسش پھاند کر اسے جا لیا۔

"چلو کہیں گھوما جائے" میں نے زبردستی ہنس کر کہا۔

"چلئے" اس نے بے دلی سے کہہ دیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ جیسے کہہ رہی ہے کہ میں جانتی ہوں کہ یہ ایک دکھاوا ہے۔

"مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" میں نے دل مضبوط کرکے کہا

"مجھے بھی آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس نے پُر استقلال لہجے میں کہا۔

خیر ہم نے سائیکل اٹھائی۔ اور گومتی کے کنارے پھر ایک بار پہنچے جب ہم گھاس پر بیٹھ گئے، تو میں نے بغیر کسی تمہید کے آنکھیں افق پر گاڑ کر کہنا شروع کیا۔

"شہنا! میں آج ایک جرم کا اقبال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میں نے اتنے دنوں تم کو دھوکا دیا، میں تم سے جھوٹ بولا۔ کہ مجھے شاعری اور ادب سے لگاؤ ہے۔ مجھے رومان انگیز اشعار پسند ہیں اور میں رومانی مناظر کا بھوکا ہوں۔ میں نے یہ سب تمہاری بے پایاں محبت سے مجبور ہو کر کیا۔ اپنے دل سے مجبور ہو کر کیا۔ کیونکہ میں یہ جانتا تھا کہ اگر میں یہ ڈھونگ نہ رچاؤں گا، تو تم کو زیدی کے ہاتھوں گنوا بیٹھوں گا۔ میں نے بہت بڑا قصور کیا ہے۔ لیکن میرے پاس اس کی صرف ایک دلیل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کے بعد مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ اور میں بخوشی تمہیں اس منگنی سے آزاد کرا دوں گا جو تم میں اور مجھ میں بچپن سے ہو چکی ہے۔ تاکہ تم اپنے ذوق کے شخص زیدی سے شادی کرکے خوش رہ سکو۔"

یہ سب میں ایک سانس میں کہہ گیا۔ اور اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید میرے اس محبت کے اظہار کو بھی وہ بناوٹی سمجھ رہی ہے۔ میں نے گھوم کر اسے دیکھا۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا میں نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "اچھا اب میں چلتا ہوں"

"جمال" اس کے منہ سے یکبارگی نکلا۔ اس نے پہلی مرتبہ مجھے صرف نام سے پکارا تھا "صاحب" کا پخشانہ چھوڑ کر۔ "کیا واقعی یہ تمہارا دھوکا تھا۔ یہ سچ مچ تمہاری فطرت نہیں ہے؟"

"ہاں شہنا!" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"شکر خدا کا" اس کے منہ سے نکلا۔ میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی اس کا حسین چہرہ شفق کے رنگ میں رنگ کر قرمزی ہو گیا۔

"تم جانتے ہو میں تم سے کیا کہنے والی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے پر قابو پاکر کہا۔" میں تم سے یہ حتمی طور پر کہہ دینے والی تھی، کہ چونکہ تمہیں شاعری سے عشق معلوم ہوتا ہے، اس لئے میرے جیسی غیر شاعر لڑکی تمہاری شریک حیات نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ پروفیسر زیدی کی شاعری سے تنگ آکر میں نے تمہارے پاس

پناہ لی۔ لیکن تم نے بھی شاعری شروع کر دی۔ ابتدا میں ذرا شرمائی، تو مجھے یہ انداز اظہار محبت اچھا معلوم ہوا۔ اور میں نے بھی کوشش کی کہ تمہارا ساتھ دوں، اور راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے پڑھے، غزلیں یاد کیں، کہ میں تمہارے قابل ہو سکوں۔ لیکن آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا، کہ میں تم سے اپنی ناقابلیت کا اظہار کر دونگی، کہ میں ایسے شوہر کی بیوی بننا نہیں چاہتی، کہ مجھے تو بھوک لگے، اور وہ آلو کی شان میں ایک عدد قصیدہ تصنیف کرنے لگے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ ایسا نہ ہوا۔ اُفوہ " یہ کہہ کر اس پر پھر ہنسی کا ایک زبردست دورہ پڑا بمشکل تمام اسے پیٹھ ٹھونک کر ٹھیک کیا۔ اور ذرا خفا ہو کر کہا۔

" تو یہ کون سی جدت تھی، آپ کی۔ کہ آپ نے زیدی کے ساتھ سائے کی طرح رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک، کہ مشاعرے تک میں پہنچ گئیں۔ جس کی وجہ سے مجھے ایک نیم حکیم قسم کا ماسٹر رکھ کر رومانی بننا سیکھنا پڑا؟"

" ارے غضب " وہ ہنستے ہوئی بولی۔ " زیدی کو تو میں اس لئے تو بنا رہی تھی۔ کہ مجھے اردو میں پاس کے نمبر دے دے اس لئے کہ اردو میں میں بالکل کوری تھی اور پرچہ اس کے ہی پاس تھا۔ خیر تمہارے شاعری خبط سے اتنا تو ہوا کہ میری اردو اچھی ہو گئی

؎ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ " خدا کے واسطے اب عمر بھر کوئی شعر میرے سامنے نہ پڑھنا، ورنہ شادی کے پہلے ہی طلاق دے دوں گا۔ اور شمیما ہنستے ہنستے گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گئی

محمد صدیق صادق سشیر گھالوی

"کسی شخص کا امتحان ہو رہا ہے"

دگرگوں جہاں کا سماں ہو رہا ہے　　قیامت کا ہر دم گماں ہو رہا ہے

کرشمہ تہہِ آسماں ہو رہا ہے　　عجب انقلابِ جہاں ہو رہا ہے

جہاں آدمیت فنا ہو رہی ہے　　وہیں ایک فتنہ جواں ہو رہا ہے

ہماری تباہی کا عالم نہ پوچھو!　　غمِ زندگی بے گراں ہو رہا ہے

تھے ہم مستحق جس کرم کے وہی اب　　نصیبِ دلِ دشمناں ہو رہا ہے

گری ہو گی بجلی نشیمن پہ میرے　　گلستاں میں کچھ کچھ دھواں ہو رہا ہے

غرورِ سرِ کج کلاہانِ عالم　　غبارِ رہِ کارواں ہو رہا ہے

وہی ہو رہا ہے جو مرضی ہے اُن کی　　جو میں چاہتا ہوں کہاں ہو رہا ہے

سنبھالی بتوں نے خدائی جہاں کی　　مسلماں فدائے بتاں ہو رہا ہے

ملی تھی جسے پاسبانی جہاں کی　　وہی آج بے پاسباں ہو رہا ہے

بنائے نشیمن تو رکھ دی ہے صادق
مگر خوفِ برقِ تپاں ہو رہا ہے

جاوید نہال ایم۔اے۔

اس کی بیوی مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ سے اس نے اخبار چھین لیا۔

"میرے ساتھ آئیے"۔ وہ بولی اور کرسی سے اُسے کھینچنے کی کوشش کرنے لگی اور وہ ہنستا ہنستا اپنی بیوی کے ساتھ بالکونی میں چلا گیا۔ اور آمنے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ عجیب دلربا انداز سے مسکرانے لگی "آپ صدمہ برداشت کر سکتے ہیں" اس نے نہایت اطمینان سے پوچھا —— "شاید" اس نے کہا۔

"آپ مجھ پر یقین کریں گے"

"ہاں —"

"واقعی —"

"ہاں —"

"میں ایکٹریس بن چکی ہوں"

یہ سن کر وہ کرسی پر سے اُچھل گیا۔ اور معنی خیز نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

"ایکٹریس —" وہ غصہ میں گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ ڈائرکٹر ڈیسائی نے مجھے ہیروئن کا رول دیا ہے۔ چند مہینوں میں شوٹنگ شروع ہو جائے گی"

وہ اپنے حیرت زدہ شوہر کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی اور پھر کہنا شروع کیا "مسٹر ڈیسائی نے مجھے کئی جگہوں دیکھا۔ اور ہر بار اس کو یہ احساس ہوا کہ میرے اندر ایک عظیم فنکار بننے کی صلاحیت موجود ہے اور جب میرا تعارف ہوا۔ تو اس نے بغیر جھجک مجھ سے اپنی تصویر ..... میں ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے کی درخواست کی اور میں راضی ہو گئی"

وہ اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا" لیکن کل رات تم نے مجھ سے کچھ نہیں بتایا —"

"کل گئے رات آپ تھک سے آئے تھے، اور سو گئے تھے"۔

"مگر سبیتا .... کیا تم مذاق نہیں کر رہی ہو ؟ کیا تم سچ مچ ایکٹریس بننا چاہتی ہو....."

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے سہلاتی ہوئی بولی کیا آپ کو فخر نہیں ہو رہا ہے کہ میں ہندوستان کی ایک عظیم اداکارہ بننے جا رہی ہوں۔؟

"سچ سچ بتاؤ ڈیسائی نے واقعی تمہیں کام کرنے کے لئے کہا ہے..."

"میں آپ کو کنٹریکٹ دکھا سکتی ہوں گزشتہ ہفتہ تو میں نے کنٹریکٹ پر دستخط کئے تھے"۔

"ممکن ہے لیکن تم تصویروں میں کام نہیں کر سکتی ہو، اس نے کہا۔

"آپ کو کوئی اعتراض ہے"۔

وہ اس سوال سے گھبرا گیا، اور بڑی مشکلوں کے بعد وہ بول سکا۔ "یہ تو عام بات ہے، میرا خیال کرو۔ اپنی شادی کا خیال کرو، ابھی ایک سال بھی نہیں بیتا۔ اور تم ایکٹنگ کرنے کا منصوبہ باندھ رہی، جب میں

کام سے تھکا ماندہ گھر آؤں گا تو تم اسٹیڈیو میں ہوں گی۔"

"اور آپ میرا خیال کیجئے کہ جب آپ اپنی فرم کی دیکھ بھال کے لئے جاتے ہیں تو مجھے دن دن بھر آپکے انتظار میں بیقرار رہنا ہوتا ہے۔"

"میں فرم اپنی بیوی کے آرام و آسائش کے لئے جاتا ہوں۔"

"اور میں اسٹیڈیو اپنے شوہر کے لئے کمانے جاؤں گی اور آپ سے بہت زیادہ کماؤں گی۔"

"تم ایک اونچے خاندان سے ہو، تم باعزت خاتون ہو لیکن اسکے باوجود تم فلم میں کام کرنا چاہتی ہو۔"

"اگر میں فلم دیکھ سکتی ہوں تو فلموں میں کام بھی کر سکتی ہوں۔"

"لیکن کیا تم کو غیر مردوں کے ساتھ ایکٹنگ کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوگی؟" اس نے بے چینی اور اضطراب کے عالم میں پوچھا اور اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر حسین سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں کسی شریف آدمی سے بات کروں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ بیوقوف نہ بنائیے۔ یہ میری زندگی کی سب سے دلچسپ بات ہوگی۔ ہم عزت، شہرت اور مقبولیت کے ساتھ سونے کی اینٹیں کمائیں گے، ہماری خوشیاں دو چند ہو جائیں گی اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم ہی میری زندگی اور دل کے مالک رہو گے۔"

اس نے آہستہ سے اس کے رخساروں پر چانٹا رسید کیا اور اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس نے اپنی فرم میں کسی ملازم کو چانٹا رسید کیا ہو۔

... ...

وہ مقررہ وقت پر اسٹیڈیو پہونچا، شام ہو رہی تھی، وہ اپنی کار سے نیچے اترا عالی شان عمارت کو چاروں طرف سے گھورا اور پھر نہایت تیزی سے ساتھ عمارت کے اندر چلا گیا۔

ڈائریکٹر ڈیسائی تک پہونچنے کے لئے اسے کئی بالکونیوں سے گزرنا ہوا۔ اور خاصی لمبی مسافت طے کر کے وہ ڈیسائی کے خاص کمرہ میں آیا۔

"آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی" اس نے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ وہ گول چہرہ کا پستہ قد انسان تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ مگر گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہر لحہ گھومتی رہتی تھیں اور اپنی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے اس کی عظمت کا پتہ چلتا تھا۔

"میں آپ کی کیا خاطر کر سکتا ہوں مسٹر سواستا" اس نے بڑے اخلاق سے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ نے میری بیوی کو اپنی تصویر میں ہیروئن کے رول کی پیشکش کی ہے"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"جی ہاں ——— یہ بالکل درست ہے، میں اس کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

"لیکن مجھے خوشی نہیں، کیوں کہ یہ پیشکش ہماری خوشیوں کو ملیامیٹ کر دے گی۔"

"ممکن ہے" اس نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

"جی ہاں اسی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی فلم ایکٹریس بنے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے، لیکن اس کے ساتھ میری خواہش یہ بھی ہے کہ ہمارے اس کے تعلقات کشیدہ نہ ہوں، اس معاملہ میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے آپ . . . . ."

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

سواستا نے شرمندگی محسوس کی اور اپنی ہتھیلیاں رگڑتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"اگر آپ کو شادی شدہ زندگی کی خوشی کا ذرا بھی خیال ہے تو آپ میری بیوی کو ایکٹریس بننے سے روکئے۔ آپ ہی ایک راستہ ہیں جو ہماری خوشیوں کو بچا سکتا ہے۔ اگر آپ ان سے کہہ دیں کہ فلم کی زیادہ شوٹنگ اس شہر سے باہر ہوگی۔ تو وہ ایکٹریس بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوگی۔"

"لیکن مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

مایوسی کے عالم میں سواستا اس کو دیکھتا رہا۔

"یہ ۱۹۵۴ء کا زمانہ ہے میرے بھولے دوست" ڈیسائی نے دلدار

پر لٹکے ہوئے کلنڈر کو دیکھتے ہوئے کہا: "آپ اپنی بیوی کو آج بھی چار دیواری میں بند رکھنا چاہتے ہیں، آپ اسے اپنی لونڈی بنانا چاہتے ہیں۔ لوگ فلم ایکٹریس سے شادی رچانا اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں اور آپ یہ نہیں چاہتے کہ آپ کی بیوی فلم ایکٹریس بنے۔"

ڈیسائی یہ کہہ کر قہقہہ مار کے ہنسنے لگا۔ سواستا کا سر چکرانے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے ڈیسائی نے اپنی پستول کی ساری گولیاں اس کے سینہ میں اتار دی ہیں، وہ غصہ میں تلملا اٹھا۔

"آپ ہی جیسے لوگ خاندان کا خاندان تباہ کر دیتے ہیں۔"

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی بیوی مستقبل قریب میں عظیم ترین ایکٹریس بن جائے گی۔ آپ اپنی پوری زندگی میں جس قدر روپے کما سکتے ہیں۔ وہ ایک دن میں اتنی رقم حاصل کر سکے گی۔" ڈیسائی نے سابق دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر میں اپنی خوشیاں گنوا کے ایسی دولت کمانا نہیں چاہتا" سواستا نے غصیلے انداز میں کہا۔

"آپ عجیب قدامت پسند انسان ہیں۔"

"میں آپ کی رائے جاننے یہاں نہیں آیا ہوں"

"اور میں آپ کی بات سننا نہیں چاہتا۔"

"میں نے آپ جیسا آدمی کہیں نہیں دیکھا"

"اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابتک نابالغ ہیں۔"

سواستا نے اسے غضبناک نظروں سے تاکا اور گھونسا باندھ لیا۔ غصہ کے مارے اس کے چہرہ پر سرخ لہریں دوڑ گئیں، لیکن وہ بغیر کچھ کہے غصہ کو پیتے ہوئے کمرہ سے چلا گیا اور کمرہ سے ڈیسائی کے قہقہے اس کے کانوں میں سیسے پگھلانے لگے۔

"مجھے تعجب ہے کہ تم اس بد اخلاق ڈائریکٹر کے ماتحت کام کرنے کے لئے کس طرح راضی ہو گئیں؟"

سواستا نے گھر پہنچتے ہی اپنی بیوی سے کہا اور تمام تلخ باتیں بتا دیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں ڈیسائی سے معافی منگوا دوں گی آپ کو کچھ کرنا نہیں ہوگا، آپ میرے لئے کوئی عمدہ فلمی نام چن دیجئے۔"

"گیتا۔ لیکن میں تمہیں ایکٹریس بنتے دیکھنا نہیں چاہتا"

"لیکن ... یہ کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا، اور اس نے نہایت ہی متانت اور گمبھرتا کے ساتھ کہا۔ "مجھے کبھی یہ گمان بھی نہ تھا کہ تم ایکٹریس بننے کی آرزومند ہوگی۔" اور غصہ میں وہ اپنے نچلے ہونٹوں کو دانتوں سے کچلنے لگا۔

"آج کی ہر لڑکی ایکٹریس بننے کا خواب دیکھتی ہے۔"

"لیکن پاکباز لڑکیاں صرف آئیڈیل شوہر کا خواب دیکھتی ہیں۔"

"لیکن میرا یہ خواب تو پورا ہو چکا ہے" اس کی بیوی پورے نسائی انداز سے بولی اور سواستا کا چہرہ مارے خوشی کے دمک اٹھا۔

"میں آپ کی ناپسندیدگی کی وجہ خوب جانتی ہوں آپ کے دل میں جلن پیدا ہو رہی ہے" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے غیروں کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے، دوسروں کے ساتھ رومانی ایکٹینگ کرتے دیکھنا نہیں چاہتے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے دل میں میرے خلاف شکوک کا طوفان اٹھ رہا ہے"

سواستا خاموش رہا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح مر گئی ہو۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ اور وہ یوں ہی خلاؤں میں گھورتا رہا۔

"ایشور کے لئے آپ اپنے دل سے شبہ نکال دیجئے، آپ کو میری قسم ہے۔"

"جب تم دوسروں کے ساتھ سیٹ پر معاشقے لڑا رہی ہوں گی تو میں گھر میں بیٹھا تارے گن رہا ہوں گا۔ میں ایسی بات ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔ یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔"

"میں دو چار فلموں میں ہی کام کروں گی۔"

"مگر مجھے اس کی ضمانت کہاں ملے گی کہ تم میرے ہاتھ سے نہیں نکل جاؤ گی۔"

"کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے ---؟"

"ایسے معاملہ میں تو مجھ کو بھگوان پر بھی اعتماد نہیں"

"لیکن آپ گھبراتے کیوں ہیں! میری فکر کیوں ہے! میں بیاہتا عورت ہوں، میں کنواری نہیں کہ بہک جاؤں گی۔"

"جب ایک کنواری لڑکی ایکٹریس بنتی ہے تو اسے اپنے کردار کی خود فکر ہوتی ہے، لیکن جب شادی شدہ عورت ایکٹریس بن جاتی ہے تو اس کے شوہر کو اس کی فکر ہوتی ہے۔ تم فلم ایکٹروں کو نہیں جانتی، یہ ایکٹریسوں کو گمراہ کرتے ہیں، ان کی زندگی سے کھیلتے ہیں سبیتا۔"

"مگر فرض کیجئے کہ جس فلم میں کام کرتی ہوں، اس فلم کا ہیرو شادی شدہ ہو، پھر تو آپ کو کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوگا۔"

"پھر تو وہ اور بھی خطرناک ہوگا۔"

"میں اب سمجھ گئی کہ آپ مجھے ایکٹریس دیکھنا نہیں چاہتے۔ آپ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے! گول مول بات سے کیا فائدہ۔ بزدلوں کی طرح آپ مجھ پر کیچڑ اچھالتے ہیں! دنیا میں صرف آپ ہی پاکباز اور پارسا رہ گئے ہیں۔ اور آپ مجھ سے اب جھوٹی محبت مت جتائیے۔"

وہ غصہ میں بولتی گئی، اور پھر سسکیاں بھر بھر کے روتی ہوئی چلی گئی اور کوپے میں دھنس گئی، گئے رات تک اس کی مایوس سسکیاں فضا میں منتشر ہوتی رہیں۔

سدا ستا۔ بیوقوف کی طرح خلا میں گھورتا رہا۔ اسے اپنی حالت پر ترس آ رہا تھا، وہ اچھی طرح جان رہا تھا کہ اس کی بیوی بڑی ضدی ہے، اور اب اس کی زندگی نئے موڑ میں داخل ہو رہی ہے وہ چپ چاپ اٹھا اور اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور تمام رات ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا

صبح کے وقت دونوں چپ چاپ رہے کسی نے بھی کسی سے بات نہیں کی، وہ اسے دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ شوہر نہیں بدمعاش اور غنڈہ ہے، جو سبیتا کو اغوا کر کے لایا ہو، ان کی شادی کے بعد پہلی بار ان کے درمیان اس قدر سنگین جھگڑا ہوا تھا۔ اور اسے ایسا احساس ہوا جیسے بربادی کا زہر اس کے سارے جسم میں آہستہ آہستہ رچتا جا رہا ہو

اور اس کے ذہن کی چلمن پر سبیتا ایکٹریس کی شکل میں نمودار ہوئی اپلی سبیتا اور نئی سبیتا میں کس قدر فرق آ گیا تھا، اس کے چہرہ پر اس نے خوشی کے ننھے ننھے چراغ جلتے ہوئے دیکھے اسکی چال ہوشربا معلوم ہوئی اور اس کی ہر ادا قاتل۔۔! اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی فلم میں حسین ترین ہیروئن کو دیکھ رہا ہے۔

اتوار کا دن تھا، اور وہ بیٹھا خاموشی سے گورکی کی ماں پڑھ رہا تھا۔ ہر جگہ دلکش سکوت طاری تھا۔ اس نے کتاب بند کر دی اور اپنی بیوی کو ایکٹریس کے روپ میں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے حسین اور دلکش مناظر ابھرتے مٹتے ابھرتے گئے اور وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ ان کی بیوی ہنستی مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"اب آپکو مجھے ایکٹریس بننے کی اجازت دینا ہوگی۔"

وہ اس کے اچانک سوال سے گھبرا گیا۔ اور وہ عجیب دلربا انداز سے مسکرائی گئی۔

"ڈیسائی ذہین آدمی ہے، اسی وجہ سے وہ ہندستان کا سب سے بڑا اڈائریکٹر گنا جاتا ہے" وہ زور سے بولی اور اس کے دل و دماغ پر خوف غالب آتا جا رہا تھا۔

"آپ پریشان مت ہو جیئے، ڈیسائی نے اپنی فلم میں آپکو ایک رول دینے کی پیشکش کی ہے اور اسی فلم کی ہیروئن میں ہوں گی۔"

اور اسے اس نے ایسی تیکھی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ چند لمحوں کے لئے کانپ گئی، اسے یوں محسوس ہوا جیسے سبیتا نے ناقابل معافی گناہ کیا ہے۔

"کیا ڈیسائی کو آپ نے مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں چند لمحوں پہلے اس نے فون پر بتایا کہ آپ کی ظاہری

ایکٹنگ سے وہ بے حد متاثر ہوئے، اور جس غصہ کے انداز میں آپ اس کے کمرہ سے نکلے، وہ انداز ایک عظیم اداکار بنا دینے کے لئے کافی ہے"

سوامی سنتا غصہ میں تلملاتا رہا۔ لیکن پتھر کے بت کی طرح خاموش رہا۔

"آپ مجھ پر یقین کریں، آپ بڑے اچھے اداکار بن سکتے ہیں، جب ہم دونوں ایک ہی تصویر میں کام کریں گے تو یہ کتنی دلچسپ بات ہوگی"

وہ خواب میں جیسے بولتی گئی۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور اپنی کرسی میں ڈوب گیا اور اپنی بیوی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"یہ خبر سن کے اس کے دل میں مایوسی کا ہجوم اُٹھ آیا تھا، لیکن اس ہجوم میں خوشی کی ان جانی سی لہر بھی ابل پڑی تھی اور وہ ایکٹر بننے کے خیال سے لاشعوری طور پر جھوم رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا "سچ سچ میں ایکٹر بن سکتا ہوں؟ کیا میری شکل ایکٹروں جیسی ہے؟" یہی خیالات اس کے دل میں تلاطم برپا کر رہے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ جو امید و بیم کے درمیان کھڑی اس کے آخری فیصلہ کے سننے کی منتظر تھی لیکن بہت دیر تک ذہنی کش مکش کے بعد وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر ایک بار سبیتا ایکٹرس بن گئی تو اس کی ساری زندگی آنسو کے سیلاب میں بہتی رہے گی، اس کی خوشیاں ہمیشہ کے لئے مر جائیں گی اور سبیتا کو وہ ہمیشہ کے لئے کھو دے گا؟"

"سبیتا کو دیکھتا گیا۔ اس کا دماغ گویا بیٹھا جا رہا تھا، وہ ابتک کچھ فیصلہ نہ کر سکا تھا، وہ پاگل ہو گیا تھا۔

"آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ اس کی بیوی نے اس کو جھنجھوڑ دیا۔

"اس کے خیالات کے تار بکھر گئے، "یہ فلم کیسی ہوگی؟" اس نے بے اختیاری کے عالم میں پوچھ لیا۔

"ٹریجیڈی ہوگی۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ یہ تصویر غربت کی، کسانوں کی، مزدوروں کی یا پھر—"

"نہیں ایک کنواری لڑکی سے متعلق ہوگی، جو اغوا کر لی گئی ہو۔" اور سبیتا کے چہرہ پر حیا کی بیشمار لکیریں تن گئیں۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے چہرہ پر تاریکی پھیل گئی۔ لیکن پھر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا اور سبیتا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"فلم کی شوٹنگ کب شروع ہوگی۔؟"

"پانچ مہینے بعد۔"

اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور سبیتا بھی مسکرا پڑی۔

اور پھر اچانک وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگا۔ اور اس کے قہقہے فضا میں گونجتے گئے، تیز ہوتے گئے۔ اور سبیتا اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

"بات کیا ہے؟" اس نے گھبرا کے پوچھا۔

وہ کچھ نہ بول سکا، اور قہقہے بالکونی سے اتر کر سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاروں کے شور و غوغے میں ڈوبتے گئے۔

"آپ پاگل تو نہیں ہو گئے"، وہ غصہ میں بوکھلا گئی۔

"کیا کہا تم نے۔ ہاں شوٹنگ کب شروع ہوتی ہے؟"

"پانچ ماہ بعد" یعنی ستمبر میں۔ وہ آہستگی کے ساتھ بولی۔

"ستمبر" وہ گمبھیر بن گیا۔ جان عزیز تم بھول گئیں کیا۔ کہ اکتوبر میں تم ایک نئی تخلیق.... یعنی تو ماں بننے والی ہے۔"

"وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسنے لگا اور سبیتا دور آسمان کے خلاؤں میں نا امیدوں کی تصویریں دیکھنے لگیں۔ جو آہستہ آہستہ اس کے سارے وجود پر محیط ہو گئیں۔" ———— (پلاٹ ماخوذ)

جُرم محمد آبادی

علامہ حضرت آرزو لکھنوی مرحوم کی اصلاحیں

میں نے وقتاً فوقتاً نظام ہفتہ وار کلکتہ میں (جو بمبئی سے بھی شائع ہوتا رہا)، استاذی علامہ حضرت آرزو لکھنوی کی اصلاحیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، اور نہایت جانفشانی سے تقریباً دو ہزار اصلاحیں جمع کی ہیں۔ شاگردوں کے علاوہ موصوف کے معاصرین نے جو استفادہ حاصل کیا ہے، اس کی فہرست بھی بہت طولانی ہے۔ اس ضمن میں جناب فراق گورکھپوری کی ایک روایت نقل کر رہا ہوں۔ مرزا فہیم گورکھپوری جو نہایت محتاط شاعر تھے سندیلہ کے مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ چونکہ مشاعرہ میں ہندستان کے تقریباً تمام اساتذہ شریک تھے، لہٰذا فہیم صاحب نے مناسب سمجھا کہ غزل علامہ آرزو کو سنالیں، لہٰذا حاضر خدمت ہوکر غزل سنائی جب مندرجہ ذیل شعر پر پہونچے، تو آرزو صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اس میں ذرا ترمیم کرلیں۔ اصل شعر یہ تھا ؎

مصرع ۱۔ چلن سیکھا تو اس نے تیری زلفوں کی درازی کا

اصلاح۔ چلن سیکھا تو سیکھا " " " "

مصرع ۲ نہ آیا شام فرقت کو ہماری مختصر ہونا

اصلاح " " " " " "

مصلح وقت اصلاح دماغ اصلاح طلب کا کن کن زاویئے سے جائزہ لیتا ہے۔ بکمی فکر کے باوجود کہاں کہاں سے اصلاح کا گوشہ پیدا کرتا ہے۔ یہی چیز قابل دید ہے۔ جس کی بابت کہا گیا ہے کہ جائے استاد خالیست اس مختصر تمہید کے بعد نمونے اصلاح کے پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیے۔

جناب نواب دہلوی

مصرع ۱:۔ مزے دیدار کے لیتی ہوئی یہ جاں نکلتی ہے

اصلاح، " " " آجاتے ہیں حسرت " "

مصرع ۲ وہ خنجر آزماتے ہیں مری قسمت بدلتی ہے

اصلاح " " " " " "

بہ فرض محال اگر دیدار کی لذت حاصل کرتے ہوئے جان نکل جائے تو قسمت کہاں بدلی، مرنے کے بعد تو قصہ ہی پاک ہے، یہ بڑا عیب تھا جس کو اصلاح نے سنوار دیا اور "یہ جان" کا سقم بھی دور ہوگیا۔ ؎ اصل شعر ....

مصرع ۱:۔ پھنسایا پھر تیری میٹھی نظر نے مجھ کو مشکل میں

اصلاح:۔ " " " " "

مصرع ۲:۔ تمنائیں وہ جی اٹھیں جو مردہ تھیں مرے دل میں

اصلاح:۔ ادھم کرنے کو مردہ آرزوئیں جی اٹھیں دل میں

اصلاح نے بیان کے الجھاؤ کو سلجھاتے ہوئے شعر میں ایک لفظ ادھم کا اضافہ کرکے شعریت کے حسن کو دوبالا کردیا ہے

اصل شعر ؎

مصرع ۱:۔ منہ چھپا لیے عبث چار نگاہیں کر کے

اصلاح:۔ " " " " " "

مصرع، دعوتِ دید ہے اس طرح سے پردا کرنا
اصلاح، 〃 〃 〃 〃 〃 کا 〃 〃

طرح کے بعد سے عیب تھا، اصلاح نے یہ عیب دور کر دیا۔

اصل شعر ؎
مصرع ؎ بجلی کا چمکنا ہو کہ کوندے کا لپکنا
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
مصرع ؎ کچھ بھی ہو مگر تیری ادا دیکھ رہا ہوں
اصلاح ؎ سب میں تری شوخی کی 〃 〃 〃

اصلاح نے خیال کو اُجاگر کر دیا۔

اصل شعر ؎
مصرع ؎ خدا معلوم منزل ہو نہ ہو اور ہو تو کس جا ہو
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃
مصرع ؎ دل دیوانہ بن بیٹھا ہے اپنا راہبر اپنا
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 خود ہی 〃 〃

ترمیم نے نقص کو بھی دور کیا ہے، اور دل دیوانہ پر بھی روشنی ڈالی۔ کیونکہ دل دیوانہ جب خود ہی اپنا راہبر بن بیٹھا ہے تو!!؟ خدا معلوم منزل ہو نہ ہو اور ہو تو کہاں ہو۔ ایک لفظ نے شعر کی دنیا بدل دی۔

جنابِ منّی لال جوانؔ سندیلوی

اصل شعر ؎
مصرع ؎ آئی ہے آج حشر میں مقتل کی سرزمیں
اصلاح ؎ آئی ہے اُٹھ کے 〃 〃 〃 〃
مصرع ؎ دامن میں خون لے کے کسی بے قصور کا
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃

اگر ترمیم نہ بھی ہوتی تو شعر مکمل تھا۔ مگر اصلاح نے ثابت کر دیا کہ آج حشو زوائد ہے۔

اصل شعر ؎
مصرع ؎ نہوا گل کے یہ کہتا ہے تیر قاتل کا
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃
مصرع ؎ کہ اک غریب کے ماتم میں اشکبار ہوں میں
اصلاح ؎ کہ بے گناہ کے 〃 〃 〃 〃

غریب کے ماتم میں خون اگلنا اَن ہونی بات تھی اور اثر سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ بے گناہ کی لفظ نے ہر حیثیت سے شعر کو مکمل کر دیا۔

اصل شعر ؎
مصرع ؎ جگر کے داغ کی رونق یہ مجھ سے کہتی ہے
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
مصرع ؎ خزاں سے کام نہیں جس کو وہ بہار ہوں میں
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 جسکو ترقی ہے 〃 〃 〃

بہار و خزاں لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ خزاں سے جو بے نیاز ہے میں وہ بہار ہوں، لگتی ہوئی بات نہیں تھی، اور مصرع اولیٰ میں رونق سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا ترمیم نے تمام خوبیوں کو اجاگر کر دیا

جنابِ تنویرؔ لکھنوی

اصل شعر ؎
مصرع :۔ دونوں آنکھوں میں کھنچ آئی جذبِ الفت کی شبیہ
اصلاح :۔ 〃 〃 〃 〃 وہی تصویر کھنچ کر رہ گئی
مصرع :۔ ذبح قاتل نے کیا بسمل کو جس انداز سے ،
اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

جذبِ الفت کی شبیہ کا ٹکڑا الگ سے چپکا دیا گیا تھا مصرع ثانی میں جس انداز سے بھی کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو رہا تھا، نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

جنابِ بیدارؔ لکھنوی

اصل شعر ؎

مصرعِ ۱: غضب ہے عالمِ غربت میں موت کا آنا
اصلاح: " " " " خاک ہو جانا
مصرعِ ۲: چراغ تک نہ جلا جس پہ وہ مزار ہوں میں
اصلاح: " " " " " "

شعر میں یہ قباحت تھی کہ مصرعِ اولیٰ میں موت کے آنے کا ذکر اور ثانی میں مزار پر چراغ نہ جلنے کا شکوہ تھا۔ مصلح کے قلم نے وہ لفظ رکھ دیا ہے، کہ دونوں مصرعے دست و گریباں ہو گئے ہیں

جنابِ وفاؔ لکھنوی

اصل شعر:
مصرعِ ۱: قید سے چھوٹ کر بچا کر باغباں کی آنکھ ہم
اصلاح: توڑ کر تیلی " " " " "
مصرعِ ۲: شوق کی گلی میں پرِ قفس سے آشیاں تک آگئے
اصلاح: " " " " " "

قید سے چھوٹ کر شوق کی گلی میں آشیاں تک آنا کیا معنی وہ تو آنا ہی پڑے گا۔ شوق کی گلی میں قفس کی تیلیاں توڑ کر آشیاں تک پہونچنا قابلِ داد ہو سکتا ہے۔ اصلاح سے شعر کی معنوی حیثیت بلند ہو گئی۔

جنابِ ناوکؔ لکھنوی

اصل شعر:
مصرعِ ۱: اسی کا نام اگر چارہ گری ہے تو خدا حافظ
اصلاح: " " " ہے چارہ سازی " "
مصرعِ ۲: بھرے اک زخمِ دل اور دوسرا ناسور ہو جائے
اصلاح: " " " " " "

اصل شعر:
مصرعِ ۱: اپنا اپنا دل ہے اس کا غیر ممکن ہے علاج
اصلاح: " " " یہ تو اپنا اپنا ہے مذاق
مصرعِ ۲: وہ ہنسے ہم رو دیئے گورِ غریباں دیکھ کر
اصلاح: وہ ہنسے ہم رو دیئے گورِ غریباں دیکھ کر

مصرعِ اولیٰ میں دوسرا ٹکڑا قطعی غیر ضروری اور نامربوط تھا ترمیم نے شعریت میں چار چاند لگا دیئے۔

اصل شعر:
مصرعِ ۱: شکوۂ جوشِ جنوں ناوکؔ وفا کے تھا خلاف
اصلاح: " " " خلافِ وضع تھا
مصرعِ ۲: مسکرائے آپ ہی اپنا گریباں دیکھ کر
اصلاح: " " " " " "

شکوۂ جوشِ جنوں خلافِ وضع ہوتا ہے نہ کہ وفا کے خلاف وفاداری کے خلاف کہنا بھی درست تھا، مگر نہ کہہ سکے۔

جنابِ رنجورؔ لکھنوی

اصل شعر:
مصرعِ ۱: ستم کی شان میں بھی ہے عروجِ خندگی پنہاں
اصلاح: ستم کو بھی بناتی ہے کرم شانِ رضا جوئی
مصرعِ ۲: دہانِ زخم ہنستے ہیں رگڑ کھا کھا کے خنجر سے
اصلاح: " " " " " "

عروجِ خندگی محض بے کار تھا۔ کرم کی ضرورت تھی۔ اصلاح نے لفظی کمی کو پورا کر کے مطلب ادا کر دیا۔

اصل شعر:
مصرعِ ۱: خوفِ عذابِ حشر سمایا ہے دل میں کیوں
اصلاح: " " " " " "
مصرعِ ۲: رنجورؔ تم تو بندۂ پروردگار ہو!!
اصلاح: " " " آمرزگار ہو!!

خوفِ عذابِ حشر کی رعایت سے آمرزگار کتنا برمحل ہے۔ پروردگار کہنے کا یہ موقع ہی نہیں تھا۔

سراجؔ سلطانپوری

اصل شعر:

مصرع ۱ ؎ پٹ ٹالیوں ہی ان کا تیرِ نظر ہم دعوتِ پیکاں کر نہ سکے
اصلاح ؎ " " " " "
مصرع ۲ ؎ خالی تھا لہو سے ساغرِ دل کچھ خاطرِ مہماں کر نہ سکے
اصلاح ؎ خالی تھی " " ہر رگ " " " "

علم الابدان کے ماہرین اس اصلاح کا لطف اٹھائیں گے تیرِ نظر کا دل پر لگنا ثابت نہیں تھا۔ لہٰذا ہر رگ دل کہہ کر ظاہر کر دیا کہ پیکاں کہیں بھی لگا ہو، لیکن رگوں کا تعلق دورانِ خون قائم رکھنے کے لئے دل ہی سے ہوتا ہے، لہٰذا جب رگوں میں خون نہیں تو دل میں کہاں سے آئے۔

اصل شعر :۔
مصرع ۱ ؎ سُن سُن کے محبت کے چرچے آئے تھے تو بڑی امید لئے
اصلاح ؎ " " عنایت " " "
مصرع ۲ ؎ تم نے بھی یہ کہہ کر ٹال دیا، دیوانہ ہے دیوانہ ہے
اصلاح ؎ " " " " "

محبت کے چرچے سُن کر آس لگانا کیا معنی عنایت کی لفظ نے شعر کو شعر بنا دیا۔

جنابؔ کلیم فیض آبادی

اصل شعر :۔
مصرع ۱ ؎ فقط کھینچ کر آہ چپ ہو گیا
اصلاح ؎ " " "
مصرع ۲ ؎ میری داستاں مختصر ہو گئی
اصلاح ؎ بڑی " " "

اصلاح نے صنعتِ تضاد پیدا کر دی۔ بظاہر ایک نقطہ کی تبدیلی ہوئی ہے۔ لیکن شعری کیفیت کو معراج حاصل ہو گئی ہے اب راقم الحروف کے کلام پر علامہ کی چند اصلاحیں ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف نواب دہلوی کی دکان پر تشریف فرما تھے میں بھی اتفاق سے ادھر جا نکلا۔ تو آپ صاحب نے سگریٹ پیش کیا۔ اور ایک صاحب نے غزل سننے کا شوق ظاہر کیا، میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا ؎

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ تقریر
رکھ دیجئے سگریٹ کا ڈبہ مرے آگے

استاد محترم نے ارشاد فرمایا، اگر اس کو یوں پڑھئے، تو کیا مضائقہ ہے ؎

پھر دیکھئے کیا ہوتی ہے تقریر دھواں دھار
رکھ دیجئے سگریٹ کا ڈبہ مرے آگے

سگریٹ کی رعایت سے دھواں دھار کتنا چبھتا ہوا فقرہ ہے سامعین پھڑک اٹھے،

اصل شعر ؎
مصرع ۱ :۔ کوئی مانے نہ مانے جرم لیکن یہ حقیقت ہے
اصلاح ؎ " " " " " "
مصرع ۲ ؎ ضعیفی میں بھی رودادِ جوانی یاد آتی ہے
اصلاح ؎ بہت پیری میں " " "

"بہت پیری میں رودادِ جوانی یاد آتی ہے" جذبات کی صحیح ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ یہاں صرف مترادفات کا پھیر تھا۔ ضعیفی اور پیری ہم معنی مگر فصاحت میں زمین آسمان کا بل، اسی لئے تو آتش نے فرمایا ہے کہ ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری ہے کام اے آتش مرصع ساز کا

اصل شعر : ؎
مصرع ۱ ؎ ہم کامیابِ شوق بھی ہیں کتنے نامراد
اصلاح ؎ " " " حد کے " "
مصرع ۲ اس کی عطا سے بڑھ کے تمنا نہ کر سکے
اصلاح ؎ " " " " " " "

کہنا یہ تھا کہ اگر قدرت روزِ ازل کا غذ قلم دے کر حکم دیتا کہ

کر اپنی ضروریات زندگی کی فہرست بنالو ہم دست خط کردیں گے، تو ہم کچھ بھی نہ مانگ سکتے تھے، کیونکہ ہم کو اپنی ضروریات کا علم ہی کب تھا لہٰذا ہو کچھ بے طلب ملا وہ طلب سے کہیں زیادہ ہے، اس کے باوجود ہم دست طلب دراز بھی کئے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی عطا کے دائرے سے نکل کر اب تک کوئی نئی چیز نہ مانگ سکے اس اعتبار سے کامیاب شوق ہوتے ہوئے بھی نامرادی ہیں۔

مفہوم ادا ہوگیا، اور اتنے بڑے خیال کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔ لیکن ایک باریک سا عیب رہ گیا تھا جس کو نقلی کمی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کمی کو علامہ نے محسوس فرمایا "بڑھ کے" یہ جملہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ہم اپنی بساط کی حد ہی میں چکر لگا رہے ہیں۔ یہیں سے اصلاح کا گوشہ پیدا ہوا۔

ایک بے تکلف دوست نے جناب بہزاد لکھنوی کا مطلع پڑھتے ہوئے فرمائش کی بلکہ اصرار کیا، کہ آپ بھی اس زمین میں غزل کہئے لیکن مطلع اسی قید میں ہو، یعنی "دو نقطوں" کا ہونا ضروری ہے میں فرمائشی غزل کہنے کا عادی نہیں، لیکن اپنے عزیز دوست کی فرمائش پوری کر دی۔ جناب بہزاد کا مطلع ہے ؎

دو نقطوں میں پوشیدہ کل میری کہانی ہے
اک نقطہ محبت ہے اک نقطہ جوانی ہے

میں نے عرض کیا ؎

دو نقطوں میں پوشیدہ تفسیر جوانی ہے
دہکا ہوا انگارہ، بہتا ہوا پانی ہے

مہینوں بعد بر سبیل تذکرہ استاد معظم سے اس غزل کا ذکر کیا موصوف نے مطلع سن کر ارشاد فرمایا اسے یوں کر دیجئے تو بہتر ہو جائے

دو نقطوں میں پوشیدہ تفسیر جوانی ہے
لہراتا ہوا شعلہ، بہتا ہوا پانی ہے

لہراتا ہوا شعلہ، بہتا ہوا پانی، اس سے عمدہ تصویر نہیں کھینچی جا سکتی

"لطیف بود حکایت دراز تر گفتم"

ہندوستان کواپریٹو
کی طرف سے
تازہ بونس کی پیشکش
۳۱ دسمبر تک
تیسرے سالانہ جائزے کے بعد
بونس
فی ہزار سالانہ سود
بحساب ۲ فیصد۔
ہول لائف
اندومنٹ
۱۷ روپے ۸ آنے
۱۵ روپے
مزید نفع !
ایک لاکھ روپوں میں ۔
نیا بزنس
ایک کروڑ روپوں میں ۔
ہندوستان کی ساری بیمہ کمپنیوں سے بہتر ریکارڈ۔ ہندوستان کواپریٹو کا ۱۹۵۳ء میں ۲ کروڑ کا بزنس اور اس کا نتیجہ یہ عظیم الشان اعلان۔
ترقیاتی جذبہ اور تعمیری منصوبہ بندی کے جوش میں ہندوستان کواپریٹو کا آگے قدم۔ ایک محفوظ ٹھوس اور سرگرم ادارہ۔ جسے اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے !
جس کے کاندھوں پر کروڑوں افراد کے مستقبل کا بار ہے !
ہندوستان کواپریٹو انشورنس سوسائٹی لمیٹڈ
ہیڈ آفس:۔
ہندوستان بلڈنگس، کلکتہ ۱۳۔
شاخیں:۔ سارے ہندوستان اور بیرونجات میں !
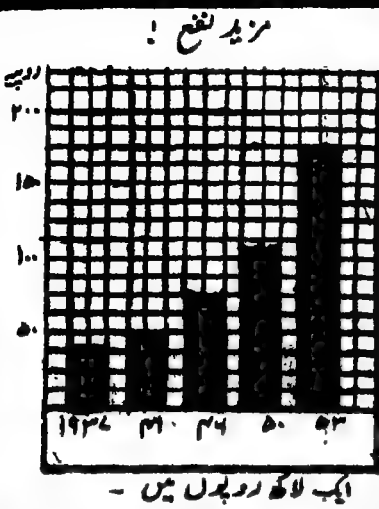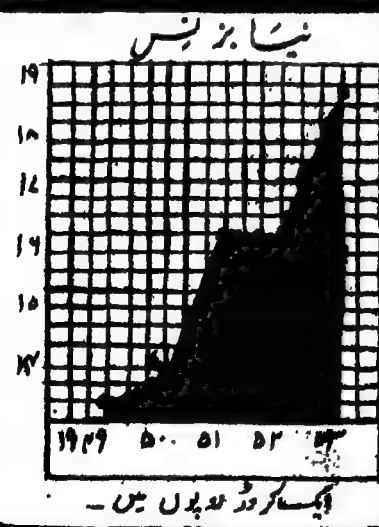
از:۔ آزاد کلکتہ

بی صُراحی کی کہانی

برسات سر پر کھڑی ہے، ہوا کا یہ حال کہ "اب نہ آوٴنگی میں جیتے جی کبھی"۔ اُمس کہتی ہے کہ سارے بدن کا لہو پانی پانی نہ کر دیا تو میرا نام نہیں۔ پسینے پر پسینے چلے آرہے ہیں، کرتا نچوڑتا ہوں تو بنیائن ڈوبی جاتی ہے، سر سے پسینہ چلا تو دل کو ڈوبا ہی چھوڑا۔ اور اس پر یہ کمبخت پیاس! جسکا نام لیتے زبان جلتی ہے، گلا سوکھ کر پاپڑ ہو رہا ہے دم لبوں پر ہے نکلنے کا نام نہیں لیتا، پنکھا کرتا ہوں تو ہوا تو گیا باں سانس کہتی ہے لو میں چلی، اور چلی تو ایسی چلی کہ تپ دق کے مریض بھی گھبرا گئے ادھر یہ حالت، ادھر جو نگاہ اٹھائی تو بی صراحی کا دھڑ الگ اور سر الگ!

آج سے قریب تین ماہ پہلے بی صراحی بھری گرمی کے دنوں میں ایک نکڑ کے بازار میں دکھائی دی تھیں، منجھولا قد۔ صراحی دار گردن، گول گول منہ والی کچھ ایسی بھائیں کہ حضرت دل مچل گئے کہ بس ہم تو یہی لیں گے، لاکھ سمجھایا کہ کالی کلوٹی موٹے پیٹ والی جسکی ٹانگوں کا پتہ نہیں لے کر کیا کروگے، دو قدم چل بھی نہ سکے، آخر کہاں کہاں اٹھائے پھروگے؟ کوئی تو تو گت کی ہو، مگر حضرت دل تو پہلی ہی نگاہ میں تیر الفت کا نشانہ بن چکے تھے، بولے جی نہیں، ہم تو یہی لینگے چاہے جو ہو، کالی کلوٹی ہی سہی تم کیا جانو۔ کالی کا سواد۔ مجنوں کی آنکھ سے لیلیٰ کو دیکھتے تو کہتے، اور پھر کالی کیا بری ہوتی ہے، آنکھوں کی پتلیاں بھی تو کالی ہیں، کیا ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں، نہ ہوں یہ کالی پتلیاں تو ہاتھ پیار سے کہتے پھرو، بابا اندھے کو ایک پیسہ دے دو۔ غرض کہ دل کے سامنے ایک نہ چلی بی صراحی کو ہاتھوں ہاتھ لیا ذرا

انگلی مار ہی ہی تھی کہ "ٹھن" سے بولیں، دل میاں تو چونک اٹھے۔ بولے۔ "لو میں کہا تھا نہ۔ کیا ٹھیلی سی بولتی ہیں"۔ میں نے دوکاندار سے پوچھا۔ بھائی یہ کہاں کی رہنے والی ہیں؟ ان کا نام۔ پتہ اور ٹھکانا کیا ہے آخر یہ تمہارے پاس کیوں اور کہاں سے آئیں؟

وہ دوکاندار ایک لمبی سانس لے کر بولا، حضور مصیبت کی ماری ہیں۔ بڑے گھر کی ہیں۔ دنوں کے پھیرنے یہ دن دکھایا کہ آج ہر بازاری میرے تیرے کی نگاہ میں آ رہی ہیں، ورنہ کہاں یہ اور کہاں ان کا خاندان، ایک زمانہ تھا کہ فارس کے شاہی حرم میں کافی عزت تھی شہنشاہ کے بغل میں جگہ پاتی تھیں، ساقی کے ہاتھوں کھلونا تھیں۔ سر سے پیر تک جوہی کے گجروں میں لپٹی رہتیں۔ بصرے کی انگوری سے ہر وقت پیٹ بھرا رہتا، جسے دیکھئے وہی ان کے گلے میں باہیں ڈالنے کو بے قرار۔ کہاں تک کہوں حضور وہ زمانہ تھا کہ آج جنہیں یہ ڈھیلی دھوتی والے بنگالی کنجا، کہہ کر کانے دو آنے میں مول لیتے پھرتے ہیں وہی بس مینا کے لقب سے پکاری جاتی تھیں کیا پیارا نام تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ایشیا کے مشہور مایۂ ناز شاعر عمر خیام تو بس ان کے سچے عاشق تھے۔ مرد ہو تو ایسا ہو۔ جو ایک بار ان کے گلے میں ہاتھ ڈالا تو مجال کیا کہ ایک منٹ کے لئے بھی کبھی جدا کیا ہو۔ مرتے مرتے مر گئے لیکن ہونٹوں سے لگائے رہے سچ پوچھئے تو یہ بس مینا کی صحبت کا نتیجہ تھا کہ ایک سو آٹھ رباعیاں لکھیں اور جو لکھا وہ انہیں کے لئے لکھا یہ تو زمانے کا قصور ہے کہ آج ساری دنیا عمر خیام کا نام لے کر ادب سے سر جھکا لیتی ہے اصل مینا کو کوئی جانتا تک نہیں۔ خیر صاحب یہ تو وقت کی بات ہے نہ عمر خیام کا پچھا ہوتا نہ ان کو ہندوستان کے بازاروں میں در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتیں، وقت نے پلٹا کھایا ادھر عمر خیام مرے ادھر ان کی قدر و قیمت کم ہوئی۔ یاروں نے آوازہ کشی شروع کی، غیرت نے گوارہ نہ کیا۔ ایران کا رُخ کیا۔ ایرانیوں نے اس ڈھلتی عمر میں بھی سر آنکھوں پر لیا لیکن وہ بصرے والی انگوری کہاں! جو کچھ پاس تھا پیش کیا۔ ٹھرّا[1] اور سونفیا[2] سے ان کا پیٹ بھرا پھر بھی غنیمت تھا اپنا وقت دیکھ کر یہ بھی اسی پر قناعت کئے بیٹھی رہیں۔ کچھ دن یوں ہی گزرے، تیمور لنگ ایک نامی لنگڑا ہندوستان کی طرف آ رہا تھا اس زمانے میں آپ اسی کے حرم میں تھیں۔ جوانی جا چکی تھی۔ بڑھاپے کا دور شروع ہو گیا تھا۔ یہ بھی بولیں۔ میاں مجھے یہاں کس کے لئے چھوڑے جاتے ہو۔ میں نے اتنے دن تمہاری پیاس بجھائی۔ اب آخری وقت میرا بھی کہا مان لو۔ تیمور نے ذرا لنگ کھا کے کہا۔ "بڑی بی تم کہاں چلوگی؟ ایک تو میں ہی ڈیڑھ ٹانگ والا پھر تم بھی بنا ہاتھ پاؤں کی۔ کہاں ماری ماری پھرو گی؟ پاس کی بات ہوتی تو اور بات تھی۔ کالے کوسوں کا سفر۔ پھر میں تو جا رہا ہوں لام پر۔ آج یہاں کل وہاں نہ کھانے کا ٹھکانہ نہ پینے کا۔"

بی مینا نے جو یہ سنا تو جل بُن کر گئیں۔ کہنے لگیں۔

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ میاں کھانے کا تو خیر خدا حافظ ہے لیکن پینے کے لئے تو ہر جگہ ٹھنڈا پانی چاہیئے۔ وہ بنا میرے تمہیں ملنے کا نہیں، جب جوان تھی لوگوں کو شراب پلا پلا کر دیوانہ بنایا۔ اب آخری وقت تو ٹھنڈا پانی پلانے کا ثواب لے لینے دو۔ سنتی ہوں کہ ہندوستان میں گنگا نام کی کوئی دیوی ہیں جو پانی کی طرح بہہ کر پاپیوں کے پاپ دھوتی رہتی ہیں ایک چلو میں عمر بھر کے پاپ دُھل جاتے ہیں۔ تو میرے حضور۔ میں نے بھی تو کچھ کم گناہوں کا بار نہیں اٹھایا شراب سے زیادہ بُری چیز تمہارے اسلام میں کیا ہے اسی حرام شراب کو پیتے پلاتے عمر کاٹ دی، خدا ہی جانتا ہے جو جلن۔ جو تپش جو آگ سینے میں سلگتی رہتی ہے کم سے کم مرتے مرتے گنگا کا پاک پانی پی پلا کر خدا کے سامنے منہ دکھانے کے لائق تو ہو جاؤں گی۔"

تیمور لنگ نے بلبلا کے بی مینا کو اپنے ساتھ لے لیا لیکن اس شرط پر کہ ہندوستان پہونچ کر کسی کے حوالے کر دوں گا۔ کیوں کہ سچ پوچھو تو بی مینا میں وہ جوانی کی امنگیں نہیں رہ گئی تھیں، میاں ابھی پکا

[1] ایک قسم کی دیسی شراب [2] ایک قسم کی دیسی شراب

پان بھی نہ تھیں کہ نہ جانے کب زمین پر آ رہیں۔ اور یہی ایک امید ایسی تھی کہ وقت سے پہلے وہ بھی ہندستانی کے گلے مڑھ دینے کی ہمت بھی کر رہا تھا۔ خیر صاحب بی مینا چلیں۔ رسیوں سے کسی کسائی اونٹ کی پیٹھ پر ہندستان کی طرف۔

کہاں ایران۔ کہاں ہندستان! دور دراز کا لمبا سفر۔ ریگستان کی گرمی۔ لو کا یہ عالم کا کہ ہر تھپیڑے میں جان آدھی ہوئی جاتی تھی۔ اونٹ کی کاٹھی پر سوار۔ رسیوں سے جکڑی بی مینا کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ ایک ایک جھٹکے کھاتی تھیں۔ اور "آہ" "اوہ" مری کی آوازوں سے آسمان سر پر اٹھائے لیتی تھیں، چلتے وقت تیمور نے گلے تک سونفیا بھر دی تھی اس خیال سے کہ خدا جانے کہاں دانہ پانی نصیب ہو، بی مینا کا پیٹ تو بھرا رہے گا۔ ادھر یہ حالت کہ بی مینا کا مارے جھکولوں کے برا حال تھا۔ اونٹ کے ہر قدم پر پیٹ کی سونفیا منہ کو آتی تھی۔ اسی پریشانی میں صبح سے شام تک کا سفر طے کیا، دھوپ ڈھلتے ہی ذرا سانس لی۔ پڑاؤ پر پہنچے، سایہ دار درخت کے نیچے ڈیرا ڈالا۔ اونٹ بٹھائے گئے، کاٹھی کھولی گئی بی مینا کو رسیوں سے رہائی ملی۔ تیمور نے لنگڑاتے ہوئے پاس آکر کہا "آؤ بڑی بی ذرا آرام کر لیں۔ تم بھی تھکاوٹ دور کر لو۔"

بڑی بی بھلا کیوں آنے لگیں۔ کہنے لگیں۔

"جی ہاں"۔ "تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں یہاں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔ یہاں جوڑ جوڑ ٹوٹا جا رہا ہے۔ گلے کا پانی منہ کو آ رہا ہے اور آپ کو آرام کی سوجھی ہے۔"

تیمور نے پیار سے گردن میں ہاتھ ڈال کر ذرا جو اپنی طرف کھینچا تو آپ ابل پڑیں ساری سونفیا انڈیل دی۔ یہ تو کہیے کہ تیمور بی مینا کے مزاج سے واقف تھا۔ جھٹ سے آبخورا سامنے کر دیا۔ سونفیا سے گلاس بھر گیا۔ تیمور نے یہ کہتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا کہ "بی صاحبہ تمہاری یہ وفاداری کبھی نہ بھولوں گا۔"

بی مینا ایک تو یونہی دن بھر کی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ اس پر تیمور کے دکھاوے کے فقرے پر پھڑک اٹھیں۔ بے ساختہ منہ سے ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ تیمور تو یہی چاہتا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جوش محبت سے بڑی بی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور لگا دل کی پیاس بجھانے۔ بڑی بی مارے خوشی کے لگیں "قل قل قل" کرنے۔ ساری سونفیا انڈیل دی تیمور کے سوکھے چہرے، اور چھوٹی سی بکرا نما داڑھی پر! خیر صاحب انہیں چونچلوں میں رات بیت گئی۔ سویرا ہوا۔ پڑاؤ اٹھا اور چلا پھر اسی طرح خیبر پاس کی راہ سے۔

تیمور نے پنجاب فتح کر لیا تھا۔ ہندو سرداروں میں کتنوں ہی نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ بی مینا کی بن آئی، وعدہ کے مطابق تیمور انہیں کسی ہندو کو سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ بی مینا کا دل بیٹھا جا رہا تھا، ایران کی سونفیا بھی ختم ہونے پر آ گئی تھی۔ ہندستان میں ان دنوں شراب کا چلن بس صرف اتنا تھا کہ لوگ "گاہے بگاہے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے پی لیتے تھے"۔ سونفیا کے نہ ملنے سے بی مینا کا گلا خشک ہوا۔ تیمور کے تیوروں پر بل آنے لگے لڑائی کے دنوں میں ادھر اس کا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ اب مینا سے ہم بغل ہونے تو بڑی بی نے فرمایا۔

"تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں یہاں ہم بیزار بیٹھے ہیں"۔

تیمور نے ہر چند کوشش کی۔ گلے میں ہاتھ ڈالا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا۔ آنکھوں سے لگایا لیکن بڑی بی نہ پسیجیں، رات بیت گئی کروٹیں بدلتے، لیکن تیمور کو نیند نہ آئی۔ آخر سویرا ہوتے ہی ایک ہندو سردار کو بلا کر بی مینا کو اس کے حوالے کیا۔ جدائی کی گھڑی بڑی دکھ والی گھڑی تھی۔ دونوں کے دل ڈوبے جا رہے تھے، تیمور کی آنکھوں میں آنسو۔ بڑی بی کا چہرا فق۔ لب خشک! پہلے تو سردار گھبرایا کہ "بندر کی بلا طویلے کے سر" آخر انہیں کہاں کس کونے میں لے بیٹھوں گا گھر جانے کے لائق نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ تو بڑھاپے میں ترکن کو گھر میں لا ڈالا۔ ذات بھی گئی دھرم بھی ڈوبا۔ یہی سب

سوچ کر سردار نے ڈرتے کانپتے تیمور سے کہا، "حضور کا حکم سر آنکھوں پر گستاخی معاف ہے جو شہنشاہ کے حکم پر حرف لا سکے، لیکن خاکسار ہندو ہے اور یہ مسلمان! بھلا میرے گھر ان کا گزارہ ہونا کہاں تک ممکن ہے! اور پھر انہیں تو چسکے پڑے ہیں بصرے کی شیرازی کے اور ایران کی سونفیا کے میں غریب آدمی ان کی شکم پری کیوں کر کر سکوں گا" تیمور نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا پہلے تو وہ بھی یکایک کوئی جواب نہ دے سکا۔ بعد میں بڑے غور و فکر کے بعد اس نے کہا "سردار صاحب آپ کا کہا واقعی صحیح ہے لیکن آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ ہمارے اور آپ کے علاوہ ابھی کسی نے یہ نہیں جانا ہے کہ بی مینا کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں! میرے خیال میں اگر بڑی بی کا نام مینا نہ رکھ کر کچھ اور رکھ دیا جائے تو کیا ہو۔"

سردار صاحب نے جواب دیا "جہاں پناہ خاکسار کو کیا عذر ہو سکتا ہے، یہاں گھر میں آ رہ" ناک بھاؤں ضرور سکیڑے لے گی تاہم میں کوشش کروں گا کہ ان کی عزت میں کوئی فرق نہ آئے۔"

تیمور نے کہا "اچھا سردار صاحب آپ کے یہاں شراب کو کیا کہتے ہیں؟"

سردار "جہاں پناہ مدرا یا صرا"

تیمور نے خوش ہو کر کہا "تو بس ٹھیک ہے، آج سے تمہارے یہاں ان کا نام مینا نہیں۔ صراحی رہے گا۔ میرے خیال میں اس نام سے ان کا بھی حق برقرار رہے گا اور آپ کو بھی لوگ دشنام نہ دیں گے۔"

سردار نے پھر دست بستہ عرض کی "عالی جاہ کا حکم بجا لانے میں خاکسار کو ذرا بھی اعتراض نہیں لیکن حضور میرے ان کی شکم پری کے لیے سونفیا یا شیرازی کا انتظام کرنا تو میری طاقت کے باہر کی بات ہے۔"

تیمور نے بیچ میں ہی بات روک کر کہا "ارے لو۔ یہ تو میں کہنا بھول ہی گیا تھا انہیں آپ کے حوالے کرنے کا میرا ارادہ ہی یہ تھا کہ یہ خود اب ان چیزوں سے دور رہنا چاہتی ہیں۔ میں نے ان سے ایران میں وعدہ کیا تھا کہ ہندستان پہونچ کر کسی ہندو کے حوالے کر دوں گا۔ یہ خود چاہتی ہیں کہ ان کی بچی کھچی زندگی بجائے شراب کے گنگا کا پانی پیتے پلاتے گزر جائے۔

سردار صاحب نے کورنش کی اور بی مینا کو بغل میں دبا لیا۔ بی مینا حسرت بھری نگاہوں سے تیمور کو دیکھتی ہوئی سردار صاحب کے گھر روانہ ہوئیں۔

اب جو نہیں لئے دیئے سردار صاحب گھر پہنچے تو گھر والی نے ناٹھے ہاتھوں لیا۔ ابھی یہ آنگن میں جا کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ وہ جھنکتی شنکتی نکل آئیں چوکے میں سے! بی مینا کو دیکھتے ہی ان کے دماغ کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ خدا جانے انہوں نے دل میں کیا سمجھا۔ چھوٹتے ہی بولیں "تو بڑھاپے میں یہ مینا شوق چرایا۔ لے آئے نہ جانے کہاں سے میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے۔ میں پوچھتی ہوں آخر بوڑھے منہ مہاسے لوگ دیکھیں تماشے" بڑھاپے میں یہ داغ لگانے کی کہاں سے سوجھی! یا جب سے طبیعت بھر گئی تھی جو ایک نئی نویلی کو گلے لگایا۔ تا با با۔ میں تو اب اس گھر میں ایک پل بھی رہنے کی نہیں۔ ہو لے کے اپنی اس کو

سردار صاحب کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ لائے تھے یہ سوچ کر کہ چلو گھر میں ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ مارے تھکے دو بوند پانی کا ہی سہارا ہوگا۔ یہ خیال میں بھی نہ گزرا تھا کہ یہاں یہ گل کھلے گا۔ ادھر بڑی بی کا برا حال۔ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ بدن میں رعشہ آ رہا تھا۔ سردار صاحب نے ایک بار ان کی طرف دیکھا۔ تو ترس آ گیا۔ ذرا ہمت کر کے زبان کھولی اور بیوی سے بولے۔

"تم تو ہوا سے لڑتی ہو۔ پہلے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ یہ ہیں کون۔ کیوں میرے ساتھ آئی ہیں۔"

بیوی نے تنک کر کہا "بس رہنے دو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ دیکھتی نہیں ہوں کیا کہ یہ چھیل چھبیلی کلموہی تمہارا منہ کالا کرنے کو آئی ہے"۔

گھبرا گیا۔ آج مری کل دوسرا دن۔ اور تم ایک بیر قبر میں لٹکائے

بیٹھے ہو۔ پھر بھی چونچلوں سے باز نہیں آئے، کچھ دال میں کالا نہ ہوتا تو اب تک منہ میں تالا کیوں پڑا رہتا ہے۔ آخر بتاتے کیوں نہیں کہ یہ کس کوہ قاف کی پری ہیں اور کس پر ریجھ کر تمہارے پاس آئی ہیں"

سردار صاحب نے کہا "تم کچھ کہنے بھی دو۔ آتے ہی برس پڑیں بھرے بادل کی طرح۔ بات یہ ہے کہ صبح جو بادشاہ نے بلایا تھا نہ۔ وہ انہیں کے لئے۔ یہ ان کے ساتھ آئی ہیں۔ ایران سے اور ہندستان میں ہی رہنا چاہتی ہیں"

یہ سننا تھا کہ جیسے پھلجھڑی میں کسی نے آگ لگا دی۔ لگیں برسنے بھی چھوٹنے۔

"آئے ہے۔ میں تو کہیں کی نہ رہی۔ اس بڑھاپے میں سوکن کا جھوٹا پانی پینا پڑے گا۔"

"رام رام۔ یہ بھی کوئی بات ہے، ارے یہ لوگ تو نہیں سدھرا۔ اب کیا پرلوک بھی بگاڑ دوں۔ نا بابا رہو لے کے انہیں اپنی چہیتی کو میں تو چلی اپنے میکے۔ ارے بھلوا۔ او بھلوا۔ لا تو ایک ڈولی والے کو۔ کہنا۔ میاں میر والی گلی چلنا ہوگا"

اتنا کہتے کہتے سردارن صاحبہ نے چولہا چھوڑ اوڑھنی اوڑھ چابیوں کا گچھا جھاک سے سردار صاحب کے سامنے پھینک دیا۔ ڈولی آئی۔ بھلوا کو لے میکے پہنچی۔

"سردار صاحب چپ"۔ بی مراجی کے کاٹو تو خون نہیں بدن میں"۔ نہ کچھ کہتے بنتا ہے نہ سنتے، یہ ذلت، توبہ۔ یا اللہ پھٹ جائے زمین تو سما جاؤں اس میں دل کڑا کر کے نیچی نگاہ سے بولی"۔ آپ تو میرے لئے مفت کی زحمت میں پڑ گئے"۔

سردار صاحب بھی شاید یہی سوچ رہے تھے، چونک سے پڑے۔ بولے "نہیں ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن میں اب سوچ رہا ہوں کہ اکیلا گھر ہے۔ آپ اور میں۔ آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی۔؟"

بی مراجی "تکلیف کی تو بات نہیں تھی۔ یہاں خیال یہ ہے کہ ..." سردار صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا "خیر میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ زمانہ چاہے کچھ بھی کہے یا سوچے لیکن بھئی ہمارے دل صاف ہونے چاہئیں۔"

بی مراجی نے دیکھا کہ بڈھا کروٹیں بدل رہا ہے، خدانخواستہ کچھ الٹی سیدھی پڑی تو بڑھاپے میں مٹی خراب ہوگی۔ میری بھی اس کی بھی۔ بڑی بی دور اندیش تھیں۔ جھٹ بول اٹھیں "خیر یہ آپ کی شرافت ہے ورنہ میں تو اب یہ سوچتی ہوں کہ اگر آپ مجھے کسی طرح کاشی پہنچا دیتے تو میری زندگی ٹھکانے لگ جاتی"

سردار صاحب جیتی بازی ہار رہے تھے، بیوی بھی ہاتھ سے گئی۔ اور بی مراجی بھی چلنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ آخری تیر پھینکتے ہوئے بولے۔

"آپ بھی کیا کہہ رہی ہیں۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے جو کاشی باشی کی سوچ رہی ہیں۔ اور میں آپ کی خدمت سے کب منہ موڑتا ہوں۔

بی مراجی نے دیکھا کہ بڈھے کو "بوتل کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی" کی طرح توبہ توڑتے دیر نہ لگے گی۔ انہوں نے جی کڑا کر کے کہا "تو یا تو آپ مجھے کاشی پہنچا دیں یا جہاں سے لائے ہیں وہیں ......"

سردار صاحب جھٹ بول اٹھے "مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چلئے کاشی ہی چلئے، یہاں پر سردار صاحب کی پشتینی عقل کام کر گئی کیونکہ اگر تیمور کے پاس جاتے ہیں تو اس کے غیض و غضب کے شکار ہوتے ہیں اسی لئے بہتری اسی میں سمجھی کہ "گلے پڑی بھالنی کو کاشی میں جلا ماریں۔"

بی مراجی کاشی پہنچیں۔ تو دل کی مراد بر آئی گنگا کا پاک جل پینے کو ملا۔ تو عاقبت سدھر گئی، لیکن قسمت ساتھ تھی ابھی کچھ اور بھی دیکھنا تھا۔ ایک دن شام کو گنگا کے کنارے بیٹھی تھیں۔ اندھیرا بڑھ چلا تھا۔ پاس کی چوکی پر کیرتن ہو رہی تھی۔ سننے میں کھو گئیں۔ اتنے میں دھیان ٹوٹا تو دیکھا کہ سردار صاحب کا پتہ نہیں۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو نظر نہ آئے سمجھدار تھیں۔ سمجھ گئیں کہ دال نہ گلتے دیکھ کر سردار صاحب کھسک گئے اور مجھے ہمیشہ کے لئے کاشی باس کرا گئے۔ اسی فکر و تردد

میں رات آگے بڑھ گئی۔ سب جا چکے تھے۔ فقط ایک بڈھا بنگالی دیر سے بی صراحی کو دیکھ رہا تھا۔ بی صراحی کے پاس آیا۔ پوچھا۔ "ماں تم اتی رات کو اکیلے کاہے کو بیٹھا ہے؟"

بی صراحی۔ "بابا میں پردیسن ہوں۔ میرا یہاں کوئی نہیں ہے کہاں جاؤں؟"

بنگالی۔ "تم ہندو ہے۔ تمرا نام کیا ہے ماں؟"

بی صراحی۔ سوچنے لگیں کہ اگر صراحی یا مینا کہتی ہوں تو یہاں بھی وہی حالت ہوگی جو پنجاب میں ہوئی تھی، اور اب تو گنگا جی کا پانی پی کر اسلام دھل گیا ہے۔ زبان سے بیساختہ نکل گیا "گنگا جمنی" (بنارس میں "گنگا جمنی" صراحی کو کہتے ہیں)۔

بنگالی۔ "بیش ماں۔ تا چولے چلو آمار سنگے۔ ماں چھیلے ایک ساتھ رہے گا۔"

بی صراحی کو ہنسی آ رہی تھی۔ باپ کے برابر بڈھا مجھے ماں کہتا ہے۔ کہیں اس میں بھی کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ چل پڑیں بڈھے بنگالی کے ساتھ۔

کچھ دن آرام سے کٹے، ایک دن اس نے بھی ملک عدم کا سفر کیا۔ اب یہ پھر بے چاری مدد کی طلبگار ہو گئیں۔ لیکن مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست ہوتا ہے، بنگالی بابو کے لڑکے بچے آخری وقت میں کاشی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ڈھارس بندھائی۔ کہا۔ ماں تم نے مرتے وقت بابا کی خدمت کی ہے پانی پلایا ہے، تمہارا احسان ہمارے سر پر اب ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ چلو کلکتہ! جب تک ہم زندہ ہیں تب تک تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

بی صراحی نے دیکھا کہ اور چارہ ہی کیا ہے۔ چلو انہیں کے ساتھ۔ بھلے آدمی ہیں

بولیں۔ "بیٹا چلنے کو تو چلوں لیکن میرا تو بنا گنگا جل کے منہ میں پانی بھی نہ جائے گا۔"

وہ بولے۔ "ماں۔ ہمارے کلکتہ میں بھی گنگا جی ہیں۔ آپکو پانی کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

گنگا جمنی کلکتہ آئیں۔ یہاں جو آئیں تو نرالا ہی گل کھلا۔ بنگالیوں نے یہ ایرانی ٹھسا بھلا کاہے کو دیکھا تھا۔ حالانکہ گنگا جمنی نے بہت چھپایا۔ لیکن بات کھل ہی گئی کہ کسی زمانے میں آپ شاہی حرم میں تھیں بس اسی دن سے آپ کو "کنجارانی" کا خطاب دیا گیا۔ بڑے تو خیر بڑے! جہاں وہ دفتر گئے کہ لڑکوں نے تالیاں بجا بجا کر چڑھانا شروع کیا۔

کنجارانی بڑی سیانی
گنگا جی کا میٹھا پانی
دیش چھوڑ پردیش ہوئی ہیں
بی بی سے اب ہوئی ہیں مائی
جب سے پیا بنگالی پانی
بھول گئیں اپنی ایرانی

ناکوں دم آگیا۔ کلکتہ کی گنگا اور اس کا پانی! رام رام آدھا مٹی، آدھا پانی۔ دو دن بھی نہ پیا تھا کہ پیٹ میں کچھڑ ہی کچھڑ ہو گیا۔ تندرستی خراب ہو گئی کچھ کہتے نہ بنتا ہے نہ سنتے، یوں تو بیچارے سب بھلے ہیں لیکن اس موئے گنگا کے پانی کو کیا کروں، خیر صاحب یوں ہی روتے دھوتے دن کٹ رہے تھے، ایک رات کو ذرا گرمی زیادہ تھی، ہوا کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بنگالی بابو مکان کے باہر چبوترے پر لمبے لگائے سو رہے تھے، کنجارانی کو بھی سرہانے بٹھا لیا تھا۔ اُمس بڑھ رہی تھی جب آدھی رات گزر گئی تو شاید بادلوں کو کنجارانی کی بیکسی پر ترس آیا اور وہ لگے ٹھاٹیں مار مار کر رونے۔ کنجارانی نے بھی ہمدردی کے آنسو بہانے شروع کر دیئے، بنگالی بابو کو بستر اٹھا کر اندر بھاگنا پڑا۔ نیند کے جھونکے، اور جلدی ہی کنجارانی کے یاد بھول گئے۔ آپ وہیں روتی آنسو پیتی اور نہاتی رہیں۔

صبح ہوئی اتفاق سے میں ادھر سے نکلا تو دیکھا کہ رات بھر کی برسات نے ان کا برا حال کر دیا ہے، کیا کرتا رحم آ گیا۔ اٹھا لایا۔ اور اب آپ کے سامنے ہیں۔ یہ ہے آپ کی آپ بیتی اور گزری کہانی۔ جس کے سننے سنانے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ آپ نے پوچھا تو بیان کر دیا۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے جیسے تیسے آنسو نکالے اور کنجارانی کو دونوں ہاتھوں میں لے گھر آیا۔ تین مہینے انکی خدمت کی لیکن صاحب "واہ" خوب نباہی گرمی میں جب دیکھو کلیجہ ٹھنڈا جاڑے میں گلا تر کیا اور آج ... آہ جانے دیجئے غم کرنے کو ایک زمانہ پڑا ہے خود بھی روؤں اور آپ کو بھی رلاؤں۔!

پروفیسر ہیرا لال چوپڑہ، ایم اے، کلکتہ

نعت شریف

طلسم دہر کا کیا خوب کارخانہ ہے — کہ جتنی خلق ہے خالق کا ہی بہانہ ہے
عجیب قدرتِ قادر کا بھی فسانہ ہے — وہ جس کا خود ہی علیم و خبیر و دانا ہے

بنائے اس نے زمیں اور آسماں کیا کیا
اور ان میں کوہ و بیابان و گلستاں کیا کیا

زمیں کی سطح کی رونق ہے آبشاروں سے — فلک کی شان ہے سورج سے چاند تاروں سے
چمن کی شان ہے جس طرح لالہ زاروں سے — یہ کائنات ہے روشن خدا کے پیاروں سے

انہی کا نور اندھیرے میں اک اُجالا ہے
انہی کے دم سے ہمارا بھی بول بالا ہے

ہوئی ہے عرش سی کیا فرش ہر گل افشانی — نشاط و عیش و مسرت کی ہے فراوانی
ہر ایک ذرے سے ظاہر ہے حسن کنعانی — ہے انبساط کے دریا میں آج طغیانی

کھلے ہیں پھول شگفتہ ہے یا بہارِ چمن
چمن میں جوش ہے آیا ہے تاجدارِ چمن

جہان بھر کی فضا میں شباب آیا ہے — نزولِ فیض ہے اور بے حساب آیا ہے
رسولِ اکمل و عالی جناب آیا ہے — نبی کریم رسالت مآب آیا ہے

ہے آج رحمتِ عالم کا جشنِ میلادی
زمانے بھر کو ہے توحید جس نے سکھلادی

وہ تاجدارِ دو عالم وہ فخرِ موجودات — زباں کو تاب کہاں کر سکے ستائشِ ذات
اسی کے نورِ حقیقت سے ہیں یہ دن اور رات — اُسی سے لرزاں ہے باطل اسی سے حق کو ثبات

وہی ہے شمع ہدیٰ دین کی وہی قندیل
اسی کے سامنے خود دست بستہ ہے جبریل

وہ مرسلین کا خاتم وہ تاجدار جہاں | وہ فخر نوعِ بشر رہبرِ رہِ یزداں
نظیر اس کی نہ تھی، نہ ہوگی یاں نہ وہاں | وہ سارے خلق کا مامن وہ سب کا دارالاماں

جناب احمدِ مرسل وہ داورِ دارین
وہ سارے نبیوں کا سردار مالکِ کونین

اسی کے نور کی بعثت ہوئی تھی آج کے دن | فلک سے بارشِ رحمت ہوئی تھی آج کے دن
بنائے قصرِ اخوت ہوئی تھی آج کے دن | جہاں میں عام محبت ہوئی تھی آج کے دن

جہاں میں آج کے دن امن کا پیام آیا
کدورتوں سے مبرّا نیا نظام آیا

یہ دن بجا ہی کہ ہے منتخب زمانے کا | صفائے قلب کا اور متقی بنانے کا
نماز پڑھنے کا مالک سے لَو لگانے کا | خضوع خشوع کا دن اور سر جھکانے کا

نبی کریمؐ نے جو کچھ کہا وہ کرنے کا
یہ دن ہے بحرِ حوادث سے پار اترنے کا

یہ دن خوشی کا ہی واجب ہے تم خوشی کر لو! | دلوں سے رفع تم اوہام کی بدی کر لو!
کہا جو تم سے پیمبر نے تم وہی کر لو! | سمجھ لو دعِ مع کدر زندگی نئی کر لو!!

خدا کی دین ہی یاں کو بجو تمہارے لئے
ہے اس کا وعدہ لا تقنطو تمہارے لئے

نہیں پیام محمدؐ قیود میں محدود | ہے سب کو ایک مسلمان ہوں کہ اہلِ ہنود
ہو سکھ کہ پارسی نصرانی ہو کہ اہلِ یہود | وہ سب کو کرتا ہے درگاہِ رب پہ سر بسجود

اور ایسا سجدہ کہ سُدھ بدھ رہی نہ تن من کی
اور انکشاف ہو غایت کا کنت کنزاً کی

تمام نبیوں کا دنیا میں احترام ہو عام | خودی کو چھوڑ کے خدمت ہو اور خدا کا نام
تمیز بندۂ و آقا نہ فرقِ پختہ و خام | یہ ہی پیامِ محمدؐ یہی تو ہے اسلام

جو اپنا اسوۂ حسنہ دیا رسول اللہ
عمل کی دے ہمیں توفیق یا رسول اللہ

لذیذ حلوے اور مٹھائیاں

باقی صفحہ ۷۹ کا

وہ کیا مصلحت تھی جس نے جمعیۃ کو مجبور کیا، کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کے سامنے اس طرح سرنگوں ہوجائے" یکم مارچ ۱۹۴۲ء ایک دوسرے اداریہ میں پھر اسی موضوع پر روشنی ڈالی۔

"جمعیۃ علماء کے ارکان اور عہدیداروں میں بعض ایسے ہیں جنکی ہمارے دل میں بہت عزت ہے، مگر اس کے باوجود ہم ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ جمعیۃ رجعت پسندوں کا آلۂ کار بن جائے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا سبب ہوجائے، اگر جمعیۃ ایسی روش اختیار کریگی تو ہم پوری قوت سے اس کا مقابلہ کریں گے، ہم جمعیۃ علماء کے ہمیشہ طرفدار رہے ہیں، مگر ہماری یہ طرفداری صرف اسی وجہ سے تھی، کہ جمعیۃ آزادی کی راہ پر جارہی تھی" ۱۴ مارچ ۱۹۴۳ء

آخرکار جمعیۃ علماء ہند پر یہ حقیقت منکشف ہونے لگی، کہ مسلم لیگ نے انہیں اپنے ساتھ اس لئے شریک کیا تھا، کہ انہیں اپنا آلۂ کار بنائے سب سے پہلے شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی نے مسلم لیگ سے استعفا دے دیا۔ اور اس کی وجہ اپنے استعفا میں یہ بتائی۔

"اراکین جمعیۃ علماء کو جناب صدر مسلم لیگ اور ان کے ہمنوازی نے مخلص آلۂ کار کی حیثیت سے بورڈ میں شریک کیا تھا حقیقت میں کوئی واقعیت، اور تبدیلی عقاید و خیالات سیاسیہ اور حقیقی ترقی و بہبودی وطن و قوم کی پیش نظر نہ تھی صدر مسلم لیگ، اور دیگر اراکین کا وہی نظریہ آج بھی برسرکار ہے، جو آج سے دس پندرہ برس پہلے تھا۔ اور جو کہ رجعت پسندانہ ذہنیت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔"

۱۵ اگست ۱۹۳۶ء کے روزنامہ ہند میں ایک کارٹون شائع کیا گیا تھا جس کا عنوان "برطانی مار کھا کی روزی کے ذرائع" تھا۔ اس کارٹون کو دیکھ کر تمام مخالفوں کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے سمجھا کہ اب روزنامہ ہند کو ختم کر دیا جاسکے گا۔ چنانچہ انہوں نے روزنامہ ہند کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کر دیئے، خاص طور پر مسلمانوں کو اس سے متنفر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور کوئی بہتان نہیں تھا جو اس پر لگایا نہ گیا۔ کارٹون میں شیر کی تصویر پر لفظ اسلام لکھا تھا مگر مخالفین نے مشہور کر دیا کہ سُور کی تصویر ہے۔ اور اندر ہی اندر روزنامہ ہند کے بائیکاٹ، اور اس کے اڈیٹر کو قتل کرنے کی سازشیں ہونے لگیں باوجودیکہ روزنامہ ہند کی طرف سے بھی اس کی بارہا تردید کی گئی، اور کلکتہ کے ممتاز مسلمانوں نے اس کی وضاحت میں مقالے لکھے اور کہا کہ کارٹون میں سُور نہیں شیر ہے۔ مگر مخالفین تو مخالفت کی قسم کھا چکے تھے، اور انہیں اس وقت تک چین نہیں آسکتا تھا جب تک وہ روزنامہ ہند کو بند نہ کرالیں۔ اور اس کے اڈیٹر کو ہمیشہ کے لئے خاموش نہ کردیں۔ ان سے یہ تو نہ ہوسکا۔ مگر حکومت وقت کے کان بھرتے رہے، اور آخرکار اس نے روزنامہ ہند کے اڈیٹر پر مقدمہ چلادیا اور یہ الزام لگایا کہ روزنامہ ہند نے اسلام کی توہین کی ہے، اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہونچایا ہے۔

چونکہ روزنامہ ہند کے متعلق ہر وقت غلط بیانیوں، اور تہمت تراشیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اور اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ کسی طرح اس کی آواز کو بند کیا جائے۔ اس لئے اسے بھی بار بار اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ کہ اپنے مسلک اور اپنی پالیسی کی صراحت کرے مخالفین اسے ایک منٹ کے لئے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر وہ اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا

حکومت بنگال کی جانب سے جو مقدمہ توہین اسلام روزنامہ ہند اور اس کے اڈیٹر پر دائر کیا گیا تھا۔ اس کی ۸ سالہ زندگی کا سرمایۂ افتخار تھا۔ کیونکہ اس مقدمہ میں جانشین حضرت شیخ الہند جناب مولانا حسین احمد مدنی، اور جناب شمس العلماء مولانا کمال الدین جعفری ایسی برگزیدہ ہستیوں کی اہم شہادتیں روزنامہ ہند کی صفائی میں ہوئی تھیں

کانگریس اور مسلم لیگ کے بارے میں روزنامہ ہند نے جو نظریہ قائم کر رکھا تھا۔ اس کی وضاحت روزنامہ ہند اکثر کرتا رہتا تھا، مگر اس کی آزادانہ تنقید کے باعث بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے تھے، اور اس کی پالیسی کو سمجھ نہیں سکتے تھے" کانگریس مسلم لیگ

اور ہم" کے عنوان سے اس نے ایک اداریہ میں اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا :۔

"ہم ابتدا ہی سے فرقہ پرستی کے مخالف ہیں، اور مسلم لیگ کی مخالفت بالکل اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں۔ جس طرح ہندو مہاسبھا کی مخالفت، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک سیاست میں تصفیہ حقوق مذہبی بنیادوں پر نہیں ہونا چاہیئے، مگر مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا اس کا تصفیہ مذہبی بنیادوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ جب مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کے مقابلہ میں کانگریس آتی ہے، تو لامحالہ ہم اس کی تائید کرتے ہیں کیونکہ کانگریس تمام ہندستان کی بلاتفریق مذہب وملت اور جنس نمائندگی دعویدار ہے۔ کانگریس ملک کا ایک سب سے زبردست جمہوری ادارہ ہے۔ اس پر بھی ہم نے بڑی سخت تنقید اور نکتہ چینی کی ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس پر سرمایہ دار چھائے جا رہے ہیں، اور بعض مواقع پر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے لازمی نتائج بھی نظر آجاتے ہیں اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں، جب ہمیں کانگریسی لیڈرشپ کے خلاف آواز بلند کرنی پڑتی ہے۔"

ہندستانی ریاستوں کے بارے میں روزانہ ہند کی پالیسی یہ رہی کہ وہاں کے عوام کو بیدار کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے والیان ریاست کے جبروتشدد کا مقابلہ کرسکیں، اور ان کے اندر جدوجہد آزادی کا جذبہ پیدا کیا جائے، تاکہ وہ بھی بقیہ ہندستان کے ساتھ مل کر ان کی مطلق العنان حکومت سے نجات پاسکیں۔ اس موضوع پر روزانہ ہند نے متعدد اداریے لکھے، اور کانگریس کو بھی توجہ دلائی، کہ وہ اپنے دائرہ عمل میں ریاستی باشندوں کو بھی لائے، اور ان کو بھی اس کا موقعہ دے کر ریاستوں کے اندر آزادی کی جنگ شروع کرسکیں۔

روزانہ ہند نے جب وسط ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست بھوپال کے والی کے ظلم و استبداد کے خلاف لکھا تو اس کا داخلہ ریاستی حدود میں بند کردیا گیا۔ اس سے پہلے اخبار "مدینہ" بجنور کا داخلہ ریاست مذکور میں بند کیا جاچکا تھا۔

چونکہ روزانہ ہند کی آواز نے ہندستان بھر میں ایک تہلکہ مچادیا تھا، اور دشمنوں اور مخالفوں کے دانت کھٹے کردیئے تھے اس لئے اس کی ضرورت محسوس کی گئی، کہ اس کے وجود کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور پائیدار بنایا جائے، تاکہ ملک اور قوم کی خدمت بیش از بیش کرسکے۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی ایک لمیٹڈ کمپنی بنائی جائے چنانچہ ۲۲؍اگست ۱۹۳۸ء کو ایک متحدہ قومی ادارہ کی حیثیت سے دی ہند پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ قائم کی گئی، اور جس کے ڈائرکٹروں، اور حصہ داروں میں مختلف فرقوں کے لوگوں کو شامل ہونے کی دعوت عام اس مقصد سے دی گئی، کہ یکجہتی اور اتحاد کی آواز جس کا یہ اخبار شروع ہی سے حامل رہا ہے۔ سے زیادہ قوت اور وسعت کے ساتھ بلند کی جاسکے۔ چنانچہ اس لمیٹڈ ادارہ کو آج ۱۴ سال ہوچکے ہیں، اپنے اسی مسلک پر قائم ہے، اور اس دوران میں اس کے ڈائرکٹریٹ میں یکے بعد دیگرے مندرجہ ذیل ممتاز ہستیاں شریک رہیں :۔

۱۔ شری نہرندو دت مزمدار سابق وزیر مغربی بنگال۔
۲۔ جناب مظفر احمد رکن پولٹ بیورو کمیونسٹ پارٹی ہند
۳۔ پروفیسر ہیرن مکرجی، ممبر لوک سبھا
۴۔ جناب عبدالرزاق خاں، ممبر راجیہ سبھا
۵۔ شری بنکم مکرجی، ممبر بنگال اسمبلی۔
۶۔ مولانا سید محمد عثمان مصری مونگیری مرحوم
۷۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
۸۔ مسٹر کرشن بنود رائے پلیڈر جیسور

۱۹۳۹ء مقامی طور پر بھی، اور عالمی انقلابات کے زیر اثر بھی ہندستان کے لئے بڑا انقلاب انگیز تھا۔ مقامی طور پر یوں، کہ مسلم لیگ دن بہ دن زور پکڑتی جارہی تھی، اور اس کے مقابلہ میں

ہندو مہاسبھا بھی میدان میں اتر آئی تھی۔ اور ان دونوں کے تصادم سے جابجا فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو رہے تھے، جس میں کہیں ہندو عوام مارے جا رہے تھے، اور کہیں مسلم عوام۔ روزانہ ہند نے ان دونوں کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا۔ اور یوپی، اور سی پی اور بہار کے متعدد فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف اداریے لکھے، یہ اسی تخریبی طریق کار کا نتیجہ تھا۔ کہ الامان کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین وحشیانہ طور پر قتل کر دیئے گئے۔ ہندوستان کے اخبارات بھی مختلف گروپوں میں بٹ چکے تھے۔ آزاد خیال اخبار انگلیوں پر گننے کے قابل تھے، خاص طور پر اردو زبان میں دو تین ہی اخبار ایسے تھے۔ ان میں ایک کے اڈیٹر کو قتل کر کے ختم کر دیا گیا، دوسرا روزانہ ہند تھا جس سے بھی ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کے ایک مضمون " غریب مسلمان کدھر جائیں " کی اشاعت پر فضل الحق کی مسلم لیگی وزارت نے ایمرجنسی پاور ایکٹ کی رو سے ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کر لی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو جب دنیا کی دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تو روزانہ ہند نے اس پر متعدد اداریے لکھے، اور ہندوستانیوں کو یہ مشورے دیے، کہ وہ اس جنگ میں کسی قسم کی امداد نہ کریں کانگرس نے اس میں نا شرکت کا اعلان کر دیا۔ مگر مسلم لیگ نے مشروط شرکت کا فیصلہ کیا۔ اور مسلمانوں کو الٹے سیدھے الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ ان کو سرکار کا ہر حالت میں وفادار رہنا چاہیئے، اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ اس کے علاوہ روزانہ ہند کے متعدد اداریوں میں ۴۹ نوجوانوں کی ۵۲ دن کی بھوک ہڑتال سے متاثر ہو کر سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مسٹر فضل الحق کی وزارت کو آخرکار اس مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔

روزانہ ہند نے اس کی ہزار کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں متحد و متفق ہو جائیں۔ تاکہ آزادی کی منزل قریب تر ہو جائے [illegible] کو رخنہ اندازی کا موقعہ نہ ملے۔ جب کبھی مصلحتاً یا حالات کے مجبور کرنے سے یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں تو روزانہ ہند کی خوشی کی حد نہ رہی، اور اس نے اپنی آنکھیں فرش راہ کر دیں۔ مگر وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ کہ مسلم لیگ ایک ہی زقند میں دور ہو جاتی۔ اور اپنے مقام اختلاف پر واپس پہونچ جاتی۔ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی دور ہو جاتی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے سیشن میں جو قرارداد پاس کی اس سے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔ اور اس قرارداد کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کو مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں تقسیم کر کے دونوں حصوں کو خود مختاری دیدی جائے۔ پھر یہ دونوں جیسے امن و صلح کی الگ الگ زندگی گزارنے کے لئے آپس میں معاہدے کر سکتے ہیں۔ روزانہ ہند ۲۷ راور ۲۸ رمارچ، ۱۵ راپریل، ۲۰ راپریل، ۲۴ راپریل، ۲۵ راپریل اور ۲۶ راپریل ۱۹۴۰ء تک کے تمام اداریے میں اس کی مخالفت کی اور اس کے تباہ کن نتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اس کے جواب میں دہلی میں آزاد خیال مسلمانوں نے ایک عظیم الشان کانفرنس بلائی۔ روزانہ ہند نے اس کے فیصلوں کی حمایت متعدد اداریوں میں کی۔

ہند پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹیڈ نے اس خیال سے، کہ اس صوبہ کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ اور باشندوں کی کثیر تعداد اردو نہیں پڑھ سکتی۔ اس لئے بنگلہ زبان میں ایک ہفتہ وار " آگو چلو " کے نام سے جاری کیا۔ وہ اخبار چھ ہفتہ کے اندر ہی اندر پورے بنگال پر چھا گیا تھا۔ مگر مسلم لیگی حکومت کو یہ کب گوارا تھا۔ کہ روزانہ ہند کے خیالات سے بنگلہ زبان جاننے والے بھی براہ راست مستفید ہو سکیں چنانچہ " آگو چلو " سے بھی ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کر لی گئی۔

اسی سال مرزا ابوالحسن اصفہانی (جو اس وقت پاکستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تجارت ہیں) نے روزانہ ہند کے اڈیٹر اور پبلشر پرنٹر پر اسی جرم میں دعوے دائر کر دیا کہ اس کی ایک اشاعت میں مٹیا برج کی شاہی مسجد کے بارے میں ایک اداری نوٹ لکھا گیا

تھا چونکہ اس قطعہ زمین کے مالک مرزا صاحب موصوف تھے اس لئے ان کے خیال میں اس تحریر سے ان کی توہین ہوئی۔ اس کے جواب میں روزانہ ہند کی مختلف اشاعتوں میں متعدد اداریے لکھے گئے، یہ مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا۔ اور آخر کار فیصلہ روزانہ ہند کے حق میں ہوا اور عدالت نے اسے جملہ الزامات سے باعزت طور پر بری قرار دے دیا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب سر کرپس برطانیہ کی جنگی وزارت کی طرف سے ہندستان بھیجے گئے، اور اپنے ہمراہ کچھ تجاویز بھی لائے، تاکہ ہندستان کو رام کیا جائے، اور وہ جنگ عظیم میں حصہ لے۔ ان میں سے ایک تجویز یہ تھی، کہ دوران جنگ میں جنگی محکمہ کے سوا سب کچھ ہندستانیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ روزانہ ہند نے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ دوران جنگ میں وہ کون چیز ہے، جو جنگی محکمہ سے بے تعلق ہے

سری راجگوپال اچاریہ نے مدراس کی کانگریسی لیجسلیٹو پارٹی کے ایک جلسہ سے پاکستان کو قبول کر لینے کی حمایت میں جو تجویز پاس کرائی تھی۔ روزانہ ہند نے اپنے ایک اداریہ میں اس کی حمایت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"اس اخبار کے پڑھنے والے جانتے ہیں، کہ ہم پاکستان کے شروع ہی سے مخالف رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا یہ خیال بھی رہا ہے، کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقوں کی بہت بڑی اکثریت باقی ہندستان سے اپنے آپ کو الگ رکھنا چاہتی ہے، تو جمہوری اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو الگ ہو جانے کا حق دے دیا جائے۔"

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جب برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ہندستان کو فوراً خالی کر دے، تو اس سے برطانیہ اور امریکہ کے اخباروں نے بڑی مخالفت کی اور حکومت ہند نے گاندھی جی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں ڈال دیا۔ اور کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔

روزانہ ہند نے اس ریزولیوشن کی حمایت کرتے ہوئے لکھا کہ ورکنگ کمیٹی کی تازہ تجویز بہت ہی مدلل ہے، اتنی مدلل کہ ہر غیر جانبدار آدمی ہندستان کی فوری آزادی وخود مختاری کو لڑائی جیتنے کا ایک بہت بڑا حربہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا مسلم لیگ سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کرے۔ اور ہندستان کو برطانیہ سے خالی کرانے کی جدوجہد میں اس کے دوش بدوش چلے سکھوں سے بھی اس کی اپیل کی گئی۔ سکھوں نے تو حمایت کا اعلان کر دیا مگر مسلم لیگ نے اس سے اختلاف کیا۔ روزانہ ہند نے متعدد بار مسلم لیگ کو ادھر توجہ دلائی، کہ وہ کانگریس کی پیشکش کو قبول کرلے۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اور ایسے نازک وقت میں نظریہ پاکستان کو منوانے پر مصر رہی، اور اس نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کانگریس کی تحریک سے الگ رہیں۔ روزانہ ہند نے مسلم لیگ کے اس رویّہ پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔ اور لکھا کہ ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ اور اگر مسلم لیگ واقعی مسلمانوں کو اونچا کرنا چاہتی تھی اور انہیں فائدہ پہونچانا چاہتی تھی، تو اسے اس سنہری موقعہ کو ہرگز ہاتھوں سے جانے نہیں دینا چاہئے تھا، بلکہ کانگریس کی پیشکش قبول کرکے وہ پورے ہندستان کا راج سنبھال لیتی۔

اس وقت پورے ہندستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ مگر مسلم لیگ بالکل بے تعلق تھی۔ روزانہ ہند نے اسے راہ راست پر لانے کے لئے ہزاروں جتن کئے اور اداریوں پر اداریے لکھے، مگر بے سود۔ آج حکومت برطانیہ کو کانگریس کے اس مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رفتہ رفتہ ہندستان کو خالی کر دے۔ اسی مقصد سے اس نے کرپس مشن ۱۹۴۲ء میں ہندستان بھیجا اس نے ہندستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس بمقام شملہ بلائی گئی جس میں ویول تجویز پیش کی گئی۔ مگر مسٹر جناح سب کچھ مان لینے پر بھی اس پر اڑ گئے کہ وائسرائے کی کونسل کے تمام مسلمان ممبروں کے انتخاب کا حق مسلم لیگ کو ہوگا۔ روزانہ ہند نے اس کی مخالفت میں لکھا۔ اور شملہ کانفرنس کو معرض التواء میں ڈالنے کا ذمہ دار مسلم لیگ کو قرار دیا، اور اس موضوع پر متعدد اداریے لکھے، جن کے جواب میں مسلم لیگی اخباروں نے بھی روزانہ ہند کو گالیاں دیں۔ اور مسلم لیگیوں نے بھی گالیوں اور دھمکیوں بھرے خطوط ایڈیٹر کو لکھے، یہی نہیں بلکہ علانیہ طور پر اس کی ترغیب بھی دی گئی، کہ کانگریسی مسلمان کو قتل کر دیا جائے

جب مسلم لیگ بنگال نے اس امر کا اعلان کیا کہ ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کے بعد "راست اقدام" کی پالیسی پر عمل کرے گی، تو روزانہ ہند نے سمجھا کہ یہ "راست اقدام" برطانوی حکومت کے خلاف ہوگا۔ مگر ۱۶ر اگست سے جب کلکتہ میں عام لوٹ مار اور کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ اور وہ بھی ایسا کہ اس کی مثال ہندستان کی تاریخ میں بھی نہ مل سکی۔ روزانہ ہند چار روز تک بند رہا۔ اور جب ۲۱ر اگست کو نکلا تو کلکتہ لاشوں کا شہر بن چکا تھا۔ اگر ایک جگہ مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر ہے، تو دوسری جگہ ہندوؤں کا۔ روزانہ ہند نے اس پر خون کے آنسو روئے، اور بنگال کے فسادات کی سخت مذمت کی اور اسے جماعتی وقار کی کشمکش کے خونیں نتائج قرار دیا۔ کلکتہ کے یہ فسادات اور ہنگامے ہندستان میں بدترین خانہ جنگی کے آغاز تھے چنانچہ اس کے بعد فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے رکنے کا نام نہ لیا۔ مسلم لیگ نے تو یہ سمجھا تھا کہ کلکتہ میں "راست اقدام" کرنے سے ان کے تمام مطالبات مان لئے جائیں گے، مگر یہاں [illegible] لینے کے دینے پڑ گئے۔ مسلمانانِ ہند کو بھی کافی سے زیادہ نقصان جان ومال پہنچنے لگا: آخر کار برطانوی حکومت نے ہندستان کو اختیارات سپرد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اس کے بارے میں بھی اعلان کر دیا۔ لارڈ ویول کو واپس بلانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اختیارات کی سپردگی کے مکمل اختیار دے کر ہندستان میں بھیجا گیا۔ انہوں نے یہاں آکر جب پہلی تقریر کی، تو روزانہ ہند نے اس کی تعریف کرتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے

ہندستان کے لیڈروں سے اختیارات کی سپردگی کے متعلق بات چیت شروع کردی۔ ۴ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے ہندستان کی تقسیم کا اعلان کردیا۔ روزانہ ہند نے اس اعلان کو بڑے افسوس کے ساتھ سنا، مگر جب اسے پنڈت نہرو، مسٹر جناح اور سردار بلدیو سنگھ تینوں نے بھی مان لیا۔ تو روزانہ ہند نے اس کے بعد تمام فرقوں سے یہ اپیل کی کہ وہ اپنے لیڈروں کی منظوری کا احترام کریں۔ اور آپس کی مار کاٹ بند کریں۔ اس نے اس حقیقت کا بھی اظہار کردیا کہ برطانیہ کی نئی اسکیم کے مطابق صرف ہندستان کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوں گے، بلکہ مسلم لیگ کے دونوں پاکستانوں ۔۔۔۔۔۔ بنگال اور پنجاب کے بھی حصے کردیئے جائینگے۔ اور بنگال، اور پنجاب کی یہ تقسیم مسلمانوں کے لئے بے حد مضر ہوگی۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں نے کیا کھویا، کیا پایا کی حقیقت کو بھی روزانہ ہند نے اپنے ایک اداریے میں واضح کردیا، اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ اس میں کون ہارا اور کون جیتا۔ اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم کو ایک زبردست سیاسی المیہ قرار دیا۔

روزانہ ہند نے ہندستان کی تقسیم کے بعد بھی اکثر اس پر اظہار افسوس کیا۔ کیونکہ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد بھی قتل و خون ریزی، لوٹ مار، عورتوں کی عصمت دری، اور وحشیانہ حرکات، جو ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سے سرزد ہوئیں۔ اگر ملک تقسیم نہ ہوتا، تو یہ سیاہ دھبہ ہندستان کے ماتھے پر نہ لگتا۔ اس تقسیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ شری راجگوپال اچاری ایسے دور بین مدبر کو ان حالات سے متاثر ہوکر جو پاکستان اور ہندستان کے مابین تھے، یہ کہنا پڑا کہ اگر انڈین یونین اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑی تو اس سے بہت بڑی تباہی آئے گی اگرچہ اتنے سال گذر چکے ہیں، اس کی نوبت تو نہ آئے مگر اتنا ضرور ہے کہ ایک تو دونوں حصوں کی اقلیتوں پر بڑے ظلم و ستم توڑے گئے، دوسرے اعصابی جنگ ضرور جاری رہی۔ اور آج تک جاری ہے، روزانہ ہند نے نہ صرف اہل پاکستان اور حکومت پاکستان کے اس قسم کے رویہ کی مذمت کی۔ بلکہ اہل ہندستان، اور حکومت ہند کی لغزشوں کو بھی اس نے کبھی نظر انداز نہ کیا۔ اور جو بیباکانہ مسلک شروع میں اختیار کیا تھا۔ روزانہ ہند آج تک اسی پر قائم ہے۔ اور آئندہ بھی قائم رہے گا۔

اب جبکہ پاکستان وجود میں آچکا ہے، روزانہ ہند اس کی بھی ترقی اور خوشحالی چاہتا ہے، اور ہندستان کے تعمیری منصوبوں میں تو پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہا ہے اور اس کے مستقبل کو اتنا شاندار دیکھنے کا متمنی ہے کہ دنیا کی نگاہیں اس کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں۔

ان صفحوں میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ورنہ روزانہ ہند کے یہ ۲۵ سال اور ان کی تفصیلات ایک طولانی داستان ہے جس کے لئے کئی دفتر درکار ہیں۔ مگر سلور جوبلی نمبر کے دامن میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ اس لئے ناظرین کرام سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مشتے نمونہ از خروارے پر عمل کریں۔ اور ان مختصر حالات ہی سے اس کی تفصیل کا اندازہ فرمالیں

نگار

باگیشور جھا

ایک عمدہ فلم کی خصوصیات

دس میں سے نو سینما کے شائقین فلم سے اکتا چکے ہیں اور اسکا سبب ہے کیوں کہ انہیں فلم میں وہ بات نہیں ملتی جو وہ چاہتے ہیں۔ اور اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ تصویر کیسی لگی تو وہ کہیں گے کہ "بالکل بیکار ہے" حالانکہ وہ آجکل کی تصویروں کو برا بھلا کہتے ہیں، لیکن اچھی تصویروں کی ان کو اب بھی خواہش ہے۔ اور صرف فلمی شائقین ہی کیوں؟ اب تو معززین، معتقدین۔ ذہنی طور پر اونچے لوگ اور قومی لیڈر جو اب تک اس صنعت سے بالکل بے خبر تھے اور فلم سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا وہی اب اس ملک میں فلم کے سب سے بڑے بہی خواہ ہیں، جس طرح یہ لوگ فلم کے متعلق تقریریں کر رہے ہیں اور اسے شراب اور جوئے سے بھی زیادہ مخرب اخلاق بتا رہے ہیں۔ یہ سب فلم کے بہتری ہی کے لئے ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں فلمی صنعت کا بہی خواہ تصور کریں۔ ان لوگوں کے کہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آجکل کی فلم کسی کام کی نہیں ہوتی اور ایک مذاخل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خیر یہ بھی مان لیا جائے؛ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک اچھے فلم کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان لوگوں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ نہیں بتایا کہ کیا چیز فلم میں ہونا چاہئے جو وہ اچھی کہلائی جا سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک تصویر کا ہر ایک کو بھلا معلوم ہونا اور یہ ناممکن سا امتیاز حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ہے کہ وہ ہر طبقے کے لئے مفید اور دلچسپ ہے اور اس طرح آپ کو یہ بھی مشکل ہی نظر آئیگا کہ اصل میں اچھی تصویر کی خصوصیات کیا ہیں، خود لفظ "اچھا" اس ملک میں ہر ذات اور ہر ذوق کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور ہر جغرافیائی متبادل علاقے میں اس کے معنی کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک گروہ کا خیال ہے کہ تصویر خود ایک حد وانتہا ہے۔ آرٹ، تخلیق اور فنی قدروں کی اہمیت جس میں ٹھوس مواد سے زیادہ ہوتی ہے تو دوسرا گروہ یہ نظریہ دکھتا ہے کہ یہ صرف ایک ذریعہ ہے تفریح طبع کا اور اس میں ٹھوس مواد کی آرٹ، تخلیق اور فنی کمال سے زیادہ اہمیت ہے۔

اب اگر آپ ان دو نظریوں کو سامنے رکھیں اور تجزیہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان میں ایک بین السطور زاویۂ نگاہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو فلمی ذریعہ تفریح کو لباس اقدار میں ملبوس کر دے، کیونکہ کسی بھی آرٹ کے نمونے کی اچھائی یا برائی اس کو کلی طور پر مطالعہ کرنے کے بعد ہی معلوم کی جا سکتی ہے اور اس کے لئے فلم میں ٹھوس مواد اتنا ہی اہم ہے جتنا آرٹ اور فن کی قدریں۔

کہانی

فلم کے بنیادی لوازمات پر نظر ڈالتے ہی پہلے ہمیں کہانی کو اہمیت دینی پڑتی ہے، اب آپ پوچھیں گے کہ شکل، ڈھانچہ اور ماحول کیا ہونا چاہئے بھی کہانی کا ڈھانچہ یا شکل جو بھی ہوگی۔ اسے دلچسپ سلجھا ہوا احساس

دمغالی تسے لبریز کسی جدت کا حامل ہونا چاہئے۔ اور اس کا کسی حد تک انوکھا اور رنئے طور طریقے کا ہونا بھی لازمی ہے، عوام نئی باتوں سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ہر فرد اپنے سینے میں کچھ انوکھے خیالات چھپائے رہتا ہے، ہندوستان کی کسی صنعت میں انوکھے پن اور ایجادات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ فلمی دنیا میں ہے۔ جہاں ایک اچھی فلم بنانے کے لئے کوئی لگی بندھی راہ نہیں ہے اگر اس فلم کے پودے کو ہرا بھرا اور بار آور ہونا ہے تو اس کے لئے اسے مسلسل نئے نئے تصورات معاشرتی قدروں معاشی تحقیقوں اور ماہرانہ خوبیوں کے چشمے سے سیراب ہوتے رہنا چاہئے۔

سینریو

کہانی کے بعد فلم بنانے کے دوسرے نمبر کے لوازم میں سے سینریو ہے موضوع کے چناؤ کے ساتھ ساتھ اسے خوبصورت اور دلکش طریقے پر پیش کرنا بھی انتہائی اہم چیز ہے اور یہ کام سینریو انجام دیتا ہے کیونکہ جتنی بھی طاقتور اور زندہ دار کہانی ہو لیکن بغیر اچھے سینریو کے کھِسٹ کھِسٹ ہو کر دم توڑ دیتی ہے، یہ سینریو ہی ہے جو کہانی کے ڈھانچے پر لباس و پارچات منڈھتا ہے۔ سینریو کتاب سے لے کر پردۂ سیمیں تک کے لئے ایک بہت اہم قدم ہے، اس میں ایک مسلسل قصے کو چھوٹے چھوٹے مناظر میں تقسیم کرکے ان کی اہمیت کو دوبالا کر دیا جاتا ہے، سینریو کے توسط سے الفاظ کی مجموعہ ایک کہانی کا تبادلہ ہیئت تصویروں کے ایک مجموعی صورت میں ہو جاتا ہے سینریو کے بارے میں اس کے لکھنے والے کے لئے جو بات بڑی قابل لحاظ ہے، وہ ہے "رفتار" یا ٹیمپو نقاد عموماً اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اکثر وہ یہ لکھ مارتے ہیں کہ فلم کی رفتار بہت آہستہ تھی یا اس میں رفتار سرے سے غائب ہی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے نزدیک ٹیمپو "(TEMPO)" یا رفتار آخر ہے کس چڑیا کا نام اس کے اصل معنی منظر کشی کی مناسبت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایک تصویر کا "تال" ہے اور شروع سے آخر تک فلم اسی "تال" پر بنائی جاتی ہے۔ لیکن اس "رفتار" کے تسلسل میں کمی بیشی ہو جانے سے ناظرین تصویر کے موضوع سے اکتا سے جاتے ہیں، اس لئے اصل مقصود رفتار "کا یہ ہونا چاہئے کہ مناظر کو ان کی اہمیت یا غیر اہم ٹکڑوں کے اعتبار سے آہستہ یا تیز کرنا اور لمبا یا چھوٹا کرنا چاہئے اور اس میں منٹ منٹ اور سکنڈ کا لحاظ ضروری ہے اس طرح ایک تصویر جس میں ان چیزوں کا خیال رکھا گیا ہے ناظرین کو بہت متاثر کرتی ہے۔

اداکاری

اداکاری کا ایک نہایت اہم جزو ہے جو تصویر کی اعلیٰ اقدار کی ضامن ہوتی ہے، اس لفظ کی تعریف، ماہرین فن نے یوں کی ہے کہ یہ" زندگی کا عکس ہے اور تقریری نہیں بلکہ سوانگ کے ذریعے سے سارے اداکاروں اور اداکاراؤں کے لئے زندگی ایک بساط ہے اور ان کا کام ہے کہ فطرت کو ہر لمحہ آئینہ دکھاتے رہیں (یعنی فطرت کی نقل کرتے رہیں) جسمانی یکسوئی اور نقل و حرکت میں ایک خاص وقار تخیل نگاری کے اہم جزو ہیں جن میں احساس و درد کا ہونا ضروری ہے لیکن پھر بھی اسٹیج اور پردۂ سیمیں کی کردار نگاری میں فرق ہے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اسٹیج پر مکالمے سے ایک خاص صورت حال پیدا کی جاتی ہے اور پردۂ سیمیں پر مکالمہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب کہ کسی عمل کے تحت ایک خاص صورت حال کی تخلیق ہو چکی ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں اداکار ناظرین کی طرف منہ کئے رہتا ہے اور دوسری صورت میں کیمرے کی طرف۔ اسٹیج کی اداکاری کی بنیاد مبالغہ پر ہے اور اسکرین کی اداکاری حقیقت نگاری پر زیادہ زور دیتی ہے

موسیقی اور مزاح

اگر ہم پھر ٹھوس مواد کی طرف آئیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ موسیقی

اور مزاح بھی فلم کے جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ ہم ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے، زندگی کے کھیل میں ان دونوں کے بھی خاص مقام ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ موسیقی زندگی کی ترنگ اور محبت کی غذا ہے؛ اور فطری طور پر یہ تصویریں بغیر اس کے مٹی کے ساز معلوم ہوں گی جو خنک ہوگئے ہوں اور مزاح سے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جیسے کھانا بغیر نمک پھیکا ہوتا ہے اسی طرح دلچسپی اور تفریح بغیر مزاح کے بدمزہ ہوتی ہے لیکن اس میں اس بات کا بڑا خیال رکھنا چاہئے کہ کہیں مزاح معیار سے گر کر بیہودگی اور یاوہ گوئی بن کر نہ رہ جائے اور اس کے علاوہ مواقع اور کردار ایسے ہوں جو نفس مضمون سے تعلق رکھتے ہوں۔

اس مضمون سے "ڈائرکٹر لینگس" (DIRECTOR LENGS) کے الفاظ خاص تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ سینما کے دو بڑے اہم لوازم ہیں اور وہ ہیں "آرٹ" اور "دلچسپی" کوئی تصویر صرف آرٹ کے لئے نہ بننا چاہئے، فلم عوام کے لئے ہوتی ہے اگر اس میں آرٹ ہوگا تو اسے "عوامی آرٹ" ہونا چاہئے اور اگر ایک فلم عوامی آرٹ سے تعلق رکھتی ہوگی تو اس میں عام دلچسپی کی چیزیں بھی ہوں گی۔ لیکن یہ ضرور امر ہے کہ وہ اجزا جن پر عوامی دلچسپی کا دارومدار ہے۔ متانت کے حدود میں رہنا چاہئیں۔"

فلم میں فن کا عنصر

ابھی تک تو ایک فلم کے نفس مضمون اور اس کو پیش کرنے کے طریقوں پر بحث ہو رہی تھی۔ اب ہم فلم کی فنی ضروریات کی طرف آتے ہیں (حالانکہ "آرٹ" اور "فن" میں فلمی دنیا میں زیادہ فرق نہیں) تو ہمیں مختلف چیزوں کو ذہن پر غور لانا پڑتا ہے۔ مثلاً عکاسی، صدابندی، تراش وخراش، اور دوسرے شعبے، ان میں سے ہر ایک فلم کی اچھائی میں اضافہ کرنے کے لئے برابر کا حصہ دار ہے، لیکن ان سب میں دو اہم ترین شعبے عکاسی اور تراش وخراش یا ایڈیٹنگ کے ہیں اور انہیں کو میں خاص طور پر آپ کے سامنے پیش کروں گا

عکاسی

عکاسی فلم کی آدھی جان ہے یعنی "متحرک تصویر" کے مرکب کی لفظ تصویر۔ بہت کچھ جو مکالموں کے دفتر کھول دینے جیسے انجام پا سکتا ہے صرف کیمرہ کی ایک حرکت سے ذہن نشین ہوجاتا ہے، ایک کردار کا کوئی خاص زاویہ، روشنی کی کمی دلکشی۔ کسی منظر کی یاس سے عکاسی یا کسی دھندلے سایے کا متوالا ہی ایک کہانی کے ڈھانچہ کو گوشت و پوست سے سجا کر ناظرین کے سامنے پیش کردیتا ہے۔

تراش وخراش (ایڈیٹنگ)

یہ فلم کی تیاری میں سب سے آخری مرحلہ ہے اور اس کا کام ہے فلم کو آخری مرتبہ نوک پلک سے درست کرنا یعنی اس پہ جلا دینا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور اس کا سارا دارومدار فلم کی کاٹ چھانٹ کرنے والے پر ہے اس شخص کو جس پر یہ ذمہ داری عائد ہو ایک حساس اور صاحب تخیل انسان ہونا چاہئے کیونکہ اسے پوزیٹو تصویروں کے انباروں سے خاص خاص ٹکڑوں کو چننا ان کا انتخاب کرنا اور پھر انہیں کاٹ کر جگہ جگہ ترتیب سے جوڑنا پڑتا ہے وہ ایک بدترین ڈرامے کو اپنی قینچی کی مدد سے ایک بہترین فلم میں تبدیل کردے سکتا ہے اور اس لئے ایک اچھے فلم کے لئے ایک اچھا ایڈیٹر بڑی اہم چیز ہے۔

ڈائرکٹر

لیکن ان میں اہم ترین فرد ڈائرکٹر ہے جو ان سب کا ہدایت کار ہے۔ سب اس کی رنگ آمیزی، اس کے برش کی نزاکت اس کی فراست و ذہانت، اس کی فنی مہارت اور اس کی جذباتی اور احساساتی گہرائیوں پر منحصر ہوتا ہے۔

فلمی تبصرہ

"آن دی واٹر فرنٹ" - ایک عظیم الشان تصویر

وینس میں بین الاقوامی فلمی میلے میں انعام پانے والی واحد امریکی تصویر کولمبیا کے "آن دی واٹر فرنٹ" میں امریکہ کے ڈک کے علاقے کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی کہانی بڑے مؤثر انداز میں دکھائی گئی ہے۔ جس میں حقیقی جائے وقوع پر ان لوگوں کے اعلیٰ طریقۂ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے

مارلن برانڈو جو "اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈزائر" میں بہترین پارٹ ادا کر چکا ہے اس فلم کا خصوصی اداکار ہے۔ اور اس کی مدد ایوا میری سینٹ ٹیلی ویژن اسٹار نے کی ہے، لی جے، کلب نے ایک غنڈے کا پارٹ خوب ادا کیا ہے۔ غرض یہ ایک ایسی تصویر ہے، جو دنیا کا اعلیٰ ترین فلمی انعام "آسکر" حاصل کرنے کے عین لائق ہے۔

بمبئی رائل سوئیٹ میٹ سیلون کے مختلف اقسام
کے
لذیذ حلوے اور مٹھائیاں خریدیئے
تیوہاروں اور شادی بیاہ کے موقعہ پر آپ کیلئے تحفتاً پیش کرنے کی بیشاں دل خوش کن مٹھائیاں اور
حلوے تفریح میں آپ کی مسرتوں کو دوبالا کرنے والا رائل حلوا، اسپیشل حلوا، اور
افلاطون حلوا
زعفرانی لڈو
نمکین پوری
وغیرہ
آئیسکریم
سورتی برفی
کیک
وغیرہ
BOMBAY ROYAL SWEET MEAT SALOON
پتہ نوٹ کر لیجیے!
بمبئی رائل سوئٹ میٹ سیلون
فون سیپنجی ۳۳۲۵۰ نمبر ۶۰ بنٹنک اسٹریٹ، کلکتہ (پیراڈائز سینما کے سامنے)
نوٹ :- آرڈر دینے پر آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے گھر بھی مٹھائیاں پہنچائی جاسکتی ہیں، ایک بار آزمانے کے بعد
ہمیشہ بمبئی رائل سوئٹ میٹ کی مٹھائیاں ہی پسند کریں گے -!
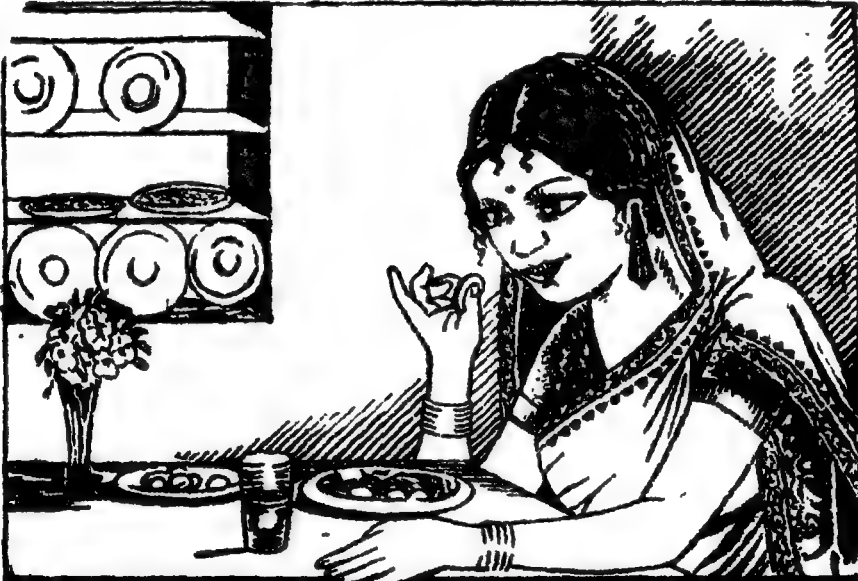
Published by the Rozana Hind and Printed by Mr. Hassanali Abba ohai at the Mariv Hind Press
17 Sagar Dutt Lane, Calcutta, 12

تیوہاروں کی خریداری

کے لئے

آپ کی بہترین جگہ

کھلونے! کھلونے!! کھلونے!!!

چھوٹے چھوٹے بچوں

کی

سپنوں کی دنیا

آپ ہمیشہ یہاں تشریف لائیں

گورنمنٹ سیلس امپوریم،

۲۱ - چترنجن ایوینیو، کلکتہ

حکومت مغربی بنگال کی طرف سے شائع کیا گیا